قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

اپریل 2020 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

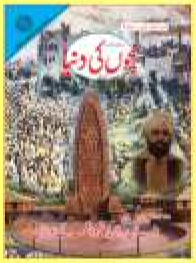
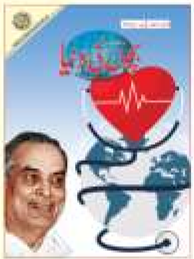

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

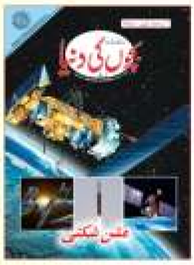

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماھنامہ
اُردو دُنیا
دھلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:04، اپریل 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 1-5 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
ثانوی درجات میں اردو قصائد کی تدریس سعود عالم 7
تدریس کے عصری تقاضے محمد افروز عالم 10

رپورٹ
عالمی یوم مادری زبان کی
پروقار تقریب نایاب حسن 12

نقد و نگاہ
اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات تنویر اختر رومانی 16
شوق نیموی کی غزل گوئی نسیم احمد نسیم 20
جدید غزل کا ایک بنیاد گزار: یگانہ چنگیزی س ش عالم 22
کرناٹک میں مصاحبہ نگاری کے نقوش عبدالرب استاد 25
وارث علوی کی تنقیدی بصیرت محمد زبیر 27

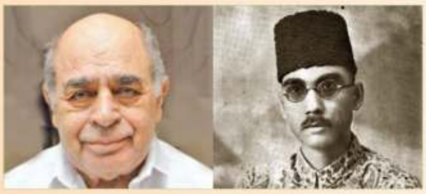

یاد اقبال
اقبال اور غالب رؤف خیر 31
اقبال کی نظموں میں طبعی جمالیات مقبول احمد مقبول 33

سلسلۂ صحافت
جمیل مہدی اطہر حسین 36

اردو اور ٹیکنالوجی
الیکٹرانک میڈیا میں بذریعہ اردو
روزگار کے مواقع شاہ رشاد عثمانی 38

اردو کے فروغ میں ٹیکنالوجی کا حصہ فیاض حمید 40
انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں
لائبریری کا صحیح استعمال محمد زبیر احمد 42

نیا آسماں نئے ستارے
دکنی اردو کی سچی جانشین
ایک گم شدہ بولی محمد عامل بدایونی 45
متن، قرأت اور معانی کے چند وظائف مصطفیٰ علی 48
قرۃ العین حیدر کے چند
منتخب افسانوں کے امتیازی خطوط فصیح الرحمٰن 51

سائنس
اپنے تحت الشعور کا استعمال کریں شمس الاسلام فاروقی 54
عصر حاضر میں شمسی توانائی
کا بہترین مصرف محمد مجتہد انصاری 56

صحت
کورونا وائرس محمد رفیق اے ایس 58

فلم
ظفر گورکھپوری کے فلمی گیت ناظر انور 61

کمپیوٹر
ایم ایس۔ایکسل کیا ہے؟ 63

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 64

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 73

ہماری بات

اردو زبان و ادب کی کائنات بہت وسیع ہے۔ انسانی سماج سے جڑا ہوا کوئی بھی ایسا موضوع یا مسئلہ نہیں ہے جس پر اردو کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ وہ موضوعات بھی جو آج ہمارے تنقیدی ڈسکورس کا اہم حصہ ہیں، ان پر بھی پہلے سے اشارات موجود ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، میڈیسن اور دیگر مشکل موضوعات پر بھی اردو میں کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ اردو صرف شعر و شاعری کی زبان ہے۔ اب یہ زبان ترجمے کے ذریعے علمی زبان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اردو زبان میں بھی علوم و فنون کا بیش بہا خزانہ ہے۔ سائنسی علوم و فنون پر بھی اردو میں وافر مواد موجود ہے اور اس تعلق سے ماضی میں کچھ اداروں نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ آج بھی نئے سائنسی اور تکنیکی موضوعات کے حوالے سے اردو میں کتابوں کی ترتیب و تشکیل کا عمل جاری ہے۔ اردو میں موضوعاتی سطح پر بہت تنوع ہے۔ اردو شعر و ادب میں اب سائنسی عناصر پر گفتگو شروع ہو چکی ہے، خاص طور پر مرزا غالب اور دیگر شعرا کی شاعری میں سائنسی اشارات کی تلاش یا فزکس کے حوالے سے غالب کی شاعری کی نئی تعبیر کی جہت پر بھی مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ یہ واضح اشارہ ہے کہ اردو زبان و ادب کا دائرہ چند موضوعات تک محدود نہیں ہے بلکہ اگر مختلف علوم و فنون کے تناظر میں اردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ سائنس سے جڑے ہوئے لوگوں نے اردو زبان و ادب کو سائنسی تناظر میں دیکھا تو ہمیں بھی یہ احساس ہوا کہ اردو زبان و ادب کو اس زاویے سے بھی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قانون سے جڑے ہوئے افراد نے قانونی تناظر میں اردو زبان کا جائزہ لیا تو بہت سے اہم نکات سامنے آئے۔ مختلف شعبوں سے جڑے ہوئے افراد نے جب اردو زبان و ادب کو اپنا میدانِ عمل بنایا تو ان کی وجہ سے اردو کو بہت سے نئے زاویے بھی ملے۔ اب ٹیکنالوجی کے حوالے سے جو موضوعات سامنے آرہے ہیں ان پر بھی اردو میں لکھنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔

اردو کے لیے یہ ایک نیک فال ہے کہ اردو کا دائرہ موضوعاتی سطح پر وسیع سے وسیع تر اور خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اردو سے باضابطہ جڑے ہوئے لوگ چند مخصوص موضوعات میں ہی محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ میر و غالب، اقبال سے آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتے اور انہی پر اپنی ساری توانائی اور محنت صرف کر دیتے ہیں اور کوئی نیا زاویہ تلاش کرنے میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے کہ اردو میں موضوعات کی کمی ہو، بہت سارے ایسے موضوعات ہیں جن پر لوگوں کی نظر ابھی تک نہیں گئی ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے ایسے فنکار ہیں جنھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ بہت سی ایسی شخصیتیں ہیں جن کی علمی اور ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہے مگر وہ بھی تحقیق و تنقید کے دائرے میں نہیں آسکے۔ بہت سے علاقے ہیں جن سے بہت سی اہم ادبی اور علمی شخصیات کا رشتہ ہے مگر ان علاقوں کو بھی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس لیے اب ضرورت ہے کہ ہم اپنا زاویہ نظر بدلیں اور نئے موضوعات تلاش کریں، نئے امکانات کی جستجو کریں، پرانے اور فرسودہ موضوعات کے حصار سے باہر نکل کر ایسے موضوعات پر کام کریں جو ہمارے معاشرے کے لیے بھی مفید ثابت ہوں۔

ہماری تہذیب اور تاریخ کے بہت سے حوالے معدوم اور منسوخ ہوتے جا رہے ہیں، ان حوالوں کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ان گم نام فنکاروں کو بھی تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے مگر انھیں ابھی تک کوئی صلہ نہیں ملا۔ ایسے بھی بے نیاز فنکار ہیں جنھیں نہ ستائش کی تمنا رہی اور نہ صلے کی پرواہ، ان پر بھی ہماری نظر ہونی چاہیے۔ تبھی ہم محدود موضوعات کے حصار سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو پائیں گے اور اردو ادب کو نئے نئے موضوعات دے کر اس کی وسعتوں میں اضافہ کر پائیں گے۔

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

’اردو دنیا‘ کا فروری ماہ کا شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک گوناگوں مضامین کا زریں مرقع یا از حد خوب صورت ہفت رنگی قوسِ قزح ہے۔ یادِ نظیر’میرا بھارت مہان‘ نعرے کی ہی پے درپے کاملاً تصدیق کرنے کرانے والا مقالہ ثابت ہوتا ہے۔ خواجہ محمد اکرام الدین کے مضمون میں شاعری ونثر دونوں میں ہی صاحبِ طرز و اسلوب پنڈت ہری چند اختر کے ادب کو عرش ملسیانی و جوش ملسیانی کی ہی مانندان کے متعدد ادبی محاسن کو کوزے میں سمندر میں مقید کرنے کی ضرب المثل کے بموجب اگرچہ نشان زد کیا گیا ہے، تاہم ان کی تمام تر نگارشات کو یک جا کرکے بذریعہ اشاعت منظرِ عام پر لانے کی کاوشیں کرنے کے فوری تقاضے پر زور دیا گیا ہے۔ جناب الطاف احمد نے آزادی کے بعد شائع اہم اردو سفرناموں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وتمدن کے نمونے از حد عرق ریزی سے لبریز معرکہ آرا مضمون میں پیش کیے ہیں۔ عبدالرحمن صاحب نے چارلس ڈاروِن کے انسان اور دیگر حیوانات کے ارتقا کی بابت اس نظریے کو مثبت مثالوں کے ساتھ غلط ٹھہرایا ہے: جسے اجمالی طور پر فقط ایک ہی جملے میں یوں سمیٹا گیا ہے:

"That species are created not severely, but that

they originate by a series of developments"

اکبرالٰہ آبادی نے قرآن اور عیسائی مذہب کے بھی عقیدے کی داستان کی ہی بنیادوں پر فقط آدم اور حوا سے ہی انسان کا ارتقا ثابت کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کی انگریز پرستی کی غیر جانبدارانہ تشریح کی ہے۔ اکبر صاحب کے تیرونشتر تیز وترش ضرور ہیں۔ لیکن انھوں نے ہندوستانی عوام کی بے راہ روی اور دشمن مانے جانے والے انگریزوں کی نقل پرستی کرنے کو بھی آڑے ہاتھ لینے میں کوئی بھی کوتاہی یا رعایت ہرگز نہیں کی ہے۔ اسی طرح دیگر مضامین بھی قارئین کو دعوتِ مطالعہ دینے میں ہر چند پیچھے نہیں رہتے ہیں۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاوک** : کوٹھی نمبر201-A، گورونانک نگر گلی نمبر18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

فروری 2020 کا ’اردو دنیا‘ موصول ہوا۔ ہماری بات سے لے کر صفحۂ آخر تک تمام مشمولات معیاری ہیں۔ ہماری بات کے تحت مدیر شیخ عقیل احمد نے مختصر اور جامع الفاظ میں اُردو زبان وادب کی تاریخ، ترویج وترقی اور مقامی و عالمی زبانوں سے اردو کے رشتے پر بحث کی ہے۔ نقد ونگاہ کے کالم کے تحت محی الدین زور کاشمیری کے مضمون ’جموں کشمیر میں ہم عصر اُردو ڈراما اور تھیٹر کی صورت حال‘ کو بہترین مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ نیا آسماں نئے ستارے، کالم کے تحت محمد علیم اسماعیل کا تحقیقی جائزہ ’سوشل میڈیا اور اردو افسانہ‘ مضمون نگار کی عرق ریزی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ مضمون نگار نے افسانے کی ترویج و ترقی کے جدید ذرائع کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ گویا سمندر کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ سائنس اور کمپیوٹر کے تحت شامل مضامین بھی کافی معلوماتی ہیں۔ قومی اردو کونسل کے اس بین الاقوامی رسالے کا سفر خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے۔

❖ **سید اسماعیل گوہر** : ناندورہ، مہاراشٹر

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ فروری 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ پچھلے شماروں ہی کی طرح رنگارنگی، علمی وادبی اور مختلف شعبۂ حیات سے متعلق مضامین سے لبریز ہے۔ اس شمارے میں کافی اہم اور معیاری مضامین شامل ہیں۔ اس شمارے میں ’نیا آسماں نئے ستارے‘ کے تحت نوجوان قلمکاروں کو جگہ دے کر ان کی ہمت افزائی کی ہے۔ ’اردو دنیا‘ کے لیے نیک خواہشات اور بہترین تمنائیں پیش ہیں۔

❖ **ایس ٹی نور اللہ** ، ریسرچ اسکالر، مدراس یونیورسٹی، چنئی

ماہنامہ جنوری 2020 کا اردو دنیا بہ دست ہوا۔ مدیر شیخ عقیل احمد ہماری بات کے تحت جو اداریے لکھتے ہیں وہ اردو زبان وادب، تہذیب وثقافت، تمدن ومعاشرت کے لیے بالکل نئے اور دانش ورانہ ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں اردو زبان کا دوسری زبانوں سے تعلق ورشتے پر مدلل بحث ملتی ہے۔ جرار احمد کا مضمون ’تدریس زبان اردو میں طرز ہائے تحقیق‘ ایک جامع مضمون ہے۔ انھوں نے طلبا کی اردو زبان سے متعلق صلاحیتوں پر بات کی اور ان کو پیش آنے والے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نقد ونگاہ کے تحت ہری چند اختر کا نثری اور شعری اسلوب میں انفرادیت ہے، وہ معاصرین میں الگ اپنا انداز ہ بناتے ہیں کسی کے مقلد و نقل نہیں کیے ہیں۔ امراؤ جان ادا اور شاہد رعنا مضمون میں تقابل ملتا ہے۔ رسوا اور...... کا رویہ الگ الگ ہے۔ ویسے طوائف زدہ ماحول میں تقابل مشکل ہے اس میں طوائف کے کردار اور نخھی جان، امراؤ جان کا تجزیہ ملتا ہے۔ دونوں کے طوائف کے کردار کو علاحدہ علاحدہ پیش کیا گیا ہے۔ جموں وکشمیر میں ہم عصر اردو ڈراما از محی الدین زور کاشمیری اور افسر میرٹھی کی ادبی بصیرت اور قومی نصاب تعلیم ریاض احمد ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو سفرنامہ خاصے کی چیز ہے۔ اصناف میں اس طرح قدریں تلاش کرنا ضروری ہے۔ اردو کی دیگر اصناف میں بھی مشترکہ قدریں قومی یک جہتی کے عناصر مل سکتے ہیں۔ ترکی میں اردو زبان وادب امتیاز رومی نے لکھا ہے کہ دنیا میں ہر ملک میں کم از کم ایک اردو شعبہ قائم ہے۔ یادِ نظیر کے تحت علیم صبا نویدی نے نظم جدید میں نظیر کا پرتو برج دیش کا سچا عاشق میں نظیر کی حیات اور کلام کی خصوصیات اشعار کے ذریعے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالحی صاحب نے اردو اور یونانی لازم و ملزوم ہیں، حکیم سید احمد خاں سے انٹرویو لیا ہے۔ موصوف نے اچھے سوالات رکھے ہیں اور جوابات بھی کافی وشافی ملے ہیں۔ خصوصی گفتگو معلوماتی اور قابل عمل ہے۔ عالمی ادبیات میں شیکسپیئر، جاحظ پر معلوماتی اور بصیرت افروز مضامین ہیں۔ ’نیا آسماں نئے ستارے‘ کے تحت مضامین میں نئے نظریات شائع ہورہے ہیں۔ محمد علیم اسماعیل نے اردو افسانہ سوشل میڈیا پر روشنی ڈالی ہے۔ افسانہ کاغذ پر نہیں Screen پر پڑھا جارہا ہے۔ شخصیت، سائنس، کمپیوٹر، کتابوں کی دنیا، خبرنامہ کے مشمولات خوب تر ہیں اور قاری کو اپنے طور سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ’اردو دنیا‘ کے شمارے پڑھ کر مطالعہ کرکے اردو طلبہ JRF اور CISR اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ادب وزبان کے طالب کے لیے عمدہ اور مفید، کارگر وسودمند رسالہ ہے۔ ایسے رسالے کی ہر گھر میں ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی** : مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢urduduniyancpul@yahoo.co.in

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشان دہی ضرور فرمائیں، اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورتِ حال، تاریخ، آثارِ قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب وثقافت، علاقائی ادبی صورتِ حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں، اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

سعود عالم

ثانوی درجات میں اردو قصائد کی تدریس

قصیدے کی حیثیت اردو اصناف سخن میں 'ماں' کی سی ہے۔ قصیدہ ہی وہ صنف سخن ہے جس سے غزل، رباعی، مرثیہ اور قطعہ جیسی اصناف نکل کر سامنے آئی ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں کی طرح اردو ادب کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں ایک نظم اور دوسری نثر کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنی شناخت رکھتی ہے۔

جہاں تک 'نظم' کا تعلق ہے تو شاید ہی اردو کا کوئی ایسا طالب علم ہوگا کہ جو اس بات سے ناآشنا ہو کہ اردو ادب میں نظم دو معنوں میں مستعمل ہے۔ ایک بالعموم شاعری کے معنی میں اور دوسرا شاعری کی اُن تمام اصناف کے معنی میں جو غزل کے علاوہ ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب یا حالی کو نظم و نثر میں یکساں کمال تھا، تو اس طرح کے جملے میں نظم سے مراد شاعری ہوتی ہے، جو کہ نثر کی ضد ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال یا فیض کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے تو یہاں نظم سے مراد شاعری کی وہ تمام اصناف ہیں جنھیں غزل کی ضد کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی یا شہر آشوب وغیرہ۔ یہ تمام اصناف نظم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ غزل کی ضد ہیں کہ ان میں سے ہر صنف کا ایک موضوع ہوتا ہے اور صنف کا ہر شعر اُس موضوع سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ غزل کا کوئی ایک موضوع نہیں ہوتا۔ ایک غزل میں کئی موضوعات ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ایک غزل میں جتنے شعر ہوتے ہیں اتنے ہی ان کے موضوعات بھی ہوتے ہیں۔

اردو نظم کے اقسام پر غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب میں کئی قسم کی نظمیں موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر پابند نظمیں ہیں۔ یہ اقسام عربی / فارسی کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں قصیدہ، رباعی، مثنوی، قطعہ، شہر آشوب اور واسوخت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان ہی پابند نظموں میں ایک مقبول صنف قصیدہ بھی ہے۔ قصیدہ، نظم یا دیگر ناموں سے ہٹ کر اپنی خود کی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ اپنے موضوع پر آنے سے پہلے میں ایک بات اور واضح کرتا چلوں کہ صنف قصیدہ دیگر اصناف سے اس طور پر بھی مختلف ہے کہ قصیدہ میں تخیل بلند، الفاظ پر شکوہ دیگر اصناف کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔ ان ہی تمام وجوہات کی بنا پر قصیدہ ابتدائی درجات میں تو بالکل بھی نہیں پڑھایا جاتا، تاہم اتنا ضرور ہے کہ ثانوی درجوں میں برائے نام یا یوں کہہ لیجیے کہ بطور صنف اس کا تعارف ضرور کرایا دیا جاتا ہے۔

ان ہی باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے اس موضوع کا عنوان 'ثانوی درجات میں اردو قصائد کی تدریس' رکھا ہے۔ اس مقالے کے لیے سب سے پہلے ہم نے ملک کے کئی صوبوں کے نصاب کا سرسری جائزہ لیا، اس کے بعد ان صوبوں کے ثانوی درجات میں شامل نصاب قصائد کا بغور مطالعہ کیا۔ اُس کی روشنی میں ایک منصوبۂ سبق تیار کیا۔ جس کا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

جیسا کہ آپ سبھی جانتے ہیں کسی بھی صنف کو پڑھانے کے لیے بنیادی چیز اُس صنف کا تعارف ہے۔ اس لیے ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ منصوبۂ سبق بناتے وقت تمہیدی گفتگو سے پہلے کمرہ جماعت طلبا سے سابقہ معلومات سے متعلق چند سوالات کرے، پھر اس کی روشنی میں ان کی توجہ اصل موضوع کی طرف مرتکز کرائے۔ اس طرح طلبا و اساتذہ دونوں کا باہم متعلقہ سبق سے دلچسپی بڑھ جائے گی۔ اس کو منصوبۂ سبق کی اصطلاح میں 'اعلان سبق' کہتے ہیں۔

اعلان سبق کے بعد استاد کو چاہیے کہ وہ صنف سے متعلق تمام لوازمات و باریکیوں سے طلبا کو روشناس کرائے۔ تاکہ طلبا کو مذکورہ بالا مختصر تعارفی نکات کی مدد سے سبق کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ مثال کے طور پر اگر استاد قصیدہ پڑھا رہا ہے تو سب سے پہلے صنف قصیدہ کا تعارف کرائے کہ قصیدہ کیا ہے۔ قصیدہ کے معنی کیا ہیں۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ قصیدہ اردو میں کیسے متعارف ہوا، عربی میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ صنفی اعتبار سے فارسی میں قصیدہ کا کیا مقام ہے۔ چند مشہور عربی و فارسی قصیدہ گو شعرا یا کم سے کم ان کے

نام سے متعلق مختصر تعارف کرایا جائے، تو زیادہ مناسب ہوگا۔اسی طرح طلبا وطالبات کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ قصیدے کے عربی وفارسی زبان سے کیا انسلاکات ہیں۔کیوں کہ پڑھانا اردو قصیدہ ہے، اس لیے طلبا کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اردو ادب میں قصیدہ کی ابتدا کہاں ہوئی، اردو کا پہلا قصیدہ گو شاعر کون ہے، ان کے چند معاصرین سے بھی آگاہی ضروری ہے۔قصیدہ کے زرّیں دور سے بھی طلبا وطالبات کی واقفیت ضروری ہے تا کہ طلبا یہ ذہن نشین کر لیں کہ اردو ادب کی تمام اصناف کی طرح قصیدے کی ابتدا بھی دکن میں ہوئی، مگر اس کی پرورش و پرداخت شمالی ہند میں ہوئی۔قصیدہ کی تدریس میں طلبا کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شمالی ہند میں قصیدہ کا پہلا شاعر کون ہے، اسی طرح اُن کے معاصرین کا مختصر تعارف۔اور آخر میں ان کے ذہن میں یہ بھی نقش کرا دینا چاہیے کہ اردو کا سب سے مقبول قصیدہ گو شاعر کون ہے؟

قصیدہ پڑھاتے وقت استاد کو یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ اردو شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی بعض اصناف کی تعریف صرف موضوع کے حوالے سے ہوتی ہے اور بعض کی صرف ہیئت کے حوالے سے اور بعض کی موضوع اور ہیئت دونوں حوالوں سے۔اگر ہو سکے تو طلبا کی آسانی کے لیے ہر ایک سے ایک ایک مثال بھی پیش کر دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

مذکورہ بالا تمام خاص خاص باتوں کو اعلان سبق اور تمہیدی گفتگو کے ضمن میں لا کر ایک استاد کو اپنی بات آگے بڑھانی چاہیے۔ہاں ہم سب سے پہلے ایک استاد کو چاہیے کہ وہ قصیدہ کا متن بآواز بلند، ٹھہر ٹھہر کے اور صاف ادائیگی کے ساتھ قرأت کرے۔ ادب کی اصطلاح میں اسے معلّم کی بلند خوانی کہتے ہیں۔

اب ہم یہاں ثانوی درجات کے طلبا کو مدنظر رکھتے ہوئے NCERT کی درجہ گیارہ کی کتاب (گلستانِ ادب) سے ماخوذ ایک قصیدہ کی عبارت پیش کر رہے ہیں۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام	جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاص خواص	حبذا اے نشاطِ عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے	لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا	صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا	تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے	مجھ کو سمجھا ہے کیا، کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں	ایک ہی ہے امید گاہِ اَنام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش	غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

دوران قرأت ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ چند باتوں کو ملحوظ خاطر رکھے:

1. استاد کو چاہیے کہ وہ دوران قرأت الفاظ کی صحیح ادائیگی اور درست تلفظ کا خاص خیال رکھے۔
2. دوران قرأت قصیدہ کی لے، وزن اور آہنگ کا خیال بھی رکھے۔تا کہ سماعت میں طلبا پر اس کا بہتر اثر ہو سکے۔
3. استاد چاہیں تو ٹیپ یا رکارڈر کی مدد سے بھی طلبہ میں شوق پیدا کر سکتے ہیں۔

استاد کی بلند خوانی کے بعد اب استاد کو چاہیے کہ کچھ دیر 'خاموش مطالعہ' کے بعد وہ طلبا سے بھی بآواز بلند متن کی قرأت کروائے۔(ادب کی اصطلاح میں اسے متعلم کی بلند

قصیدہ کے زرّیں دور سے بھی طلبا وطالبات کی واقفیت ضروری ہے تاکہ طلبا یہ ذہن نشین کر لیں کہ اردو ادب کی تمام اصناف کی طرح قصیدے کی ابتدا بھی دکن میں ہوئی، مگر اس کی پرورش وپرداخت شمالی ہند میں ہوئی.قصیدہ کی تدریس میں طلبا کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شمالی ہندمیں قصیدہ کا پہلا شاعر کون ہے .اسی طرح اُن کے معاصرین کا مختصر تعارف. اور آخر میں ان کے ذہن میں یہ بھی نقش کرا دینا چاہیے کہ اردو کا سب سے مقبول قصیدہ گوشاعر کون ہے؟

خوانی کہتے ہیں)دوران قرأت ان کی غلطیوں کی نشاندھی کرے اور صحیح تلفظ یا صحیح ادائیگی کے ذریعے اُن کی غلطیوں کا ازالہ بھی کروائے۔اور ضرورت پڑنے پر Writing Bo ard کا بھی استعمال کرے۔ یہ ادائیگی کبھی فرداً فرداً اور کبھی پوری جماعت کے ساتھ کرائی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

تمہیدی گفتگو، اعلان سبق، معلّم کی بلندی خوانی اور متعلّم کی بلند خوانی کے بعد استاد کو چاہیے کہ وہ مذکورہ قصیدہ کی 'عملی قواعد' کی طرف طلبا کی توجہ مبذول کرائے۔عملی قواعد، منصوبۂ سبق کی جان ہوتی ہے۔اس کے ذریعے طلبا میں مشق و آموزش کی دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔اس لیے استاد پر لازم ہے کہ وہ عملی قواعد کے ذریعے سبق کو آسان سے آسان تر اور دلچسپ سے دلچسپ تر بنانے کی بھرپور کوشش کرے۔عملی قواعد میں ایک استاد کو مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے:

(1) استاد کو چاہیے کہ وہ سبق میں مذکور مشکل الفاظ کے معنی ڈکشنری کی مدد سے طلبا کو بتائے۔یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ طلبا کو وہی معنی بتائے جائیں جو سیاق وسباق کے لحاظ سے وہاں مستعمل ہو رہے ہوں۔منصوبۂ سبق کو بہتر بنانے کے لیے استاد اگر مناسب سمجھیں تو چارٹ کا بھی سہارا لے سکتے ہیں۔مثال کے طور پر:

الفاظ	معنی
بارے	آخرکار
گردشِ ایام	دنوں کا پھیر، وقت کی گردش
دام	جال
مرحبا	کلمۂ تحسین، کسی کی تعریف کرتے وقت یا شاباشی کے موقع پر بولا جاتا ہے
سرورِ خاص خواص	خاص لوگوں کی مسرّت
حبذا	کلمۂ تحسین
نشاطِ عام عوام	عام اور معمولی لوگوں کی خوشی
نمام	چغل خور
اَنام	مخلوق

(2) دوران تدریس بعض ایسے مشکل الفاظ بھی آتے ہیں، جن کے مترادفات سے طلبا کو آشنا کرنا اشد ضروری ہے۔کیونکہ قصیدہ ایک مشکل صنف سخن ہے۔اس صنف میں صرف انھیں شعرا نے طبع آزمائی کی ہے جنھیں اپنی زبان پر مکمل گرفت تھی۔اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قصیدہ ہر خاص وعام کی زبان نہیں۔قصیدہ کے قاری کے لیے واجب ہے کہ وہ صرف الفاظ پر ہی دست رس نہ رکھے بلکہ الفاظ کی بندش کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی قادر ہو۔قصیدہ میں زبان دانی کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی وراثت بھی مضمر ہے۔

عملی قواعد کے بعد اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا قصیدہ میں "غور کرنے کی

کون کون سی باتیں'' ہیں۔

اس ضمن میں ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے طلبا سے چند بنیادی سوال کرے جیسے کہ: اس قصیدہ کے خالق کون ہیں۔ یہ قصیدہ کس کی مدح میں لکھا گیا ہے۔اور یہ قصیدہ کس موقع پر لکھا گیا ہے؟ اگر طلبا کو متعلقہ سبق سے متعلق پہلے سے کچھ معلومات ہے تو بہتر، ورنہ استاد کو چاہیے کہ وہ اُن کی رہنمائی کرے۔ مذکورہ بالا قصیدہ کیوں کہ مدحیہ قصیدہ ہے اس لیے طلبا کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ قصیدہ صرف مدحیہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ہجویہ/ ذمّیہ بھی ہوتا ہے۔اس کے علاوہ طلبا کی معلومات کے لیے انھیں قصیدہ کے اقسام: شہر آشوب، تضحیک روزگار اور مذہبی قصیدے سے بھی واقف کرایا جاسکتا ہے۔

ایک استاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ/ طالبات سے چند ایسے سوالات کرے، جن کے جوابات: تحلیلی، توضیحی وتشریحی نوعیت پر مبنی ہوں۔مثال کے طور پر:

- قصیدہ کے پہلے مصرع میں شاعر نے 'مہ نو' یعنی: 'نیا چاند' سے مراد عید کا چاند لیا ہے۔ جو بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر کی طرف اشارہ ہے۔
- 'مہ نو' سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ: 'نیا چاند باریک ہوتا ہے اور اس کی شکل خمیدہ (جھکی ہوئی) ہوتی ہے۔اور ہماری گنگا جمنی تہذیب بھی یہی رہی ہے کہ جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو اپنی گردن تھوڑی سی جھکا لیتے ہیں۔

☆ طلبا میں مزید معلومات بہم پہنچانے کے لیے استاد ایک اسلامی روایت کی طرف بھی اشارہ کرسکتا ہے جیسے کہ قمری مہینے کے ابتدائی تین روز کے باریک چاند کو 'ہلال' کہتے ہیں۔

☆ 'مہ نو' (یعنی نیا چاند) علم بیان کی روشنی میں یہاں صنعت 'حسن تعلیل' کے طور پر استعمال ہوا ہے۔جس سے شاعر نے یہ مراد لیا ہے کہ 'نیا چاند' کسی کو سلام کررہا ہے۔

- طلبا کو اس جگہ یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ مطلع میں لفظ 'مہ' دراصل 'ماہ' کا مخفف ہے۔جیسے 'شاہ' کا مخفف 'شہ' اور 'راہ' کا مخفف 'رہ' وغیرہ۔
- اب جہاں تک تعلق دوسرے مصرع کا ہے تو اس روایت سے شاید ہی کوئی ناواقف ہوگا کہ نیا چاند نکلنے سے پہلے دو روز تک بالکل بھی چاند نظر نہیں آتا۔اسی کو شاعر نے یہاں استفہامیہ انداز میں بیان کیا کہ ''بارے دو دن کہاں رہا غائب؟'' اور اس کا جواب بھی خود شاعر قصیدے کے چھٹے مصرع میں دے رہا ہے ''عذر میں تین دن نہ آنے کے/ لے کے آیا ہے عید کا پیغام''

اب ایک استاد کو سمجھنا ہے کہ یہاں، ان اشعار میں غور کرنے کی بات کیا ہے؟ کیا شاعر کوئی نئی بات کہہ رہا ہے یا وہی گھسی پٹی بات دہرا رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بات پرانی ہو لیکن اس میں غور کرنے کی بات یہ ہو کہ شاعر کا انداز نیا ہو یا یہ کہ شاعر کا اسلوب اوروں سے مختلف ہو یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات بھی ہوسکتی ہے۔

میرے خیال سے ان اشعار میں دونوں ہی باتیں نئی ہیں۔ایک تو دو دن پہلے چھپنے اور دو دن بعد نکلنے والی بات اور دوسری ''اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا/ صبح جو جائے اور آئے شام'' یعنی وہ چاند جس نے صبح سے شام تک کا جو سفر طے کیا، اس کو بھول نہیں کہنا چاہیے، بلکہ یہ اس کی عادتِ خاصہ میں شامل ہے۔ یہاں شاعر کا فن دیکھنے کے لائق ہے۔ قابل تحسین ہے وہ شاعر جس نے اس مثل کو حسین تعبیر کی زینت بخشی۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہیں ذکر کیا ہے کہ قصیدہ کے بنیادی مقاصد میں سے ایک خاص مقصد زبان کی اصلاح بھی ہے۔

☆ 'آغاز اور انجام' سے مراد چاند کا گھٹنا اور بڑھنا ہے۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں چاند پہلے بڑھتا ہے اور 14 / دنوں میں مکمل چاند ہو جانے کے بعد چودھویں کا چاند کہلاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ گھٹنے لگتا ہے اور گھٹتے گھٹتے ختم ہونے کے بعد پھر از سرِ نو بڑھنے لگتا ہے۔ اور بالآخر مہینہ ختم ہونے سے دو روز قبل تک پورا چاند چھپ جاتا ہے کہ جیسا کہ شاعر نے اس کو ابتدائی اشعار میں بیان کیا ہے۔ اسی فلسفے کی اگلی کڑی کو یہاں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

- ایک استاد کو مندرجہ بالا تمام باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے پوری تیاری کے ساتھ درجے میں قدم رکھنا چاہیے اور پوری ایمانداری کے ساتھ طلبا وطالبات کے ذہن میں اٹھنے والے تمام سوالات کے مدلل جوابات دینے چاہیے۔
- اب ذرا آٹھویں شعر کو غور سے پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے اس شعر میں کس ہنرمندی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ متذکرہ بالا تمام اشعار تشبیب سے تعلق رکھتے ہیں۔اس کے چند اشعار کے بعد گریز کا شعر مذکور ہے۔اس کے فوراً ہی بعد شاعر اپنے اصل موضوع یعنی مدح کی طرف عود کرآتا ہے۔
- ساتھ ہی ساتھ یہاں اس نکتے کو بھی واضح کرتا چلوں کہ ایک استاد کو مختصراً ہی سہی، قصیدے کی اجزائے ترکیبی سے طلبا وطالبات کو روشناس کرا دینا چاہیے۔

اب ذرا اس شعر پر غور فرمائیے۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش　　غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

- یہ شعر استفہامیہ نوعیت کا حامل ہے۔اس شعر میں غالب سوالیہ پیرائے میں کچھ یوں گویا ہیں کہ: ''غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام'' اب دیکھیے اس شعر میں لفظ 'نہیں' کا بھی استعمال ہوا ہے اور انداز بیان بھی سوالیہ ہے۔ ایسے اقوال کو نحو وصرف کی اصطلاح میں 'استفہامِ انکاری' کہتے ہیں۔
- استاد کو چاہیے کہ وہ طلبا وطالبات کے سامنے ایسی گنجلک اور پیچیدہ اصطلاحات کو واضح کردیں تاکہ مستقبل میں ان کو دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
- استفہام انکاری میں دراصل اُسی بات کی تصدیق کی جاتی ہے جس کا وہ بظاہر انکار کر رہا ہوتا ہے۔ بایں طور پر اس کا مطلب کچھ اس طرح سے ہوگا: ''بے شک غالب اس کا غلام ہے'' مثال کے طور اگر کوئی یہ کہے کہ: ''کیا یہ اچھی کتاب نہیں ہے'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''یہ کتاب اچھی ہے''۔

مندرجہ بالا قصیدے کے متن سے متعلق ''عملی کام اور غور کرنے کی باتیں'' پر تحلیلی، تشریحی اور دیگر کاموں کے بعد ضروری ہے کہ ایک استاد اپنے پڑھائے ہوئے قصیدے سے متعلق طلبا وطالبات سے چند معروضی سوالات کرے تاکہ اس سے ان کی تفہیم کا اندازہ لگایا جاسکے۔

اور آخر میں 'عملی کام' کے طور پر سبق کی روشنی میں طلبا وطالبات سے سبق سے متعلق چند کاموں کی پیش کش کی جائے تاکہ ان کی آموزش میں پختگی آسکے، جوان کے مستقبل کو بنانے اور سنوارنے میں ممد ومعاون ثابت ہو۔

اس طور پر ایک استاد پوری تیاری کے ساتھ ایک سبق کو بہتر سے بہتر طریقے سے پیش کرنے اور سبق کو آسان سے آسان تر بنانے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے جس کی آج کے موجودہ دور میں بہت ضرورت ہے۔

■

Saud Alam
B.114, Okhla Main Market
Jamia Nagar
New Delhi-1106
Mob:8076495936
saudalam1983@gmail.com

محمد افروز عالم

تدریس کے عصری تقاضے

تعلیم کا اولین مقصد انسان کی ذہنی، جسمانی اور روحانی نشوونما کرنا ہے۔ حصولِ تعلیم کے لیے قابل اساتذہ بے حد ضروری ہیں جو طلبہ کو تعلیم کے حصول میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ تعلیم محض معلومات کو طلبہ کے ذہنوں تک پہنچادینے کا نام نہیں۔ بلکہ ان کے ذہنوں کو جلا بخشنے، انھیں سوچنے کا صحیح اسلوب سکھانے، ان میں ذوق نظری اور تنقیدی نگاہ پیدا کرنے اور انھیں فکری اجتہاد کے قابل بنانے کا نام ہے۔ تو یہ مقاصد ہم اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتے جب تک کہ قابل، باصلاحیت اور تربیت یافتہ استاد دستیاب نہ ہوں۔ حقیقی استاد وہ ہے جو طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور انھیں شعور وادراک، علم وآگہی نیز فکر ونظر کی دولت سے مالا مال کرے۔ رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا کہ "میں پڑھاتا نہیں جگاتا ہوں"۔ جن اساتذہ نے اپنی ذمہ داری کو بہتر طریقے سے نبھایا ان کے شاگرد آخری دم تک ان کے احسان مند رہتے ہیں۔

طلبہ کی تعلیمی تشکیل اور ان کی تربیت میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ان عوامل میں مادری تربیت، ماحول، دوست واحباب، تعلیمی ادارے اور ذرائع ابلاغ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل وہ اساتذۂ کرام ہیں جن کے بغیر طلبہ اور معاشرے کی تشکیل اور ترقی ممکن نہیں۔ ایک استاد کا اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ تدریس کے شعبے میں ماہر ہونا بھی لازمی ہے۔ استاد کو نہ صرف اپنے مواد ومضمون پر مکمل مہارت ہونی چاہیے بلکہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مضمون کس طرح پڑھانا ہے؟ تدریس کے کون سے طریقے استعمال کرنے ہیں؟ اور ان طریقوں کے استعمال کے کیا فوائد ونقصان ہوسکتے ہیں؟ استاد کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پاس کیا وسائل ہیں؟ اور ان وسائل کو کس طرح استعمال کرنا ہے؟ عصر حاضر میں استاد کو جدید اطلاعاتی اور ترسیلی ٹکنالوجی کا استعمال آنا چاہیے اور کسی سہولت کی عدم دستیابی میں بھی پڑھانے کا سلیقہ آنا چاہیے۔

وقت کے ساتھ ساتھ تدریس کے مراحل میں اضافہ اور طریقۂ کار میں مسلسل تبدیلی واقع ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا شعبۂ تعلیم وتربیت میں داخلہ لینے والے یعنی اساتذہ کی اپنی تیاری کا کام بھی سائنسی انداز اختیار کرتا جارہا ہے۔ جب یہ اساتذہ اپنے تربیتی کورس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں تو مختلف عمروں اور جماعتوں کے طلبہ کی تعلیم و تدریس کے فن سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔

تدریس کوئی جزوقتی پیشہ نہیں بلکہ اساتذہ کو اپنے طلبہ کی فلاح وبہبود کے لیے ہمہ وقتی ذہنی اور جسمانی محنت ومشق کے لیے تیار رہنا ہوتا ہے۔ کمرۂ جماعت میں انھیں جو سبق پڑھانا ہے، اس کے لیے ایک روز قبل سبق کے تمام مراحل کا منصوبہ بنانا پڑتا ہے جسے سبق کی منصوبہ بندی کہتے ہیں۔ پھر کمرۂ جماعت میں طلبہ کی خوبیوں اور خامیوں کے مدِ نظر اسی مناسبت سے ان پر توجہ بھی دیتے ہیں۔ سبق کے اختتام پر عمومی جائزہ لے کر نتائج کا اندازہ کیا جاتا ہے اور آخر میں گھر کا کام تفویض کرتے ہیں۔ یہ تدریس واکتساب کا سائنسی طریقہ بھی ہے۔

علمی قابلیت اور صلاحیت کو بڑھاتے رہنا اساتذہ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ جو مضامین پڑھاتا ہے، ان سے متعلقہ مطلوبہ تمام معلومات طلبہ کو فراہم کی جائیں۔ یہ تب ہوسکتا ہے جب آپ خود ان سے مالا مال ہوں۔ تدریس کے لیے مفوضہ فن میں قابلیت اور متعدد معلومات کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مباحث کا مربوط انداز میں تجزیہ کرکے پڑھائیں۔

تدریس کے مختلف طریقے ہیں، ان میں سے ایک ہی طریقہ ہر حالت اور ہر ماحول کے لیے مناسب نہیں ہوتا بلکہ اساتذہ کو مختلف اوقات اور احوال کے مطابق مفید سے مفید تر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ طلبہ کے لیے سب سے مفید طریقہ وہ ہوتا ہے جس طریقے سے وہ سبق سمجھ سکیں اور اساتذہ کے لیے بھی بہتر طریقہ وہی ہے جس سے وہ آسانی کے ساتھ سبق سمجھا سکیں۔ تدریس کے لیے ہمیشہ ایک ہی طریقہ اور اسلوب اپنانا ایسی چیز ہے جو طلبہ کو سستی اور پریشانی میں مبتلا کردیتی ہے۔ اس لیے ہر سبق کو پڑھانے کے لیے نیا اسلوب وطریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ طلبہ میں نشاط پیدا کرنے کے لیے ان سے بھی کام لیا جائے۔

افلاطون نے کہا تھا کہ بہترین معاشرہ تشکیل دینے کے لیے بہترین نظامِ تعلیم ضروری ہے، لیکن دوسری طرف کسی بھی معاشرے کا تعلیمی نظام اس معاشرے کے مجموعی ثقافتی معیار سے مشروط ہے۔

بقول علامہ اقبال معلم کا فرض تمام فرائض سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اس کی محنت ہے۔

بقول ڈاکٹر ذاکر حسین استاد وہاں امید کرتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں، وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں، اسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں۔

بقول خواجہ غلام السیدین معلم کے پیشے کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو اسے تقریباً تمام پیشوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسے اپنے طلبہ کے دل ودماغ اور روح سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے اور ان پر اس کی شخصیت، فلسفۂ زندگی، اس کے طرزعمل کا اثر بالواسطہ پڑتا ہے۔

سید حامد کے مطابق بچوں کو پڑھانا صرف ان لوگوں کا حق ہے جن کو بچوں سے متعلق جانکاری ہو۔

* معلم کا کام طلبہ کی تربیت اور اصلاح، معلومات کی منتقلی اور اپنے مثالی کردار کا تاثر قائم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ ٹھوس حقائق کو بے رنگ انداز میں بیان نہ کر ڈالے بلکہ اپنی شگفتہ بیانی اور شیریں مقالی سے اپنے درس کو دلچسپ اور پرکشش بنائے۔

* ایک استاد کو ماہر مضمون ہونا چاہیے۔ ایک استاد کو فن تدریس اور طریقۂ تدریس میں بھی ماہر ہونا چاہیے تاکہ وہ علم کو موثر طور پر منتقل کر سکے۔ ایک استاد کو منفرد شخصیت کا حامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ تدریس میں استاد کا اپنا ذاتی تشخص بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ استاد کی انفرادیت اور شخصی عادات واوصاف کو موثر تدریس سے الگ نہیں رکھا جاسکتا۔ استاد کی شخصیت، طلبہ کی تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس ضمن میں متوازن نقطۂ نظر یہی ہے کہ استاد نفسِ مضمون اور طریقۂ تدریس کے سائنسی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اخلاق، متحرک، ادب شناس اور مقصد حیات سے باخبر منفرد شخصیت کا حامل بھی ہو۔

* اچھا استاد ذوق مطالعہ وتحقیق رکھتا ہے۔ پوری زندگی طالب علم رہتا ہے اور ہمیشہ حصول علم کا شائق ہوتا ہے۔

* معلم اور متعلم دونوں قابل احترام ہیں یعنی معلم کو متعلم کا اور متعلم کو معلم کا احترام کرنا چاہیے۔ معلم تربیت کی خاطر اگر سختی بھی کرے تو اسے جذبۂ رحمت کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ معلم کو اس تدریسی اصول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان باہمی احترام کی فضا بحال کیے بغیر بہتر اور خوشگوار تعلیمی ماحول ممکن نہیں۔

* سوال اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب تدریس کا لازمی جز ہے۔

* ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ اساتذہ آج اس پیشے کو مجبوری میں اپناتے ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جب کوئی اور شعبہ حیات میں مقام نہیں بناپاتے تو اس کو اختیار کرتے ہیں جو سراسر اس فرض سے ناانصافی ہے۔

* موجودہ وقت میں تعلیم ایک کاروبار کی حیثیت اختیار کرگئی ہے جس نے معلم کے مقام کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

* استاد کا کام صرف بچوں کو تعلیم دینا نہیں بلکہ ان کی تربیت کرنا بھی ہے۔ بچوں کی تربیت سازی میں اساتذہ کا کردار کم ہو رہا ہے۔ لہٰذا اسے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

* درس وتدریس کے عمل میں اساتذہ کو ایک انتہائی اہم اور قابل عزت مقام حاصل ہے۔ اساتذہ اپنے پیشے سے منسلک رہ کر نئی نسل کو نت نئے علوم اور درس دے کر انھیں ایک مہذب انسان بناتے ہیں۔ استاد کو اپنے پیشے سے تواتر کے ساتھ منسلک ہونا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ لمبے عرصے تک درس وتدریس کے عمل سے دوری کی صورت میں اس کی مہارت اور علم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

تعلیم اساتذہ کے عصری مواقع:

تعلیم وتدریس کے مسلسل فروغ کے باعث اس شعبے میں روزگار کی گنجائش اور مواقع بھی زیادہ ہیں۔ ڈی۔ ایل ایڈ کی ڈگری کے بعد ابتدائی اور تحتانوی سطح کے اسکولوں میں مواقع دستیاب ہیں۔ جب کہ بی۔ ایڈ کی ڈگری کے بعد ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ایم۔ ایڈ کی ڈگری کے بعد کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، ٹیچرس ٹریننگ کالج، ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ (DIET) اور یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات میں تدریسی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

موجودہ وقت میں مرکزی حکومت کی جانب سے سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن (CBSE) کے ذریعہ سنٹرل ٹیچر اہلیتی ٹسٹ (CTET) امتحان منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں کامیاب ہونے پر مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کے تحتانوی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں بطور اساتذہ تقرری ہوتی ہے۔ حال ہی میں جاری کردہ سنٹرل ٹیچر اہلیتی ٹسٹ دسمبر 2018 کے نتائج میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم وتربیت کے لیے بڑی خوشخبری لے کر آیا۔ نتائج کے مطابق سینکڑوں طلبہ نے اپنی کامیابی درج کروائی۔ زیادہ تر طلبہ نے سی ٹی ای ٹی کی دونوں سطحوں پر کامیابی حاصل کی۔ واضح رہے کہ نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (NCTE) کی ہدایات اور رہنما خطوط کی بنیاد پر باصلاحیت اساتذہ کی فراہمی کے لیے قومی سطح پر اس ٹسٹ کا انعقاد کیا جاتا ہے، جو طلبہ کی کیندریہ ودیالیہ، نودے اسکول ودیگر مرکزی وریاستی اسکولوں میں بھرتی کے لیے معاون ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مختلف ریاستی حکومتوں کے ذریعہ اسٹیٹ ٹیچر اہلیتی ٹسٹ (STET) کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے، اس میں بھی سینکڑوں طلبہ کامیاب ہوچکے ہیں۔ اس ضمن میں ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے لیے عصری تقاضوں کی روشنی میں زیرتربیت معلمین کی تربیت کرتے ہوئے اردو ذریعۂ تعلیم سے بہترین اساتذہ تیار کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اسکول برائے تعلیم وتربیت قائم ہے۔ اس اسکول کے تحت ایک شعبۂ تعلیم وتربیت اور آٹھ کالجز آف ٹیچر ایجوکیشن چلائے جارہے ہیں۔ ان کا مقصد درس وتدریس میں دلچسپی رکھنے اور کیریئر بنانے والے افراد کی تربیت کرنا ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ ملک گیر سطح پر نہ صرف برسر روزگار ہورہے ہیں بلکہ زیر تعلیم طلبہ بھی مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کررہے ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اسکول برائے تعلیم وتربیت سے منسلک مرکز پیشہ وارانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعۂ تعلیم (CPDUMT) بھی اس ضمن میں اہم رول نبھا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں اور دینی مدرسوں سے وابستہ اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے تربیت دی جاتی ہے۔ تاکہ اساتذہ کو تعلیم وتدریس کے شعبے میں آرہی تبدیلیوں سے واقف کرایا جائے اور اردو ذریعۂ تعلیم کے تدریسی معیار کو بلند کیا جاسکے۔ جس سے اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ عصری تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

حوالے:

1. خواجہ غلام السیدین، اصول تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
2. ڈی ایس گورڈن، اصول تعلیم اور عمل تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
3. محمد مجیب، قومی سوانح حیات کا سلسلہ: ڈاکٹر ذاکر حسین، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔
4. محمد اکرام خاں، مفکرین تعلیم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔
5. محمد اختر صدیقی، تدریسی۔ آموزشی حکمت عملیاں، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی
6. محمد افروز عالم، تعلیمی نفسیات کے جدید تصورات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
7. www.manuu.ac.in
8. www.ctet.nic.in
9. www.ncte-india.org

■

Dr. Md. Afroz Alam
Assistant Professor
Dept. of Education & Training
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032
Email: afrozmanuu@gmail.com
Mobile: +918885472844

نایاب حسن

عالمی یوم مادری زبان کی پروقار تقریب

ہمیں ہر حال میں اپنی لسانی وراثت کا تحفظ کرنا چاہیے، خصوصاً بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جائے، کیونکہ وہ مادری زبان میں سکھائی جانے والی چیزوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریۂ ہند وینکیا نائیڈو نے عالمی یوم مادری زبان کی مناسبت سے وزارتِ فروغ انسانی وسائل اور وزارتِ ثقافت کے اشتراک سے امبیڈکر انٹرنیشنل سینٹر، 15 جن پتھ، نئی دہلی میں منعقدہ پروگرام کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے عالمی یومِ مادری زبان کی تاریخ اور پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ابتداءً اس کی تجویز بنگلہ دیش نے پیش کی تھی جسے 1999 میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں منظوری دی گئی اور 2000 سے پوری دنیا میں عالمی یومِ مادری زبان منایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یونیسکو کی طرح ہندوستان کا بھی یہ ماننا ہے کہ پائیدار معاشرے کے لیے تہذیبی ولسانی تنوع اہم ہے اور ہمارا پختہ نظریہ ہے کہ ہمیں ہر حال میں اپنی لسانی وراثت کا تحفظ کرنا چاہیے۔ انھوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ عالمی سطح پر 40 فیصد آبادی کو اس زبان میں تعلیم نہیں دی جاتی جسے وہ بولتی یا سمجھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ لسانی تنوع کے سلسلے میں ہندوستان کا نظریہ وہی ہے جو یونیسکو کا ہے اور ہمارا ماننا ہے کہ مادری زبان پر مبنی ذولسانی تعلیم بہت اہم ہے۔ میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہم اپنی متنوع و منفرد لسانی وراثت کا تحفظ کریں اور اسے فروغ دیں۔ ہندوستان کے عظیم شاعر اچاریہ ڈانڈی نے کہا ہے کہ اگر زبان کی روشنی نہ ہو، تو ہم تاریک دنیا میں گم ہو جائیں گے۔ زبان ہماری دنیا کو روشن کرتی اور ہمارے لیے دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کو سمجھنا آسان بناتی ہے۔ زبان ذہنی و جذباتی اظہار کا ذریعہ ہے۔ جب کسی کو اظہارِ خیال کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان اپنے تجربات و احساسات کسی دوسرے کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے، تو زبان ہی اس کا ایک مضبوط وسیلہ بنتی ہے۔ یہ ایک ایسا وسیلہ ہے جو لوگوں کو ایک ساتھ لاتا اور ایک سماج کی تشکیل کرتا ہے، یہ سماج میں تہذیبی تعلقات کو بڑھاوا دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ زبان ایک ایسا غیر مرئی دھاگا ہے جو ماضی کو حال سے مربوط کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ملک میں

> ”پائیدار معاشرے کے لیے تہذیبی و لسانی تنوع اہم ہے اور ہمارا پختہ نظریہ ہے کہ ہمیں ہر حال میں اپنی لسانی وراثت کا تحفظ کرنا چاہیے۔“
>
> وینکیا نائیڈو، نائب صدر جمہوریہ ہند

ایک عظیم لسانی روایت پائی جاتی ہے، ہمارے پاس ایک بڑا لسانی خزانہ ہے، ہم لسانی وتہذیبی تنوع کے اعتبار سے ایک غیر معمولی قوم ہیں۔ لسانی تکثیریت اور مختلف زبانوں کی موجودگی نے ہمارے ملک کو ایک خوب صورت رنگ اور زندگی بخشی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی زبانیں اپنی معقول ساختیات، صاف شفاف صوتیات اور تلفظ اور واضح اصول وقواعد کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہی ہیں۔ ہماری زبانیں ہمارے وسیع وترقی یافتہ قدیم، عہدِ وسطی اور جدید ادب کی تعبیر واظہار کا وسیلہ ہیں۔ لسانی سروے کے اعداد وشمار کے مطابق ہندوستان میں 19,500 سے زائد زبانیں

اور بولیاں مادری زبان کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ 121 زبانیں ایسی ہیں، جنھیں ہندوستان میں دس ہزار سے زیادہ لوگ بولتے ہیں۔ ہماری زبانیں ہماری مشترکہ معلومات اور دانش کا خزانہ ہیں جنھیں ہم نے اپنے طویل متحرک تہذیبی سفر کے دوران جمع کیا ہے۔

مسٹر نائیڈو نے کہا کہ اگر ہم اپنی مادری زبانوں کی حفاظت کرتے اور اسے فروغ دیتے ہیں تو اس سے ہندوستان کے لسانی و تہذیبی تنوع کا بھی تحفظ ہوگا اور اسے ترقی حاصل ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان میں مہارت حاصل کرکے ہی ہم اپنی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ پرائمری اسکولوں کی سطح پر مادری زبان میں تعلیم کو ضروری قرار دیا جائے اور سرکاری ملازمتوں کے لیے مادری زبان جاننے کو بھی لازم قرار دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی تمام زبانوں کو نیشنل سطح پر پرموٹ کرنا حکومت کی ذمے داری ہے، اس کے علاوہ ہمیں بھی اپنے گھروں میں، اپنے لوگوں کے درمیان شاعری، افسانہ و کہانی نویسی کے ذریعے اپنی مادری زبان کو فروغ دینا چاہیے۔ نائب صدر جمہوریہ نے مادری زبان اور دیگر زبانوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان آنکھ کی طرح ہے اور دوسری زبانیں چشمے کے مانند ہیں، اگر آنکھ میں بینائی نہیں ہوگی، تو چشمے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مادری زبان کے تحفظ کو ایک مذہبی فریضہ سمجھنا چاہیے اور اس کے فروغ کے عمل کو ایک تحریک اور مشن بنانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ایک انسان کا بہ تدریج ارتقا ہوتا ہے، اسی طرح زبان بھی ارتقا حاصل کرتی اور مسلسل استعمال سے نشو ونما پاتی ہے، اگر آپ کسی زبان کو استعمال نہیں کریں گے تو اسے کھودیں گے اور جب کوئی زبان مرتی ہے تو اس کے ساتھ معلومات کا ایک پورا سسٹم ختم ہوجاتا ہے۔ مسٹر نائیڈو نے کہا کہ آج کے پروگرام سے ہمیں تحریک حاصل کرنی چاہیے اور یہ عہد کرنا چاہیے کہ اپنی روزمرہ زندگی میں مادری زبان کی حفاظت کریں گے اور ساتھ ہی دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی مہارت حاصل کریں گے۔ نائب صدر نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تمام ہندوستانیوں کو تلقین کی تھی کہ کسی بھی مادری زبان کو نظرانداز نہ کیا جائے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری زبان مثلاً انگریزی وغیرہ نہ سیکھی جائے۔ سردار پٹیل کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے کہا تھا کہ بچوں کو شروع سے ہی اجنبی زبان میں علم حاصل کرنے

مادری زبان کی اہمیت سے متعلق اقوال

- "اگر آپ کسی سے ایسی زبان میں بات کرتے ہیں، جسے وہ سمجھتا ہے تو وہ بات اس کے سر (دماغ) تک پہنچے گی؛ لیکن اگر آپ اس سے اس کی مادری زبان میں بات کرتے ہیں، وہ اس کے دل تک پہنچے گی"۔ **نیلسن منڈیلا**
- "ہمیں اپنی مادری زبان کی خوب صورتی کا ادراک اس وقت ہوتا ہے، جب ہم اپنے وطن سے باہر ہوتے ہیں"۔ **جارج برنارڈ**
- "میرے والد کی عقل اور میری مادری زبان دونوں میری معاون ہیں"۔ **ولیم شیکسپیئر**
- "میری مادری زبان البانوی ہے، مگر مجھے بنگالی اور انگریزی میں بھی مہارت حاصل ہے"۔ **مدر ٹریسا**
- "اگر کوئی اپنی مادری زبان کو بھلا دے، تو اپنی قدر کھو دیتا ہے"۔ **پرمکھ سوامی مہاراج**
- "مادری زبان کے علم کے بغیر کوئی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی"۔ **بھارتیندو ہرش چندر**
- "سوراج کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری زبان بولنے والوں پر اپنی زبان تھوپی جائے، بنیادی ترجیح مادری زبان کو دینی چاہیے اور ہندی یا جو زبان اس ملک کے عام لوگ بولتے ہیں، اسے ثانوی اہمیت دینی چاہیے"۔ مہاتما گاندھی
- "بچے کی پرائمری سطح کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے"۔ **مولانا ابوالکلام آزاد**
- "جس ملک کو اپنے زبان و ادب پر فخر نہیں ہے، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا"۔ سابق صدر جمہوریہ ہند **ڈاکٹر راجندر پرساد**
- "میں جب بھی کسی زبان کے خاتمے کے بارے میں سنتی ہوں، تو تکلیف ہوتی ہے؛ کیوں کہ زبانیں قوموں کا شجرۂ نسب ہوتی ہیں"۔ **سیموئل جانسن**
- "بغیر مادری زبان کے کسی قوم کا کوئی وجود نہیں ہوتا"۔ **جیک ایڈورڈ**
- "ہمارے لیے ضروری ہے کہ سائنس کی تعلیم مادری زبان میں دیں، اگر ایسا نہیں ہوا تو سائنس ایک ایسی تیز تر سرگرمی میں بدل جائے گی، جس میں تمام لوگوں کی شرکت ممکن نہیں رہے گی"۔ **سی وی رمن**
- "میں نے دسویں کلاس تک کی تعلیم مادری زبان میں حاصل کی، اس کے بعد انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا"۔ سابق صدر جمہوریہ ہند **اے پی جے عبدالکلام**
- "ہر مادری زبان عالمی زبان ہوتی ہے"۔ **نوم چومسکی**
- "تعبیر و اظہار کا سب سے مضبوط وسیلہ ہماری مادری زبان ہے، جسے ہم اپنے بچپن میں غیر شعوری طور پر سیکھتے ہیں۔ اسی کے ذریعے زندگی کے تئیں ہمارے طرز فکر کی تشکیل ہوتی ہے"۔ **مارشل میکرلوہان**

> "اگر زبان کی روشنی نہ ہو تو ہم تاریک دنیا میں گم ہوجائیں گے۔ زبان ہماری دنیا کو روشن کرتی اور ہمارے لیے دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کو سمجھنا آسان بناتی ہے۔ لسانی تکثیریت اور مختلف زبانوں کی موجودگی نے ہمارے ملک کو ایک خوب صورت رنگ اور زندگی بخشی ہے۔"
>
> اچاریہ ڈانڈی

پر مجبور کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ الفاظ تو یاد کر لیتے ہیں مگر سمجھتے کچھ نہیں ہیں اور جوں جوں رٹنے اور محض یاد کرنے کی قوت بڑھتی جاتی ہے، سمجھنے کی صلاحیت گھٹتی جاتی ہے۔ 1946 میں ناگپور یونیورسٹی کے کانووکیشن میں سردار پٹیل کے خطاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے کہا تھا'' آپ کی یونیورسٹی نے یہ دکھا دیا کہ اگر قوتِ ارادی ہو تو راستہ بھی مل جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس قوتِ ارادی کا استعمال منظم منصوبہ بندی اور عزم مصمم کے ساتھ کریں گے اور جب ہندوستانی زبان کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ طلبہ کا بہت ساقت بچے گا، ان کی قوتِ فہم میں اضافہ ہوگا اور ان کا ذہن تیز ہوگا''۔ انھوں نے 21 رفروری کو وزارتِ برائے فروغ انسانی وسائل کے ذریعے ملک بھر کے ایک لاکھ اسکولوں میں عالمی یومِ مادری زبان منانے کے فیصلے کی تحسین کی۔ اس سے قبل نائب صدر جمہوریہ کے پروگرام میں پہنچنے پر اسکولی طلبہ وطالبات کے ذریعے ان کا ہندوستان کی بائیس زبانوں میں استقبال کیا گیا، یہ تمام طلبہ و طالبات مختلف ریاستوں کے روایتی لباسوں میں ملبوس تھے اور وہاں کی مختلف زندہ تہذیبوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اپنی تقریر کے آغاز میں مسٹر نائیڈو نے تمام حاضرین کو ہندوستان کی بائیسوں زبانوں میں عالمی یومِ مادری زبان کی مبارکباد پیش کر کے متحیر کر دیا۔

اس موقعے پر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل رمیش پوکھریال نشنک نے بھی مادری زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان میں سیکھی جانے والی چیز ساری زندگی یاد رہتی ہیں، ہم پوری دنیا کی زبانیں سیکھیں، مگر اپنی مادری زبان کو کبھی نہ بھولیں، اس کے بغیر انسان کٹی پتنگ کی طرح ہو جاتا ہے اور کسی بھی شعبے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں تہذیبی ولسانی تنوع پایا جاتا ہے اور یہی انیکتا میں ایکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بائیس زبانیں ہیں اور جب یہ ساری زبانیں ملتی ہیں تو پورا ملک متحد ہو جاتا ہے۔ بھارت سرکار نے مختلف زبانوں کے الگ الگ ادارے بنائے ہیں تاکہ ان زبانوں کو فروغ دیا جائے اور یہ ادارے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کے پروگرام کے ذریعے ہم مادری زبان کے تحفظ اور فروغ کے تئیں ایک نئی تحریک شروع کریں گے۔ وزیرِ مملکت برائے فروغ انسانی وسائل سنجے دھوترے نے بھی مادری زبان میں بچوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اسے پورے ملک کی اجتماعی ذمے داری قرار دیا۔ وزیرِ مملکت برائے ثقافتی امور (آزادانہ اختیارات) پرہلاد سنگھ پٹیل نے بھی مادری زبان میں تعلیم وتحقیق کو اہم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ متعدد سائنسی تحقیقات

> ہمارے ملک میں تہذیبی ولسانی تنوع پایا جاتا ہے اور یہی انیکتا میں ایکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بائیس زبانیں ہیں اور جب یہ ساری زبانیں ملتی ہیں تو پورا ملک متحد ہو جاتا ہے۔
>
> مرکزی رمیش پوکھریال نشنک، وزیر برائے فروغ انسانی وسائل

سے یہ نتیجہ حاصل ہوا ہے کہ جو علمی و تحقیقی کام مادری زبان میں کیا جائے اس میں زیادہ پائیداری و مضبوطی ہوتی ہے۔

اس پروگرام میں مختلف دیگر زبانوں کے اداروں کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی حصہ لیا اور کونسل کی مطبوعات کا اسٹال بھی لگایا، جس کا نائب صدر جمہوریہ اور وزرا نے معائنہ کیا اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔ کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے نائب صدر جمہوریہ و معزز وزرا کو کونسل کی سرگرمیوں اور اردو زبان کے فروغ کے لیے کی جانے والی پیش رفتوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ انھوں نے عالمی یوم مادری زبان کو اعلیٰ پیمانے پر منائے جانے کے حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل اور وزارت ثقافت کا یہ مشترکہ اقدام ہندوستان کی مادری زبانوں کے تحفظ کے تئیں ایک نئی عوامی بیداری پیدا کرے گا اور لوگ اپنی مادری زبان کی حفاظت کے لیے سنجیدہ کوشش کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم سبھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان اپنے خیالات کا بہتر اور موثر اظہار اپنی مادری زبان میں ہی کر سکتا ہے اور ایک بات جس خوبی اور جامعیت کے ساتھ مادری زبان میں کی جا سکتی ہے وہ دوسری کسی زبان میں نہیں کی جا سکتی، پس ہمیں دنیا بھر کی دوسری زبانوں کے ساتھ مادری زبان کے نہ صرف تحفظ کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے بلکہ اسے اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی میں برتنا بھی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل مادری زبان کے فروغ کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہے اور ان تمام لوگوں تک اردو زبان پہنچانے اور انھیں سکھانے کی کوشش کر رہی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے، اس کے علاوہ کونسل کی کوششوں سے ہند و بیرون ہند میں اردو کی نئی بستیاں بھی آباد ہو رہی ہیں۔

اجلاس کے دوسرے سیشن میں سی آئی ایل میسور کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر اودے نارائن سنگھ نے ہندوستانی لسانیات اور مادری زبانوں کے تحفظ کو درپیش مسائل و امکانات پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ آئی آئی ٹی پٹنہ کے ڈائریکٹر پروفیسر پشپک بھٹاچاریہ نے زبان اور ٹکنالوجی

> ❝دنیا بھر کی دوسری زبانوں کے ساتھ مادری زبان کے نہ صرف تحفظ کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے بلکہ اسے اپنی اجتماعی وانفرادی زندگی میں برتنا بھی چاہیے۔❞
>
> شیخ عقیل احمد، ڈائرکٹر، این سی پی یو ایل

کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ سی آئی ایل میسور کے ڈائریکٹر پروفیسر راؤ نے مختلف زبانوں کو ٹکنالوجی سے مربوط کرنے اور ان کے استعمال کے طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے اس سمت میں سی آئی ایل کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ نارتھ ٹیکساس یونیورسٹی امریکہ کی پروفیسر سومنا چلیا نے لینگویج ڈاکیومنٹیشن اور زبانوں کو محفوظ رکھنے کے طریقوں پر گفتگو کی اور نارتھ ٹیکساس یونیورسٹی کے ڈیجیٹل لائبریرین مارک فلپ نے زبانوں کے تحفظ میں ڈیجیٹل لائبریری کے کردار پر روشنی ڈالی۔

اجلاس کے تیسرے سیشن کی پہلی نشست میں ہندی، کنڑ، آسامی، منی پوری، کونکنی وغیرہ کے ماہرین نے اپنی اپنی زبانوں میں کیے جانے والے تحفظ و فروغ کے کاموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا اور دوسری نشست میں اردو، سنسکرت، بوڈو، تمل اور کشمیری زبانوں کے ماہرین نے متعلقہ زبانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کے فروغ کے ممکنہ ذرائع پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر تمام معزز مہمانوں کا شال اوڑھا کر اور مومنٹو پیش کر کے استقبال بھی کیا گیا۔

■

Nayab Hasan
A/22, Seema Apt. Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-25

اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات

تنویر اختر رومانی

کسی بھی زبان کے سلسلے میں یہ جاننا کہ اس میں کتنے الفاظ ہیں، کن کن زبانوں کے ہیں، وہ کس طرح درآمد ہوئے، ان کی وجہ تسمیہ کیا ہے اور ان کی اب کیا ساخت ہے؟ جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی ضروری بھی۔ اردو کے لیے تو اور بھی دلچسپ ہوگا کہ یہ کئی ایک بولیوں اور زبانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی تھی اور جیسے جیسے یہ زبان ترقی کرتی گئی ویسے ویسے اور بھی بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے۔

فیاض گوالیاروی کی تحقیق (مطبوعہ ہفتہ وار 'ہماری زبان' دہلی، یکم اگست 1975) کے مطابق اردو میں چون ہزار (54000) الفاظ ہیں، جن میں

زبان یا بولی	فیصد	الفاظ کی تعداد
بولی (یعنی کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، بھوجپوری وغیرہ)	72 فیصد	39000
عربی	14 فیصد	7600
فارسی	12 فیصد	6400
سنسکرت	1.5 فیصد	800
غیر ملکی زبانیں (انگریزی، فرانسیسی، ترکی، پرتگالی، لاطینی وغیرہ)	0.5	200

ایک دوسری تحقیق کی رو سے اردو لغت میں پچپن ہزار نو سو ساٹھ (55960) الفاظ ہیں۔ ان دونوں تحقیقات کے مطابق تعداد میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف ہونا ایک فطری امر ہے، کیونکہ ایک زندہ زبان ہمیشہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ اردو بھی چونکہ ایک زندہ زبان ہے اس لیے اس میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ شاہجہاں کے دور میں جو اردو وجود میں آئی تھی، اس سے آج کی اردو یقیناً بہت مختلف ہے۔ قدیم شعرا اور نثر نگاروں کے فن پارے اس بات کے بین ثبوت ہیں۔ اور آج جن زبانوں کے الفاظ اردو میں مستعمل ہیں، اس وقت اتنی زبانوں کے الفاظ نہیں تھے، جب یہ وجود میں آئی تھی۔ اس وقت صرف تین زبانوں اور مقامی بولیوں (Dialects) کے ہی الفاظ تھے۔ زبانوں میں عربی، فارسی، سنسکرت۔ اور بولیوں میں کھڑی بولی، برج بھاشا، پالی، اودھی، بھوجپوری وغیرہ۔ لیکن آج اگر اردو میں مستعمل الفاظ کی بنظر غائر تحقیق کی جائے تو انگریزی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، یونانی، لاطینی حتیٰ کہ چینی، جاپانی، سریانی اور ملائی الفاظ بھی ملیں گے۔

بہر حال فی زمانہ اردو میں جتنے بھی الفاظ ہوں، لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ الفاظ کی تعداد کی ترتیب وہی ہے جو فیاض گوالیاروی نے پیش کی ہے۔ یعنی سب سے زیادہ الفاظ یہاں کی بولیوں کے ہیں اس کے بعد ہی عربی، فارسی، ترکی، انگریزی وغیرہ کے۔ سہولت کے لیے ترتیب وار ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

بولیاں، عربی اور فارسی:

زبان اور تہذیب کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ تہذیب کے اثرات نہ صرف معاشرتِ انسانی پر پڑتے ہیں، بلکہ زبان پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جس وقت اردو کی باقاعدہ بنیاد پڑی، اس وقت ہندوستان کے مختلف خطوں میں کئی ایک بولیاں رائج تھیں۔ لیکن سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی۔ بولیاں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کا شمار کرنا اور مثالیں دینا ممکن نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس وقت کی بولیوں کے الفاظ بدلتے بدلتے ایسے مسخ ہوگئے ہیں کہ ان کا پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ الفاظ آخر کس بولی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولوی سمیع اللہ بھاگل پوری اپنے ایک مضمون 'عربی، امّ الالسنہ' (مطبوعہ رسالہ 'جامعہ'، نئی دہلی، مارچ 1973) میں لکھتے ہیں:

''اردو کہ اس کی اصل پالی زبان ہے مگر اردو اور پالی کا خاندانی رشتہ کچھ اس طرح ٹوٹ گیا کہ ایک تاریخی رشتے کے علاوہ ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں۔ آج اردو والوں کے لیے پالی کا سمجھنا اور بولنا ناممکن ہے جب تک وہ اس کی باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کرلیں۔''

لیکن فارسی چونکہ ایک فاتح زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور یہاں ایک زمانے سے رائج تھی نیز اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ گفتگو میں فارسی کا استعمال باعثِ وقار سمجھا جاتا تھا۔ واضح ہو کہ فارسی یہاں کی حکمراں زبان تھی اس لیے وہ اپنے اثرات اردو پر مرتسم کرتی گئی۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو نے فارسی کی ہی رسم الخط کو اپنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی زبان کے الفاظ تحریری شکل میں اپنے رسم الخط میں ہی کامیابی کے ساتھ ادا ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ فارسی کے سیکڑوں الفاظ اردو میں شامل ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر اشیا کے نام بھی، جن کا بدل یہاں کی بولیوں میں نہیں تھا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ فارسی کے اتنے گہرے اثرات کے باوجود اردو میں فارسی کی بہ نسبت عربی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں:

(1) ہندوستان اور عرب کے معاشرتی، تہذیبی اور تجارتی تعلقات زمانۂ قدیم سے ہیں۔ اس وقت سے جب یہاں صرف آریوں کی حکومت تھی۔

(2) خود فارسی اور ترکی پر عربی زبان کی گہری چھاپ ہے۔ کیونکہ جس طرح اردو کے لیے فارسی فاتح زبان تھی اسی طرح فارسی اور ترکی کے لیے عربی۔ فارسی اور ترکی میں سیکڑوں الفاظ عربی کے مستعمل ہیں۔

(3) مغلیہ دور میں بھی عرب والوں سے ہندوستان کے تعلقات تھے۔ عرب والے یہاں فاتح اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ

یہاں سے ان کے تعلقات معاشرتی، تجارتی، مذہبی اعتبار سے گہرے ہوتے چلے گئے۔

چنانچہ اظہارِ خیال اور جذبات کی ترجمانی کے لیے عربی اور فارسی کے جو الفاظ آئے تو وہ آئے ہی، ان کے علاوہ ان چیزوں کے نام بھی جو عرب اور فارس سے یہاں آئیں۔ مثلاً:

پہننے اوڑھنے کی چیزیں (لباس وغیرہ):

لبادہ، کرتہ، پاجامہ، شال، دوشالہ، تکیہ، پوستین، کمخواب وغیرہ۔ (فارسی سے)

نقاب، فرغل، قبا، ازار، عمامہ، برقع، اطلس وغیرہ۔ (عربی سے)

کھانے پینے کی چیزیں:

چپاتی، شیرمال، پلاؤ، زردہ، پودینہ، نمک، تنجن، فرنی، فالودہ، گلاب، کوفتہ، چربی، بید مشک وغیرہ۔ (فارسی سے)

قہوہ، باقرخوانی، مزعفر، قلیہ، یاقوتی، حریرہ، لوز، مربّی، مثنّی، حلوہ، شہد، وغیرہ۔ (عربی سے)

استعمال میں آنے والی دیگر چیزیں:

رکابی، تشتری، شیشہ، کاسہ، فانوس، گل گیر، کفگیر، چمچہ، سینی، کاغذ، کشتی، رفیدہ، مشک، مشکیزہ، میچہ، چلم، تفنگ، بندوق، صندل (ہوسکتا ہے یہ یونانی لفظ 'سنتلون' کا مفرس ہو)، استرہ، چراغ، پیالہ وغیرہ (فارسی سے)

حمام، طبق، صابن، شمع، حقہ، قلم، تنور، عطر، قند، مصری، وغیرہ۔ (عربی سے)

'آبِ حیات' میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''بہت سے عربی اور فارسی کے لفظ کثرتِ استعمال سے اس طرح جڑ پکڑ چکے ہیں کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے۔ مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہوجاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہوجاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مثلاً: دلال، فراش، مزدور، وکیل، جادو، مسخرہ، نصیحت، لحاف، توشک، چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، بلبل، طوطا، پَر، دوات، سیاہی، جلاب، رقعہ، عینک، صندوق، کرسی، تخت، لگام، رکاب، زین، نعل، عقیدہ، وفا، بادبان، تہمت، درّہ، پردہ، دالان، تہ خانہ، تنخواہ، تازہ، غلط، صحیح، رسد، کاریگر، ترازو وغیرہ''

فارسی اور ترکی کے توسط کے علاوہ عربی کے بہت الفاظ انگریزی کے توسط سے اردو میں آئے ہیں اور لسانی سفر میں ان الفاظ کی ہیئت اتنی بدل چکی ہے کہ مشکل ہی سے یقین آتا ہے کہ یہ الفاظ انگریزی کے نہیں ہیں۔ یہاں پر سمیع اللہ صاحب کا ایک اقتباس پیش کردوں تو بات اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔

''عربی کے الفاظ براہِ راست دوسری زبانوں میں داخل نہیں ہوئے، بلکہ وہ ایک زبان سے دوسری زبان اور دوسری سے تیسری زبان میں منتقل ہوتے چلے گئے ہیں۔ جیسے عربی کے ہزاروں الفاظ پہلے عربی سے فارسی میں، فارسی سے اردو میں.... اسی طرح یورپ میں سب سے پہلے عربی کے بہت سے الفاظ اسپینی زبان میں داخل ہوئے کیونکہ اسپین میں مسلمانوں کی ایک ترقی یافتہ حکومت موجود تھی۔ پھر اس زبان سے اٹلی کی زبان میں، اٹلی سے فرانس، فرانس سے انگلستان۔''

اب دیکھیے وہ الفاظ جو دراصل عربی کے ہیں لیکن انھیں ہم انگریزی کے الفاظ ہی سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اردو کی مستند لغات میں بھی ان الفاظ کے سامنے انگریزی ہی درج ہے۔

اردو املا	انگریزی متن	عربی الاصل
کیمسٹری	Chemistry	'الکیمیا' سے بنا ہے
ایڈمرل	Admiral	'امیر البحر' سے بنا ہے۔ یہ لفظ فرانسیسی میں گیا تو 'بحر' حذف ہوکر اور 'ڈ' کا اضافہ کرکے ایڈمرل بنا لیا گیا۔ وہاں سے انگریزی میں پھر اردو میں آیا۔
ریم	Ream	'رزمۃ' سے بنا ہے۔ (کاغذ کی ایک مخصوص مقدار)
کافی	Coffee	'قہوۃ' سے بنا ہے۔ عربی سے یہ لفظ ترکی میں گیا تو 'کہوۃ' ہوگیا۔ وہاں سے انگریزی میں آیا تو 'کوفی' ہوگیا۔
جار	Jar	'جرۃ' سے بنا ہے۔ عربی سے اسپینی میں گیا تو 'جرا' بن گیا۔ اسپینی سے فرانسیسی میں گیا تو 'جیر' ہوگیا۔ فرانسیسی سے انگریزی میں آیا تو جار ہوگیا۔
میگزین	Magazine	'مخازن' (مخزن کی جمع) سے بنا ہے۔ عربی سے اطالوی میں گیا تو 'مگازینو' ہوا، وہاں سے فرانسیسی میں گیا تو 'میگاسن' بنا، وہاں سے انگریزی میں آیا تو 'میگزین' ہوگیا۔
ماسک	Mask	'مسخ' سے بنا ہے، جس کا مطلب ہے بگاڑنا، خراب کرنا، بدلنا وغیرہ۔ ماسک لگا کر آدمی اپنی صورت بدل دیتا ہے۔
کوئنٹل	Quintal	'قنطار' سے کوئنٹل بن کر اسپینی میں گیا، اسپینی سے فرانسیسی میں، وہاں سے انگریزی اور پھر اردو میں آیا تو کوئنٹل ہی رہا۔
مانسون	Mansoon	عربی لفظ 'موسم' سے بنا ہے۔ ملائی زبان میں آیا تو 'مؤسم' بنا، وہاں سے پرتگالی میں گیا تو 'مونساؤ' بن گیا۔ وہاں سے جب انگریزی میں گیا تو 'مانسون' ہوگیا۔
سیرپ	Syrup	'شراب' (بمعنی مشروب) جب عربی سے فرانسیسی میں گیا تو 'سیراپ' ہوگیا۔ وہاں سے انگریزی میں آیا تو 'سیرپ' بن گیا۔

سنسکرت:

سنسکرت 'آریائی' زبان کی ایک شاخ ہے اور ہندوستان کی سب سے قدیم زبان ہے۔ یہ ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے اس کا تعلق ان بولیوں سے کسی نہ کسی صورت میں ضرور رہا تھا جو اردو کی بنیاد بنی ہیں۔ چنانچہ اردو میں سنسکرت کے بھی کافی الفاظ داخل ہوگئے۔ کچھ تو بلا واسطہ اور کچھ بالواسطہ۔ سنسکرت کے جو الفاظ اردو میں مستعمل ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

آتما، امرت، اجیرن، آشرم، اشلوک، آشیرواد، تال، یگ، پرچار، پرجا، پران، پربت، پاچن، اتیاچار، کلنک، اشنان، جوگی، چتا، ناٹک، ناستک، شانتی، دیوالی، پوجا، کپٹ، دھار، دیش، ساگر، سوامی، سیوا، کھرب، گرو، گرہست، مایا، لیلا، منتری، بیسوا وغیرہ۔

سنسکرت کے بہت سے الفاظ اردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور اتنے خوبصورت اور نفیس ہیں کہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ایسے نفیس الفاظ سنسکرت جیسی ثقیل زبان کے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ تو شاعری کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً:

آنچل، آنچ، اجالا، اداس، تالا، نالا، پرب، روپ، سنگم، گوری، آم، درپن، دانت، پَل، جال، جنتا، پاپ، کلی، دیوتا، دیوی، کنواری، دل، لگن، سنگھن، گنگا، رُت، رس، سماج، سورج، چندن، کنج، گوتم، گول، لوک، لیپ، نروان، نجی، مدھر، مکھیا، موتی، نت، نیتا، ہنسا، اپسرا، آدرش، چاند وغیرہ

سنسکرت کے بعض الفاظ براہِ راست اردو میں نہ آکر فارسی کے توسط سے آئے ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ سنسکرت اور فارسی، اردو اور ہندی کی طرح بہنیں ہیں۔ دونوں آریائی زبان کی شاخیں ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں ازمنۂ قدیم سے ہی تعلقات رہے ہیں۔ ایک ہزار قبل مسیح میں، ہندوستان سے چل کر جب

آریوں کے مختلف قبائل ایران کے مختلف خطوں میں سکونت پذیر ہوئے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی زبان بھی ساتھ لے گئے تھے۔ زمانے کے نشیب وفراز سے قدیم ایران میں وید زبان (جس کی ایک مضبوط شاخ سنسکرت ہے) کی کئی ایک شاخیں نکلیں جو ایران کے مختلف علاقوں میں مختلف قبائل کے تحت بولی جاتی تھیں، جن میں اوستا، فارسی باستان، مادی، پارتی، سغدی، ختنی، خوارزمی، پہلوی وغیرہ ہیں۔ آج کی فارسی قدیم پہلوی زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور پہلوی سنسکرت سے بہت مشابہ ہے۔ ڈاکٹر اودے نارائن نے اپنے ایک مضمون 'بھاشا' (مطبوعہ: ہندی ماہنامہ 'راشٹر دھرم'، لکھنؤ، نومبر 1981) میں چند الفاظ کی جانب اشارہ کیا ہے جو سنسکرت سے فارسی میں گئے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
روز	रोचः	ایزد	यजत्
اسپ	अश्वः	استان	स्थान
مادر	मातृ	پدر	पृत
دختر	दुहितृ	نماز	नमः
خدا	स्वधा	مہر	मित्र
پاک	पावक		

ان الفاظ کے علاوہ بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ہندوستان سے ایران گئے اور ایران سے پھر ہندوستان لوٹے۔ یعنی سنسکرت سے فارسی میں گئے اور فارسی سے اردو میں آئے۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
بارش	वर्षा	شطرنج	चतुरंग
ہشتم	अष्टम	ہفتہ	सप्ताह
سوگ	शोक	ماہ (مہینہ)	मास
برادر	भ्रातृ	دہ	दस
گندم	गोधुम	ہند	सिंध
گاؤ (گائے)	गउ		

دوسرے کالم (سنسکرت) کے الفاظ کو مولوی سمیع اللہ صاحب نے اپنے مضمون 'عربی ام الالسنہ' میں درج کیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے:

"تلفظ کا یہ اختلاف ایران اور بھارت کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اہل ایران بعض اوقات سنسکرت کے 'س' کو 'ہ' سے بدل دیتے ہیں..... چنانچہ ہند کی وجہ تسمیہ یہی بتائی جاتی ہے کہ ایرانی، جن کا عمل دخل کسی زمانے میں سندھ تک تھا، وہ سندھ کو اور اس کے آگے کی سرزمین کو ہند کہتے تھے۔ اس طرح فارسی میں یہ ملک ہندوستان اور عربی میں ہند کے نام سے مشہور ہو گیا۔"

بہرحال بالواسطہ یا بلا واسطہ اردو میں سنسکرت الفاظ کا ایک ذخیرہ ہے۔ اگر بغور جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ سنسکرت ہی دراصل اردو زبان کا سبب بنی ہے، جیسا کہ سمیع اللہ صاحب نے لکھا ہے:

".....جب ہم کسی زبان کو لے کر اس کی تاریخ، خاندان اور سلسلۂ نسب کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سبھوں کا شجرۂ نسب شاخ در شاخ کسی دوسری زبان سے مل جاتا ہے۔ مثلاً اردو کا شجرۂ نسب یہ ہوگا: اردو برج بھاشا سے، برج بھاشا پالی سے اور پالی سنسکرت سے پیدا ہوئی۔"

ترکی: اردو میں ان ہی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں جن سے اردو یا اہل اردو کا کسی نہ کسی طور پر تعلق رہا ہے۔ ہندوستان تو غیر ملکی قوموں، قبیلوں، مذاہب کا مسکن رہا ہے۔ ترک بھی ہندوستان میں ایک مدت تک قیام پذیر رہے اور ان کا واسطہ اردو (یہاں ہندوی یا ہندوستانی کہنا مناسب ہے کیونکہ 'اردو' نام تو خود ترکی زبان کا ہے) سے خوب پڑا۔ چنانچہ ترک اپنی تہذیب کے ساتھ اپنی زبان کے کئی الفاظ دے گئے، جن میں بعض کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ اور بہت سے الفاظ تہذیب کے زوال کے ساتھ یا تو متروک ہو چکے ہیں یا صرف لغات کی زینت بنے ہیں۔ اردو میں استعمال ہونے والے چند ترکی الفاظ یہ ہیں:

آپا، آغا، ایال (اصل لفظ یال)، آفندی، اتالیق، الا، ایلچی، باجی، باورچی، بَر (بابُر)، برادہ، بیگ، بیگم، تزک، تلاش، توپ، پاشا، چاق، چوبند، چاقو، چیچک، چپقلش، چقماق، چغا، چلمچی (چلچی، سلفچی)، چغل، خاتون، سراغ، ساہول (ساقول کا مخرب)، سوغات، طغرا، قاب، قالین، قزاق، قرولی، قچی، قاش، قاز، قدغن، قزلباش قینچی (کچی)، قنات، قرق (عام بول چال میں 'کڑکی' استعمال ہوتا ہے)، قلی، قورمہ، قیف (بول چال میں کپّی) کورنش، (کرنش)، لاش، مرغولہ، یورش، یلغار وغیرہ۔

جو الفاظ متروک ہو چکے ہیں یا نامانوس ہیں، ان کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

انگریزی: اہل فارس اور عرب کے بعد انگریز ہندوستان آئے، جنھوں نے دو سو برسوں تک اس ملک میں حکومت کی اور انگریزی یہاں کی حکمراں زبان تھی۔ جہاں اس نے اردو سے بہت سے الفاظ لیے وہیں اردو کو اس نے سیکڑوں الفاظ سے مالا مال بھی کیا۔ حاکم بہرحال محکوم پر غالب رہتا ہے۔ روایت کے مطابق انگریز بھی اپنے ساتھ بہت سی چیزیں لائے، جو اردو میں داخل ہو گئیں۔ مثلاً

کھانے پینے کے ضمن میں: آئس کریم، وٹامن، وہسکی، گلوکوز، کمپچر، مٹن چاپ، بسکٹ، کیک، رم، اراروٹ، راشن وغیرہ۔

پہننے اوڑھنے، لباس کے ضمن میں: نکٹائی، نیکلس، نیکر، وگ، کلپ، لاکٹ، کوٹ، پینٹ، گاؤن، مفلر، ہیٹ، کیپ، لیس، جمپر، شرٹ، جیکٹ وغیرہ۔

دیگر اشیائے ضروریہ: ٹک، کلاک، کمپاس گور، کولر، کیمرہ، سوٹ کیس، گریس، گیلن، لائٹر، ٹب، نوٹ بک، کاپی، پین، پنسل، البم، فوٹو، کار، سائیکل، ٹیلی فون وغیرہ

متفرقات: ہاکر، واوچر، مینو، نارمل، کرین، کلب، کنڈکٹر، کوارٹر، کوپن، کورٹ، کورس، کیمپ، کینواس، کارڈ، گارنٹی، گٹر، گیٹ، گیلری،، لاری، ٹرک، بس، لائسنس، لنٹر، لوفر، لیڈر، ممبر، مینیجر، میٹنگ، میچ، میک اپ، میمورنڈم، کمیٹی، لیبل، ٹکٹ، اکاؤنٹ، ہال، ٹن، ٹورنامنٹ، رف، مشین، فلم، ہوٹل، پکچر، ٹاکیز، بیکری، بینک، منی آرڈر، کارنس، ڈیوٹی، ڈیم، ریلوے جیسے سیکڑوں الفاظ۔

انگریزی سے جو الفاظ اردو میں درآمد ہوئے ہیں ان کی کئی ایک صورتیں ہیں۔

(1) بہت سے الفاظ اپنی شکل میں آئے اور ان کا مفہوم بھی وہی رہا، جو انگریزی میں ہے۔ مثال میں کئی الفاظ پیش کیے جا چکے ہیں۔

(2) بہت سے الفاظ ایسے آئے، جن کا مفہوم تو وہی رہا لیکن ان کی شکل (املا) قصداً تبدیل کر دی گئی۔ ایسے الفاظ کو مؤرّد (اردو کر لیا گیا) کہتے ہیں۔ مثلاً:

انگریزی	اردو	انگریزی	اردو
Mark (مارک)	مارکہ	Chop (چاپ)	چانپ
Cork (کارک)	کاگ	Classical (کلاسیکل)	کلاسیکی
Box (باکس)	بکس/بکسہ	Bottle (بوٹل)	بوتل
Officer (آفیسر)	افسر	Orderly (آرڈرلی)	اردلی
Romance (رومانس)	رومان	Pistol (پسٹل)	پستول
Commond (کمانڈ)	کمان	Pantloon (پینٹلون)	پتلون

Condemned (کنڈیمنڈ) کنڈم　Attache (اٹیچی) اتاشی

X-Ray (ایکس رے) عکس ریز

(یہ لفظ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی اختراع ہے۔انھوں نے X-Ray کا کتنا مناسب اور معنی خیز ترجمہ کیا ہے)

(3) انگریزی کے بعض الفاظ اردو میں ایسے آئے جو شروع میں تو اپنی شکل میں تھے مگر بعد میں ان کی ہیئت بدل گئی لیکن ان کا مفہوم نہیں بدلا۔ایسے الفاظ کو معرّب (بگڑا یا بگاڑا ہوا) کہتے ہیں۔مثلاً:

انگریزی	اردو	انگریزی	اردو
Towel (ٹاول)	تولیہ	Jacket (جیکٹ)	جاکٹ
Round (راؤنڈ)	رونڈ	Girder (گرڈر)	گاڈر
Coal (کول)	کوئلہ	Lord (لارڈ)	لاٹ (صاحب)
Recruit (ریکروٹ)	رنگروٹ	Report (رپورٹ)	رپٹ
Dozen (ڈزن)	درجن	Waist Coat (ویسٹ کوٹ)	واسکٹ

اول الذکر تین صورتوں کا اطلاق دوسری زبانوں پر بھی ہوتا ہے۔لیکن چونکہ موضوع انگریزی کا ہے اس لیے مثالیں اسی سے دی گئی ہیں۔

ہندوستانی زبانوں پر انگریزی نے بہت گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔انگریزی کے بعض الفاظ تو اردو میں اس طرح کھپ گئے ہیں کہ ان کا کوئی بدل اردو میں نہیں ملتا۔اگر ملتا بھی ہے تو انگریزی کے لفظ کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔انگریز یہاں سے چلے گئے لیکن انگریزی کا کچھ ایسا تاثر چھوڑ گئے کہ دن پر دن انگریزی الفاظ کا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔اب تو یہ حال ہے کہ انگریزی جاننے والے اردوداں حضرات اگر دس الفاظ پر مشتمل اردو کا ایک جملہ ادا کرتے ہیں تو اس میں ایک دو الفاظ انگریزی کے ضرور ہوتے ہیں۔

پرتگالی: اردو میں پرتگالی الفاظ کیونکر آئے، اس کے لیے میں رام بابو سکسینہ کی کتاب 'تاریخ ادب اردو' کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

''فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا۔البتہ ڈچ اور فرنچ کے جمائے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے ہیں یا ہیں بھی تو اس قدر دھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اردو لغات میں معتدبہ اضافہ کیا۔1540 میں ہندوستان کی مشہور بندرگاہوں پر اہلِ پرتگال قابض تھے اور ممالکِ مشرق میں گویا تجارت ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ان کی آبادیاں ہندوستان کے سواحل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں۔ان کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ بحیثیت تاجر و حاکم اور مبلغ کے یہاں رہتے تھے۔انھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ان کی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہوگئی تھی، جو محض ہندوستانیوں اور اہلِ یورپ کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی، بلکہ خود یورپ کے یہ سوداگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔اس میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے۔چنانچہ اسی وجہ سے اس کو بہت سے ایسے مواقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں میں ڈال سکی۔''

اب دیکھیے وہ چند الفاظ جو پرتگالی سے اردو میں آئے ہیں:

اناس، اچار، آیا، آلپین، الماری (الماریو)، بالٹی، بمبا (ملائی زبان میں بامبو۔یہی لفظ جب ملائی سے انگریزی میں گیا بمبو ہوگیا۔لیکن یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ یہ لفظ پرتگالی سے ملائی میں گیا یا ملائی سے پرتگالی میں آیا۔لیکن اردو میں پرتگالی سے ہی آیا ہے)، پادری، پپیا (پپا)، پگار (پاگر، بمعنی تنخواہ) پاؤروٹی، چھاپہ، ساگو، کاجو، کاج، انگریز، گرجا، سایا (لہنگا، گھاگھرا، پیٹی کوٹ)، کمرہ، مستول، مستری، سنترہ (سنگترہ)، نیلام وغیرہ

دیگر زبانیں: یونانی، لاطینی، عبرانی، سریانی، جاپانی، اسپینی، چینی، فرانسیسی، جرمنی، روسی، ڈچ، اطالوی اور ملائی زبانوں کے الفاظ بہت محدود ہیں۔اور ان میں سے بھی تھوڑے ہی الفاظ براہ راست اردو میں آئے ہیں ورنہ انگریزی یا عربی کے توسط سے آئے ہیں۔بہر حال ان زبانوں کے الفاظ خواہ جس طرح اردو میں آئے ہوں، لیکن ان کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔اپنی تحقیق کے دوران ان زبانوں کے جو الفاظ دریافت ہوئے ہیں انھیں پیش کر رہا ہوں۔(ایک اہم بات یہ کہ ان میں زیادہ تر اسم ہیں)

یونانی: ارسطو (ارسطوطیلیس)، افلاطون (فلاطون)، اپولو، ارغنون، اقلیدس، اکادمی (اکادیمیا)، بقراط، ڈرامہ، جغرافیہ (جیوگرافیا)، فلسفہ (فیلسوف)، قلوپطرہ، کلیسا، کارتوس (کارتیس)، مقناطیس، بوطیقا، (Poetica کا معرّب)، اٹلس، یوکلپٹس وغیرہ۔

لاطینی: ایجنڈا، لاٹین (لنٹرنا)، سرکس، لوڈو، کیمرہ، کیمپس، قیصر (روم کے Caesar کا معرّب)، موٹر، پطرس، گلوب (گلوبس)، لائبریری (لائبریریم)، میوزیم، کانگریس، وینس، کپ (کوپا)، کانفرنس، منسٹر، بونس، ایگو، ڈائری (ڈائریم) وغیرہ

عبرانی: آصف، یہووا (اسی لفظ سے یہودی بنا ہے)، یوحنا، یعقوب، یونس، یوسف، ہارون (ایرون)، داؤد، زکریا، مریم، سبا، شیبا، ابراہیم، اسرافیل، جبرئیل، میکائیل، جوبلی (یوبیل)، مسیح، اسرائیل وغیرہ

فرانسیسی: میم یا مادام، شمیز، کیفے، کارٹون، پکنک، اسٹوو، فرنیچر، چمنی، بٹن، سگنل، کپتان، اسپتال، لیگ، کیبن، پالیامنٹ، کیبینیٹ، سیلون، برژوائی وغیرہ

اسپینی: چاکلیٹ، تمباکو (تباکو)، سگار (سگارو)، سگریٹ وغیرہ

چینی: چا (چائے)، پیچی، مغل (منگول کا معرّب۔چونکہ عربی میں گ نہیں ہوتا اس لیے اسے غ سے بدل کر مغل کر دیا گیا)، طوفان (تائے فنگ، دونوں اجزا کو جھٹکے دے کر پڑھیں۔تائے فنگ چین کے سمندر سے بہنے والی ہوا کو کہتے ہیں۔یہ لفظ اپنی صوتی ثقالت کی بنا پر عربی میں طوفان ہوگیا اور وہاں سے فارسی اور اردو میں طوفان بن کر آیا)

جرمنی: گولڈ (بمعنی سونا)، سلور (سلبر)، اسٹاف (اشٹاب)، اسٹول، اسمگلنگ (اسمگلین سے بنا ہے)، ٹرسٹ وغیرہ

اطالوی: لاٹری (لاٹریا، یہ جرمنی کے لفظ 'لاٹ' سے بنا ہے)، راکٹ، (راکیٹیا)، سانیٹ (سونیٹو) وغیرہ

ڈچ: اسٹیمر (اسٹوم بمعنی بھاپ سے بنا ہے)، گاڈ (بمعنی خدا)، بوٹ (کشتی)، مارٹ، مارکیٹ وغیرہ

جاپانی: رکشا (جو دراصل جن رکی شا تھا)، جوڈو، کراٹا وغیرہ

روسی: زار، زارینہ وغیرہ

ملائی: گودام (گڈانگ)، کرچ (کرس) وغیرہ

اب تو رفتہ رفتہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں در آئے ہیں۔

اس مختصر سی تحقیق کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو الفاظ کا ذخیرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔اردو الفاظ کی موجودہ تعداد سے آنے والے کل کی تعداد یقیناً زیادہ ہوگی۔

نوٹ: عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کی جو فہرست میں نے پیش کی ہے اسے مکمل نہ سمجھا جائے۔ممکن ہے اور بھی الفاظ ہوں جو میری تحقیق کی زد میں نہ آسکے۔

■

Tanweer Akhtar Roomani
59, Chuna Shah Colony ,P.O.: Maango, Jamshedpur-831012 (Jharkhand)
Contact No. : 07004384853 E-mail: turoomani@gmail.com

نقد و نگاہ

نسیم احمد نسیم

علامہ شوق نیموی کی غزل گوئی

سرزمین بہار زمانۂ قدیم سے باکمال اور نابغۂ روزگار شخصیات کا مرکز رہی ہے۔ اس سرزمین نے ہر عہد میں ان گنت علما، فضلا اور علوم وفنون کے گوہر نایاب پیدا کیے لیکن صد حیف کہ ہم میں سے اکثر ان کے مابہ الامتیاز کارناموں سے ناواقف ہیں۔ آج ایک عام چلن رائج ہے کہ جامعات کے تحقیقی مقالوں کو ہدف ملامت بنایا جائے اور معیار تحقیق کو زوال پذیر قرار دے دیا جائے لیکن سچ یہ ہے کہ آج انہی جامعات کے ذریعے گمشدہ اور گمنام ادبا، شعرا، علما اور دانش وران کو منظر عام پر لانے کا کام ہو رہا ہے۔ ورنہ اس خودنمائی اور خود تشہیری کے ماحول میں متقدمین، متوسلین اور دوسرے اہالیان علم وفضل کو کون خاطر میں لاتا ہے۔

علامہ شوق نیموی کا شمار ایسے ہی مشاہیر میں ہوتا ہے۔ وہ ایک معروف عالم دین تھے اور علم حدیث میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی مذہبی اور ادبی خدمات کو ان کے عہد میں کھلے دل سے سراہا گیا۔ لیکن آگے چل کر رفتہ رفتہ انھیں فراموش کر دیا گیا۔ اردو دنیا احسان مند ہے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی صاحب کی کہ انھوں نے بہت ہی عرق ریزی اور جگر کاوی کے ساتھ تحقیق کر کے علامہ کے حالات زندگی اور ان کی متنوع اور منفرد علمی، دینی اور ادبی خدمات کو منصۂ شہود پر لانے کی پہل کی۔ علامہ کی حیات و خدمات پر ان کی دو کتابیں اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ قاسمی صاحب نے علامہ کی شاعری اور ان کی زبان دانی کے متعلق لکھا ہے کہ:

"......وہ اردو زبان کے مستند شاعر اور محقق و زبان داں تھے۔ ان کی شعری خوبیوں کو داغ دہلوی، تسلیم لکھنوی، حسرت عظیم آبادی اور احسن مارہروی جیسے نامور شعرا نے سراہا اور مولانا ابوالکلام آزاد اور ضیا عظیم آبادی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کی شاگردی پر فخر کیا۔ اس کے علاوہ زبان دانی کے میدان میں جلال لکھنوی جیسے اہم شاعر کو شکست فاش دی اور 'جگنو و چگن' اور 'چھان بین' کی تحقیق میں دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے اپنی زبان دانی کا لوہا منوایا۔"

(علامہ شوق نیموی حیات و خدمات، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی۔ جتھیائے گفتنی، مطبع مجلس علمی پٹنہ 1987، ص:90)

واضح ہو کہ علامہ کو شاعری کی مختلف اصناف پر قدرت حاصل تھی اس لیے انھوں نے جس صنف میں کہا، خوب کہا۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو پر یکساں عبور حاصل تھا اس لیے ان کی شاعری میں لسانی سطح پر رنگارنگی اور بوقلمونی کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یوں تو انھوں نے حمد و نعت، مناقب و مثنوی اور قطعات و رباعیات بھی تخلیق کی لیکن ان کی غزلیہ شاعری کی شان ہی نرالی ہے۔ میری دانست میں ان کے جوہر غزل میں ہی کھل کر پورے طور پر سامنے آتے ہیں۔ علامہ کی غزلوں کے غائر مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی خاص ادبی اسکول یا ادبی رجحان کے قائل نہیں تھے بلکہ انھوں نے ہر اسکول کی خصوصیات پر نظر رکھی۔ ان کے یہاں قدماء کا رنگ تغزل ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر مقام پر ان کی فنی مہارت اساتذہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں ظریفانہ رنگ بھی جھلملاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس قبیل کے اشعار ہمیں غالب کی یاد دلاتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ کریں۔

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا
ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا
دامن کبھی جھٹکے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ
اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

مجھے بھی عشق کا دعویٰ ہے اور غیر کو بھی
جو آپ چاہتے ہیں امتحان بہت اچھا
کلام شوق وہ سن کر پھڑک کے بول اٹھے
زباں ہے بہت اچھی، بیان بہت اچھا

کبھی کہیں کی، کبھی کی، یہاں وہاں کی بات
نکالی حضرتِ ناصح نے بھی کہاں کی بات
جو فکر کرتی ہے میری بلندی پروازی
تو شوق جوش میں کہتی ہے لامکاں کی بات

خزاں نے باغ لوٹا، پھول توڑے، دستِ گلچیں نے
پریشاں بوئے گل ہے بلبلوں کے گھر اجڑتے ہیں
کسی شمشادِ گلزارِ سخن کا پڑ گیا سایہ
کہ آج اے شوق اپنی نظمِ موزوں پر اکڑتے ہیں

پروانے سے یہ کہتی ہے رو رو کے شمع آج
سوزِ دروں نے پھونک دیا سر سے پاؤں تک

علامہ کی غزلوں کے غائر مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی خاص ادبی اسکول یا ادبی رجحان کے قائل نہیں تھے بلکہ انہوں نے ہر اسکول کی خصوصیات پر نظر رکھی۔ ان کے یہاں قدماء کا رنگ تغزل ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر مقام پر ان کی فنی مہارت اساتذہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں ظریفانہ رنگ بھی جھلملاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

علامہ ایک بہت ہی خوش گو اور پُرگو شاعر ہیں۔ زبان شستہ اور شگفتہ، زبان دانی کا کمال اور استادانہ رنگ و آہنگ کا جمال ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس اختصاص کے ساتھ کہ کہیں سلاست اور شعریت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ علامہ کے یہاں بھی ان کے عہد کا شعری مزاج اور مستعمل موضوعات ملتے ہیں، ان کے یہاں بھی معشوق کی ستم گری اور عشوہ طرازی کا گلہ شکوہ ہے، لیکن اس قبیل کے اشعار کے بین السطور میں وہ اشارے اور کنایے بھی موجود ہیں جو ہمیں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔

روشن اسی سے ہے کہ ہمارا چراغ دل
اے شوق ہے جو نور خدا سر سے پاؤں تک

حیرت زدہ ہیں اہل نظر بولتے نہیں
سب کچھ یہ دیکھتے ہیں مگر بولتے نہیں
پائیں گے کیا عدو مرا رنگ کلام شوق
زاغ و زغن ہزار کا گھر بولتے نہیں

یہ اشعار ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی صاحب کے مونوگراف (مطبع بہار اردو اکادمی) سے ماخوذ ہیں۔ مونوگراف میں شامل 55 غزلیں، دیوان شوق مطبوعہ مطبع سیدی، پٹنہ سے ڈاکٹر صاحب نے نقل کیے ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ ایک بہت ہی خوش گو اور پُرگو شاعر ہیں۔ زبان شستہ اور شگفتہ، زبان دانی کا کمال اور استادانہ رنگ و آہنگ کا جمال ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس اختصاص کے ساتھ کہ کہیں سلاست اور شعریت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ علامہ کے یہاں بھی ان کے عہد کا شعری مزاج اور مستعمل موضوعات ملتے ہیں، ان کے یہاں بھی معشوق کی ستم گری اور عشوہ طرازی کا گلہ شکوہ ہے، لیکن اس قبیل کے اشعار کے بین السطور میں وہ اشارے اور کنایے بھی موجود ہیں جو ہمیں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا اشعار میں بھی عشق کے روایتی احوال و کوائف بہ کثرت موجود ہیں لیکن اوروں کے عشق اور علامہ کے عشق میں ایک فرق یہ ہے کہ وہ محبوب کے آگے کلی طور پر سپردگی کے قائل نہیں۔ وہ معشوق کو اپنی اہمیت اور مرتبے کا احساس بھی کرانا چاہتے ہیں۔ وہ رقیب کو روسیاہ اور فریبی نہیں کہتے بلکہ اس کے روبرو ہو کر مرحلہ شوق کو سر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ معشوق سے صرف دل لگی نہیں کرتے بلکہ اٹھکھیلیاں بھی کرنا جانتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

عاشق ہوں مگر کام ہے معشوق فریبی
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

علامہ کے یہاں غالب کا یہ رنگ اور یہ رویہ اکثر مقام پر دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

اردو شاعری میں ناصحین اور واعظین شعرا کے خاص اہداف رہے ہیں۔ علامہ نے بھی ان کی خبر لی ہے اور ان کی ناصحانہ باتوں کو لایعنی اور غیر ضروری قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی فکری پرواز کا اظہار کرتے ہوئے اسے مکاں ہی نہیں لامکاں تک رسائی کا موجب تصور کرتے ہیں۔ شمع جلتی ہے اور پروانے اس پر اپنی جان چھڑکتے ہیں لیکن شمع کے سوز دروں کو کون محسوس کرتا ہے۔ شاعر کے یہاں علامتی پیرائے میں اس درد و کرب کو اجاگر کیا گیا ہے جو ہر دور کے اصحاب شوق کا مقدر رہے ہیں۔ اس غزل کے دوسرے شعر میں شاعر نے قدرت خداوندی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی ہستی اور اس کی شادمانی و کامرانی کو خدا کے نور کا طفیل بتایا ہے۔ اور آگے کے دونوں اشعار ہر عہد کا پرتو نظر آتے ہیں۔ شکست و ریخت اور انتشار سے اکثر زمانوں کو گزرنا پڑا ہے۔ لیکن ان ناموافق حالات میں بھی شاعر حزن و یاس کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے اور اپنے حالات و کیفیات کو بہ طریق احسن فخریہ طور پر موزوں کرنے پر قادر نظر آتا ہے۔ شاعر آگے چل کر حد درجہ بڑھتی ہوئی مصلحت پسندی پر گہرا طنز کرتا ہے۔ اس کے مطابق ہر طرح کے ظلم و ستم اور ناانصافی دیکھتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کرنا سراسر ظلم کی حمایت ہے، اس لیے انسان اور انسانیت کے تحفظ اور بقا کے لیے اس رویے سے فوری نجات لازمی ہے۔ اخیر میں چند اشعار اور دیکھیں۔

جو تم کو جانتے ہیں اور بھی ہیں مشکل میں
یقین والوں سے بہتر گمان والے ہیں

کسی غریب کی فریاد کو وہ خاک سنیں
بلند قدر ہیں، اونچے مکان والے ہیں

زمانے نے دگرگوں کر دیا یاروں کی مجلس کو
پریشاں آج اپنے حال میں ہے دیکھیے جس کو

وہی اشعار جن میں لطف کچھ رہتا ہے، رکھتے ہیں
غزل میں شوق ہم بھرتے نہیں رطب و یابس کو

ملا یہ نسخۂ نایاب حال کیمیا گر سے
رہا مفلس جسے ہے حرص دامن گیر چاندی کی

مرا لوہا عدوئے سنگ دل نے جان سے مانا
جو دیکھی دیدۂ انصاف سے تحریر لوہے کی

ہوا جب جل کے سرمہ، بڑھ گئی توقیر پتھر کی
کیا چشم بتاں میں گھر، زہے تقدیر پتھر کی
نہایت کاوش دل سے جو میں نے یہ غزل لکھی
زمین شعر میں اے شوق کی، تعمیر پتھر کی

غور طلب ہے کہ یہ اشعار معاملات عشق اور احوال معشوق سے بالکل الگ ہمارے معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ابتدا کے تین اشعار میں جہاں نام نہاد دانش مندوں پر طنز و استہزا کے تیر چھوڑے گئے ہیں، وہیں کم علم اور سادہ لوح لوگوں کی سادگی اور معصومیت کو ستائش کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں اپنے گرد و پیش میں رہنے والے ان اشخاص کو طعن و تشنیع کا ہدف بنایا گیا ہے جو اعلیٰ مقام و منصب والے تو ہیں لیکن ان کی سوچ اعلیٰ نہیں، ان کا ذہن و قلب وسیع اور فراخ نہیں۔ اس لیے شاعر کے مطابق ان کے آگے فریاد لے کے جانا عبث ہے۔

علامہ کے اشعار کے اس مختصر انتخاب کے اخیر میں چاندی، لوہا اور پتھر کو بطور ردیف استعمال کر کے علامتی طور پر اپنی ذات اور کائنات کی تفہیم کی بہت ہی فنکارانہ اور استادانہ کوشش کی گئی ہے۔ یہاں شاعر نے چاندی، لوہے اور پتھر کو مختلف معانی اور مختلف کوائف میں پیش کر کے جہاں ایک طرف خدا کی قدرت اور اس کی وحدانیت کو تسلیم کیا ہے وہیں اس کے ذریعے اپنے ماضی اور حال کی عقدہ کشائی کا کام بھی لیا ہے۔

مختصر یہ کہ علامہ شوق نیموی جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مختلف علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ اپنے عہد کی اہم ترین علمی، ادبی اور دینی شخصیت تھے۔ ہم عصر مشاہیر نے ان کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن آگے چل کر رفتہ رفتہ ہم نے انھیں بھی اپنے دوسرے مشاہیر اور اسلاف کی طرح فراموش کر دیا اور ان کے کارنامے چند ایسی کتابوں میں دبے رہ گئے جو عام قارئین اور طلباء کے ہاتھ اکثر نہیں لگ پاتیں۔

■

Naseem Ahmad
Near Mirshikari Toli Masjid Kali Bagh
Bettiah. 845438
Mob. 7011548240

س ش عالم

یگانہ چنگیزی

جدید غزل کا ایک بنیاد گزار

اردو کے تنک مزاج، انا پرست، ضدی، سخت گیر، شعلہ خو اور باغیانہ تیور رکھنے والے شعرا کی فہرست تیار کی جائے تو یگانہ چنگیزی کا نام یقیناً سرفہرست رکھا جائے گا۔ زندگی بھر اپنی ذات اور سماج سے الجھنے والا یہ شاعر کبھی مذہبی حوالے سے جھنجھلاہٹ آمیز اظہار پر معتوب ہوا، کبھی انانیت کی حد تک دراز 'خود شناسی' کے سبب طنز و تضحیک کا شکار بنا، کبھی بے وجہ شعرائے متقدمین کی کھال کھینچنے پر لوگوں سے جھگڑتا رہا، کبھی فکر و فن میں یکتائی کے دعوے نے کسی سے ذہن ملنے نہیں دیا اور کبھی کشمکش حیات سے ایسا نبرد آزما ہوا کہ خود میں ہی الجھ کر رہ گیا ..... غرض متضاد و متنازعہ کیفیات و واقعات کا عمر بھر شکار رہنے والا یہ شاعر اردو زبان و ادب میں اپنی انفرادیت کے ایسے نقوش چھوڑ ہی گیا کہ ناقدینِ ادب کو کم از کم یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑا کہ یگانہ واقعی یکتا و یگانہ تھا۔

مرزا فضل علی بیگ المعروف واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی اردو ادب کا ایک معروف اور بڑا نام ہے۔ ان کی پیدائش 27 ذی الحج 1301 ہجری مطابق 17 اکتوبر 1884 میں پٹنہ کے محلہ مغلپورہ میں ہوئی۔ بعض اہل قلم نے ان کا سنہ پیدائش 1883 بتایا ہے جو غلط ہے۔ ان کے والد مرزا پیارے کا تعلق ایک ایسے جاگیردار خاندان سے تھا جو عرصۂ دراز سے عظیم آباد میں مفتخر و معتبر رہا تھا لیکن مرزا پیارے تک آتے آتے جاگیرداری کا سورج افلاس کی ظلمت میں گم ہو چکا تھا، البتہ روایات اور اقدار باقی تھیں، تعلیم کا رواج اور ادب دوستی مزاج کا حصہ تھی اسی لیے یگانہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی، غیر معمولی ذہانت کے سبب انھوں نے تعلیمی مراحل نمایاں کامیابی کے ساتھ طے کیے، 1903 میں محمڈن اینگلو عربک اسکول عظیم آباد سے انٹرنس پاس کیا۔ 1904 میں کلکتہ پہنچے۔ یہاں وہ نواب واجد علی شاہ کے فرزند محمد مقیم کے پسران محمد یعقوب علی مرزا اور محمد یوسف علی مرزا کی انگریزی تعلیم کے استاد مقرر ہوئے لیکن کلکتہ کا ماحول اور آب و ہوا راس نہ آنے کے سبب جلد ہی طبیعت اوب گئی اور پٹنہ واپس آ گئے، 1905 میں علاج کی غرض سے لکھنؤ کا سفر کیا اور سرزمین لکھنؤ نے ایسے قدم جکڑے کہ تا عمر لکھنؤ کے ہی اسیر رہے۔ 1913 میں لکھنؤ کے نامور حکیم مرزا محمد شفیع کی دختر کنیز حسین سے شادی ہوئی۔ لکھنؤ میں اودھ اخبار کے کچھ عرصہ مدیر بھی رہے لیکن چپقلشوں میں الجھے رہنے کے سبب ذہنی انتشار، افسردگی اور بے روزگاری نے کبھی اٹاوہ کے کسی اسکول میں مدرسی کے فرائض انجام دینے پر مجبور کیا، کبھی ریلوے میں ملازمت کرنا پڑی اور کبھی حالات سے تنگ آ کر لاہور، علی گڑھ اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ لاہور میں ان کا قیام کافی عرصہ رہا اور وہاں انھوں نے کافی شہرت حاصل کی نیز تمام اہم رسائل و اخبارات میں ان کا کلام بھی شائع ہوتا رہا۔ اکثر علامہ اقبال سے بھی ملاقاتیں کرتے تھے (یہ 1926 کے لگ بھگ کی بات ہے، بعد کے دور میں یگانہ علامہ اقبال کے بھی مخالف ہو گئے تھے۔ 1933 میں وہ عثمان آباد میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے، پھر لاتور چلے آئے، 1938 میں سیلو میں رہے اور 1941 میں وہ یادگیر میں مقیم تھے۔ چونکہ زمانہ سازی اور مصلحت اندیشی سے یکسر ناواقف تھے اس لیے کسی جگہ یگانہ کی نہ بن سکی، مختصر سی مالی آسودگی کے بعد بار بار تنگ حال اور بے روزگار ہو کر پھر انجامِ کار لکھنؤ لوٹ آتے تھے اور یہاں وہی معاصرانہ چشمکوں میں الجھ جاتے، ویسے حقیقت یہ بھی ہے کہ لکھنؤ سے باہر رہ کر بھی وہ اہالیان لکھنؤ سے سوال و جواب کا سلسلہ نثر و نظم میں جاری ضرور رکھتے تھے۔ اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری زندگی کچھ ایسے تلخ و ناگوار واقعات کے سلسلۂ لامتناہی میں جکڑی ہوئی ہے اور ایسی بے سروسامانی، تنگ دستی، پراگندہ دلی و مکروہات گوناگوں اور صعوبات روز افزوں کا سامنا رہتا ہے کہ جمعیتِ خاطر کی امید بڑھتی (بندھتی) نہیں دکھائی دیتی ..... اطمینان و فراغ نہ پہلے حاصل تھا نہ اب میسر ہے۔'' (کلیات یگانہ، مرتب: مشفق خواجہ، ناشر فرید بکڈپو، دہلی 2005، عکسی لاہور ایڈیشن)

1942 میں حیدر آباد میں سب رجسٹرار کی ملازمت ختم ہونے کے بعد پندرہ روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی جس سے گزارہ بہت مشکل تھا اس لیے دوبارہ مزید مالی استحکام کے لیے حیدر آباد، بمبئی اور بھی دیگر شہروں کا رخ کیا لیکن کوئی قابلِ اطمینان صورت پیدا نہ ہو سکی جس سے مایوس ہو کر 1949 میں مستقل طور سے لکھنؤ آ گئے، اور یہیں انتہائی سخت حالات میں 2 فروری 1956 کو انتقال کیا۔ کچھ محققین نے تاریخ وفات 4 فروری بھی تحریر کی ہے البتہ کثرت سے 2 فروری پر ہی اتفاق نظر آتا ہے۔

تمام تکالیف اور سختیوں کے باوجود یگانہ کو لکھنؤ سے گویا عشق تھا، حالانکہ حالات تو یہ تھے کہ

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمیں سے دل لگایا تھا
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر

لیکن پھر بھی لکھنؤ سے روحانی وابستگی کا عالم یہ تھا

کششِ لکھنؤ ارے توبہ
پھر وہی ہم، وہی امین آباد

ابتدا میں شعرائے لکھنؤ کے ساتھ یگانہ کے تعلقات کافی خوشگوار رہے اور وہ اکثر ان کے ساتھ مختلف مشاعروں اور طرحی نشستوں میں شریک رہتے تھے لیکن اخلاص و محبت کی یہ فضا زیادہ دیر تک سازگار نہ رہ سکی اور معاصرانہ چشمکوں کا ایسا سلسلہ چل نکلا جو یگانہ کی آخری سانس تک جاری رہا۔ لکھنؤ میں اس وقت ایک سے ایک بڑا استادِ فن موجود تھا، لکھنؤ والے پہلے سے اس مرض میں مبتلا تھے کہ وہ اپنے علاوہ زبان و ادب کے حوالے سے کسی کو ذرا مشکل ہی سے مستند مانتے تھے، ادھر مرزا یاس انانیت کے پیکر اور فکر و فن کی انفرادیت کے مدعی ہو کر پہنچے، بس اہلِ لکھنؤ سے ٹھن گئی اور ایسی ٹھنی کہ یگانہ نے گویا جواب الجواب کے قصے کو ہی صبح و شام کا مشغلہ بنا لیا۔ خوب خوب معرکے گرم رہے، حد ہوئی کہ مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی کے 'مرزائی خون' نے ایسا جوش مارا کہ وہ تخلص تبدیل کر کے 'یگانہ چنگیزی' بن گئے، گویا کہ مخالفین کو مرعوب کرنے کے لیے 'چنگیزیت' کا سہارا تک لے لیا۔ البتہ یہ بھی ہوا کہ ان چپقلشوں اور معرکوں سے جہاں ایک طرف اہلِ فکر و نظر اور طالبانِ علم و ادب کو فائدہ ہوا وہیں یگانہ کی شاعری کا ایک منفرد رنگ بھی ابھر کر سامنے آ گیا۔ خود یگانہ کو بھی اس کا کسی قدر احساس ہو چلا تھا اور اسی لیے شاید انھوں نے کہا ہے

یگانہ وہی فاتحِ لکھنؤ ہیں
دلِ سنگ و آہن میں گھر کرنے والے

مخالفت یا معاصرانہ چشمک کا آغاز شعرائے لکھنؤ کے معمولی اعتراضات سے ہوا تھا لیکن پھر یہ معاملہ زمانہ بہ زمانہ طول پکڑتا ہی گیا۔ شعرائے لکھنؤ غالب کے مقلد تھے اس لیے یگانہ کو ان کی ضد میں غالب شکنی کا ایسا جنون سوار ہوا کہ انھوں نے ایک طرف تو 'نشترِ یاس' لکھی اور دوسری طرف خود کو آتش کا مقلد کہنے لگے۔ پھر 'چراغِ سخن' میں غالب اور معترفینِ غالب کی خوب خوب دھجیاں اڑائیں۔ انھوں نے ہاپوڑ کے رسالہ 'خیال' کے لیے 'آتش و غالب' کے عنوان سے غالب کے خلاف پہلا مضمون لکھا جو نومبر 1918 کے شمارے میں شائع ہوا اور پھر یہ سلسلہ گویا چل نکلا۔ بقول مشفق خواجہ:

''نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ کسی بھی موضوع پر لکھتے ،تان غالب پر ٹوٹتی۔ 1927 میں جب 'آیاتِ وجدانی' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں بھی جابجا غالب پر مشقِ ستم کی گئی تھی اور یہ مشق اس حد تک بڑھی کہ انھوں نے اپنے ہمزاد مرزا مراد بیگ شیرازی کی زبان سے یہ اعلان کر دیا ''اب دیوانِ غالب میزانِ انصاف وخرد میں کلامِ یاس کے برابر نہیں تل سکتا'' ...... اس سلسلے کی انتہا وہ رسالہ تھا جو ''غالب شکن'' کے نام سے پہلی مرتبہ 1934 میں اور اضافوں کے ساتھ دوسری مرتبہ 1935 میں شائع ہوا۔''

(کلیاتِ یگانہ، مرتبہ: مشفق خواجہ ایضاً)

یگانہ نے محض اہلِ لکھنؤ کو نیچا دکھانے کے لیے عرصے تک غالب کی مخالفت کا علَم بلند کیے رکھا، اس سے بہر حال غالب اور غالب پرستوں کا تو کوئی نقصان نہ ہوا البتہ خود یگانہ اپنی شاعری پر ایسی توجہ نہ دے سکے جس کی وہ مستحق تھی۔ اس عرصے میں جہاں یگانہ خود ذہنی انتشار اور کسی قدر ذہنی مرض کی زد میں رہے وہیں احباب و متعلقین اور اہلِ خانہ سے بھی ان کے معاملات کافی تلخ و ترش رہے۔

لکھنؤ میں وارد ہونے سے لے کر اہلِ لکھنؤ میں اعتبار حاصل کرنے یعنی یاس عظیم آبادی سے یگانہ چنگیزی بننے تک کا طویل ترین عرصہ کافی ہنگامہ خیز رہا۔ چونکہ یگانہ از خود میر و آتش سے انتہائی متاثر تھے اس لیے شاعری پر اساتذۂ لکھنؤ کے معمولی اور جزوی اعتراضات نے رنگ بدل کر 'عروضی معرکہ' گرم کر دیا۔ عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی جیسے اساتذہ سے عروض دانی میں امتیاز پر ٹھن گئی اور طرفین اپنے اپنے خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ یگانہ بھی اپنے حریف اساتذہ سے ہر موضوع پر چونکھی لڑنے لگے۔ پھر بات غالب شکنی تک پہنچی اور اس کے بعد عقائد کے حوالے سے بھی معتوب قرار پائے۔ غرض ان کی زندگی نہایت ہنگامہ خیز اور تضادات سے بھری ہوئی تھی۔

یگانہ بیک وقت صحافی، ادیب، ناقد، عروض داں اور بلند پایہ شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کمالِ فن کے جائزہ سے قبل تصانیف کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو درج ذیل ہیں:

(1) نشترِ یاس (حصہ اول) شعری مجموعہ (2) چراغِ سخن (اردو نثر/ رسالہ عروض و قوافی) (3) کارِ امروز (ادبی ماہانہ رسالہ) چھ شمارے شائع ہوئے۔ (4) صحیفہ (ادبی ماہوار رسالہ) ایک شمارہ شائع ہوا۔ (5) شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز (عزیز لکھنوی کی شاعری پر اعتراضات)۔ (6) آیاتِ وجدانی بمع محاضرات (شعری مجموعہ)۔ (7) ترانہ (مجموعۂ رباعیات)۔ (8) غالب شکن (مکتوبِ یگانہ بنام مسعود حسن رضوی ادیب)۔ (9) غالب شکن دو آتشہ۔ (10) گنجینہ (مجموعۂ غزلیات و رباعیات)۔ (11) کلیاتِ یگانہ (مرتب بقلم خود بفرمائش علی سجاد ظہیر)۔

اس کے علاوہ بھی کثرت سے نثری مضامین جن میں اکثر کے موضوعات عروضی بحث اور غالب کی مخالفت تھی، مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ نثری مضامین کی طرح ان کا کلام بھی اس دور کے تمام رسائل و جرائد میں پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ مذکورہ تمام کتب کے ہند و پاک سے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، علاوہ ازیں تحقیقی مقالات اور انتخاباتِ کلام الگ ہیں۔

یگانہ نے یاس عظیم آبادی کی حیثیت سے شاعری کا آغاز عظیم آباد میں ہی کر دیا تھا، اور سید علی خاں بیتاب اور شاد عظیم آبادی سے تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ لکھنؤ میں قیام کے ابتدائی دور میں پیارے صاحب رشید سے بھی اصلاحِ سخن کا سلسلہ رہا۔ 1905 میں لکھنؤ آنے سے قبل وہ یاس عظیم آبادی کے نام سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے حتیٰ کہ لکھنؤ کے شعرا کے درمیان بھی ان کی شناخت قائم تھی۔ آتش پرستی کا غلغلہ اگرچہ اہالیانِ لکھنؤ کی ضد میں اٹھایا گیا تھا لیکن درحقیقت وہ آتش سے بہت متاثر بھی تھے اور کسی قدر آتش کی تقلید کا رنگ بھی اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آتش کے علاوہ میر کی شاعری سے یگانہ کو خاصی موانست تھی، میر سے وہ بیحد متاثر ضرور تھے لیکن میر کی طرح رنج و غم جمع کر کے دیوان بنانے کے خلاف تھے اسی لیے عمر بھر سخت ترین حالات کے باوجود ان کے اندر کا حوصلہ مند شخص و شاعر زندہ رہا۔

فریبِ آرزو کب تک، امیدِ سخت جاں کب تک
مجھے خود بھی تعجب ہے رہے گا دل جواں کب تک
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

حالانکہ یگانہ کی شہرت ان کی غزل گوئی کے سبب زیادہ ہے

لیکن انھوں نے مروجہ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں، انھوں نے رباعیات، منظومات، قطعات، سہرے وغیرہ بھی کہے جو بہر حال ان کے اوجِ سخن کا نمونہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

یگانہ کی شاعری کا زمانہ وہ ہے جب ادبی فضاؤں میں عموماً علامہ اقبال کی منظومات کی گونج تھی اور خالص غزل گو شعرا بھی نظم پر خصوصی توجہ دے رہے تھے البتہ غزل گوئی کے حوالے سے اُس دور کے نامور معاصر شعرا میں حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھ پوری اور شاد عارفی موجود تھے۔ حسرت اور فانی عمر میں چند سال فوقیت رکھنے کے سبب سینئر اور باقی لگ بھگ ہم عمر یا تھوڑے سے جونیئر تھے۔ ان تمام میں یگانہ کا رنگِ سخن سب سے زیادہ شاد عارفی کے قریب نظر آتا ہے، ممکن ہے حالات اور طبیعتوں کے امتزاج کے سبب ایسا ہوا البتہ دونوں کے شاعرانہ مزاج میں نمایاں فرق ضرور تھا، انانیت پسندی، ضدی طبیعت، خودداری اور کشمکش حالات کے معاملے میں یگانہ اور شاد یکساں تھے البتہ فن اور اظہارِ شخصیت وفن کے معاملے میں جزوی فرق ضرور تھا۔ شاد کے تخیل کو حالات کی سنگینی اور مصائب نے ایسا تلخ وترش کر دیا کہ وہ غزل گوئی کو یکسر ترک کر کے خالص طنزیہ شاعری کرنے لگے لیکن طنز کی کاٹ نے خود ان کی شخصیت کے وقار کو مسخ نہ ہونے دیا۔ تمام مخالفتوں، اعتراضات اور معاصرانہ چشمکوں کے باوجود بھی شاد عارفی زندگی بھر نہ صرف شعرائے متقدمین کے فکروفن کے معترف رہے بلکہ اُن معاصر شعرا کی فنی خوبیوں کی تعریف بھی کی جو وقتاً فوقتاً شاد سے چھیڑ خانی کرتے رہتے تھے۔ یگانہ کے یہاں حالات وواقعات کے زیرِ اثر اظہارِ فن دو خانوں میں بٹ گیا، یعنی شاعری میں تو انھوں نے بہت زیادہ تلخی یا ترش روئی کا مظاہرہ نہیں کیا البتہ شخصی طور پر متقدمین ومعاصرین کی کھال کھینچنا شروع کر دی۔ بیان کردہ اختلافِ فکرونظر کے باوجود یگانہ اور شاد کی شاعری کے رنگ کافی یکسانیت کے حامل نظر آتے ہیں مثلاً یگانہ کہتے ہیں۔

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

یہی انداز شاد صاحب کے یہاں اس طرح نظر آتا ہے۔

نظر بچا کے اُس کو میں، وہ مجھ کو دیکھتا رہا
کبھی تو کہہ رہا ہوں کامیاب مدعا رہا

شاد اور یگانہ کے یہاں لاتعداد اشعار ایسے ہیں جو تیور اور بیان کی برجستگی کے اعتبار سے انتہائی قریب ہیں۔

جہاں تک لکھنؤ کے ہم عصر شعرا کی بات ہے تو یگانہ کے نزدیک اُن میں بیشتر کی شاعری بے جان وبے رنگ تھی۔ فانی بھی یگانہ کے اہم معاصرین میں تھے لیکن ان کا اندازِ غم یگانہ کو پسند نہیں تھا کیونکہ وہ معترف ہونے کے باوجود بھی میر کے اظہارِ غم سے محض اس لیے اختلاف رکھتے تھے کہ ''مجھے اے یاس مایوسی سے گھبرانا نہیں آتا'' کے مصداق انھیں حوصلہ مندی زیادہ پسند تھی، فانی پر اکثر یگانہ نے اعتراضات کیے ہیں البتہ فانی اُن کی بہت قدر وعزت کرتے تھے، اسی طرح اعتراضات کے باوجود جوش بھی یگانہ کے قدردان ومعترف تھے۔ بہر حال حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق اور شاد عارفی جیسے منفرد غزل گو شعرا کی موجودگی میں معتبر ومنفرد مقام حاصل کر لینا یقیناً ادبی حوالے سے بڑا کارنامہ کہلانے کا مستحق ہے اور یگانہ نے یہ کارنامہ کر دکھایا ہے۔ یگانہ کے یہاں ادراکِ ذات کی بہت شدت نظر آتی ہے مثلاً ذیل کے اشعار

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

یگانہ سماجی نظام سے سخت بیزار تھے، غالباً اپنے افکار کے سبب معتوب ہونے کے بعد یہ بیزاری مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔

دنیا کے ساتھ دین کی بیگار الاماں
انسان آدمی نہ ہُوا جانور ہوا
سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا
جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہو
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے ہمیں

اب بات کرتے ہیں یگانہ کی شاعرانہ انفرادیت کی؛ یگانہ کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی مایوسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے یعنی اُن کی امید افزائی کا سورج ہمیشہ روشن رہتا ہے، اسی لیے ان کے اشعار میر اور فانی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اس معاملے میں وہ تمام تر ناپسندیدگی اور اعتراضات کے باوجود غالب کے ہم مزاج نظر آتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ غالب شکن ہونے کے باوجود لاشعوری طور پر غالب اور ان کے فکروفن سے متاثر تھے۔ یگانہ کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں معاصر شعرا سے استفادے کا پہلو کم سے کم ہے، انھوں نے اپنے رنگِ سخن کو شعوری طور پر معاصر شعرا کی تقلید سے بچائے رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے لیے مضامین وموضوعات خود وضع کیے اور انھیں اپنے فکروفن کے وسیلے سے اردو ادب کی زینت بنایا۔

یگانہ کا امتیازِ سخن یہ ہے کہ انھوں نے روایتی غزل کی پاسداری کے ساتھ جدت کے طور پر اردو غزل کو باغیانہ تیور سے آشنا کیا، موضوعات کی مروجہ روایت سے انحراف کے معاملے میں وہ متقدمین ومعاصرین سے کسی قدر ممتاز اور کشادہ ذہن معلوم ہوتے ہیں۔

امید وبیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر وحرم گھر کا راستہ نہ ملا
پہنچی یہاں بھی شیخ وبرہمن کی کشمکش
اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا
مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رُو کرتے
بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دُعا کر چلے، اَب ترکِ دعا کرتے ہیں

یگانہ نے موضوعات کے حوالے سے اگر چہ روایت کی پاسداری کی ہے لیکن اُن کا خلاقانہ ذہن روایت میں تجدید کے پہلو تلاش کر کے اشعار کو انفرادیت سے ہم کنار کر دیتا تھا۔ بندش کی چستی، لفظیات کا انتخاب، خیالات کی دلکشی وشائستگی اور زورِ کلام کے سبب یگانہ کے اشعار صاف پہچانے جا سکتے ہیں۔

یگانہ اپنی شاعرانہ خصوصیات کے سبب واقعی یگانہ ہی تھے۔ انھوں نے اپنے قدآور معاصرین سے کسی قدر آگے بڑھ کر اپنے فکروفن کی راہیں ہموار کیں۔ جدید اردو غزل کے بنیاد گزاروں میں اُن کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

استفادی کتب

1. میرزا یگانہ شخصیت اور فن: مرتبین: مشفق خواجہ، پاشا رحمٰن، آمنہ مشفق، 1992 آصف پبلی کیشنز علی گڑھ
2. میرزا یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور شاعری از تمثیل احمد، 2006 ہارون نگر، پھلواری شریف پٹنہ۔
3. مونوگراف یگانہ چنگیزی از وسیم فرحت کارنجوی، اردو اکادمی، دہلی 2015
4. یگانہ احوال وآثار از نیر مسعود 1991 انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی

■

Seen Sheen Alam
Chairman: Saulat Public Library
Rampur - 244001 (UP)
Mob.:9412454786

کرناٹک میں مصاحبہ نگاری کے نقوش

عبدالرب استاد

ادب کی مختلف نثری اصناف میں ایک ایسی بھی صنف ہے جس کے کئی نام سنائی دیتے ہیں۔ وہ ہے 'انٹرویو' جسے مصاحبہ ملاقات، گفتگو، مخاطبہ، بات چیت، ہم کلام وغیرہ بھی کہا گیا ہے۔ مگر جوش ملیح آبادی سے جب استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواباً فرمایا کہ:

'میرے خیال میں انٹرویو کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسے اردو میں اسی طرح اپنا لینا چاہیے، جس طرح انگریزوں نے ہمارے کئی الفاظ جوں کے توں اپنا لیے۔''[1]

اس سے یہ اندازہ ہوا کہ انٹرویو انگریزی اصطلاح ہے اور انگریزی سے در آئی ہے۔

جدید نقاد سلیم شہزاد انٹرویو کے معنی بیان کرتے ہوئے فرہنگ ادبیات میں یوں رقمطراز ہیں:

''ادبی، فنی، سیاسی، مذہبی یا سماجی وغیرہ صورت حال اور مسائل پر دو افراد کی گفتگو، جس میں عموماً ایک فرد دوسرے سے سوالات کرتا اور دوسرا جواب دیتا ہے۔ اس میں سوال کرنے والا مخاطب سے اس کی ذاتی زندگی کے متعلق بھی معلومات دریافت کرتا ہے۔ دوسری شخصیت عموماً ادب وفن اور سیاست و مذہب وغیرہ کی اہم شخصیت ہوتی ہے۔ لیکن سوال کرنے والا بھی اگر ان شعبوں میں تربیت یافتہ ہو تو اس کے سوالوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے سوالات سیدھے اور آسان نہیں ہوتے بلکہ موضوع، گفتگو کے پیچیدہ مسائل ہو جاتے ہیں۔ ادبی شخصیات سے انٹرویو کو ادب کی ایک باقاعدہ صنف خیال کیا جاتا ہے۔ 'مصاحبہ' جس کے لیے مستعمل اصطلاح ہے۔''[2]

اس تناظر میں اگر ہم انٹرویو کو مصاحبہ مان بھی لیں تو شاید کوئی ہرج نہیں۔ ادب میں اس کی روایت بڑی مستحکم نظر آتی ہے۔ انٹرویو دراصل اپنی علمیت کا شور مچانے کا نام ہے نہ ہی اپنے قد کو بڑھانے کا عمل، بلکہ ذہن میں آنے والے سوالات کو اس طرز پر پیش کرنا ہوگا کہ خود کے ساتھ ساتھ ادب کے قاری اور سامع کی معلومات میں اضافہ ہو۔ اور انٹرویو دینے والے کو ایک طرح سے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور معلومات کو اس طور بیان کرے کہ جواب دیتے ہوئے جہاں خود خوشی و مسرت اور حظ و انبساط کے جذبات سے سرشاری حاصل کر رہا ہو، وہیں سننے اور بعد میں پڑھنے والے کو ہر طور سے اطمینان اور جذبۂ امتنان سے لبریز کر رہا ہو۔ یہ چونکہ بالارادہ لکھا ہوا مضمون یا مقالہ نہیں ہوتا بلکہ فی البدیہہ کہنا ہوتا ہے۔ ہاں اگر سوالنامہ دے دیا جائے اور جواب طلب کیا جائے تب بھی اس میں فکر و آگہی اور شعور کی بالیدگی اس کے جوابات سے مترشح ہوتی ہو۔ اس میں کبھی کبھی طنز کے نشتر بھی آ جاتے ہیں۔ مگر یہ نشتر عمل جراحی کے نشتر کی مانند ہوتے ہیں جو بجائے موت کے زندگی عطا کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے میری دانست میں نثر کی اصناف میں انٹرویو کی اپنی اہمیت ہے۔ پرنٹ میڈیا کے توسط سے ہم تک کئی ادبی، علمی، مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیات کی گفتگو پہنچ رہی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے تو اس کو مزید وسعت دی ہے۔ ہمارے ادبی جرائد، ادیبوں، شاعروں، نقادوں وغیرہ کے انٹرویوز اور مصاحبوں سے مزین نظر آتے ہیں۔ ہاں ان کو باقاعدہ کتابی صورت میں پیش کرنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

انٹرویو نگاری، ملاقات نگاری یا مصاحبہ نگاری پر کرناٹک کے حوالے سے نظر ڈالیں تو اس کے نقوش Quantity میں نہ سہی Quality میں ضرور نظر آئیں گے۔ تلاش بسیار تو نہیں تلاش اختصار کے بعد بہت کم مواد دستیاب ہوا جن سے یہ معلوم ہوا کہ پروفیسر سید شاہ مدار نے اپنی نگرانی میں بہت پہلے اس موضوع پر تحقیقی کام کرایا ہے۔ اس سے قطع نظر چند ایک احباب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا مگر وہ اتنا تشفی بخش نہیں رہا کہ اس کا حوالہ دیا جا سکے۔ البتہ سہ ماہی مجلّہ 'استعارہ' نئی دہلی 2002 میں محمود ایاز سے آخری بات چیت کے عنوان سے جو مصاحبہ شائع ہوا وہ غیر معمولی ہے۔ جس میں محمود ایاز سے انٹرویو لینے یا گفتگو کرنے والے تھے جناب خلیل مامون اور جناب عزیز اللہ بیگ۔ اس مصاحبہ کی اپنی انفرادیت یہ تھی کہ انٹرویو لینے والے جہاں دیدہ، ادب کے نشیب و فراز سے واقفیت رکھنے والے اور ادب کے مایہ ناز قاری، اس کے علاوہ تخلیقی سطح پر اپنی شناخت بنانے والے۔ وہیں جن سے انٹرویو لیا جا رہا ہے وہ بلند پایہ شاعر، غیر معمولی تنقیدی صلاحیتوں کا حامل، اردو سے قطع نظر دیگر زبانوں اور خاص طور سے انگریزی ادب اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں سے آشنا، بیدار مغز صحافی، اور انتظامی صلاحیتوں سے لبریز، ان تمام کے علاوہ مردم شناس اور ادب کا پارکھ۔ جب ایسی شخصیتوں کے مابین مصاحبہ ہو تو اس سے جہاں ادب کو فائدہ ہو رہا ہو وہیں ادب کے قاری کو ایک طرح سے سرشاری نصیب ہوتی ہے۔ اس مصاحبہ میں کیا نہیں ہے۔ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے شعر و ادب پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ اس انٹرویو میں جہاں ہمیں محمود ایاز کی علمیت اور ان کے مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے وہیں خلیل مامون اور عزیز اللہ بیگ کی ذہانت و متانت اور وسعت نظری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس انٹرویو کے بعد 2011 میں ریاست کرناٹک کے ایک جواں سال ادیب، ساہتیہ اکادمی سے یووا پرسکار حاصل کرنے والا نوجوان ڈاکٹر غضنفر اقبال نے 'ان کہی باتیں' کے عنوان سے انٹرویوز کا مجموعہ اردو ادب کے قارئین کے حوالے کیا۔ جس میں ہندوستان بھر کے مختلف ادیبوں، شاعروں، فکشن نگاروں اور صحافیوں سے مکالمہ کر کے اپنی علمیت اور دانشوری کا ثبوت دیا۔ ان میں ادب

کی قدآور ہستیاں موجود ہیں۔ ان سے ہم کلام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کلام کرنے والے میں دم خم موجود ہے۔

اس کتاب کو موصوف نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''فکشن شناس'' ہے جس میں چھے فکشن نگاروں کے انٹرویوز ہیں۔ ان میں جوگندر پال، اختر یوسف، اکرام باگ، شوکت حیات، قدیر زماں اور حمید سہروردی ہیں۔ اس میں افسانہ، ناول اور ڈرامہ پر کافی معلومات افزا مواد ملتا ہے۔ دوسرے حصے کو 'سخن شناس' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں دس شاعروں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ، بشر نواز، صادق، خلیل مامون، تنہا تماپوری، محمد یوسف عثمانی، شاہ حسین نہری، ساجد حمید، حامد اکمل، رؤف صادق، جاوید ندیم کے نام ہیں۔ ان میں خاصہ تنوع ہے۔ جدید شاعری کے حوالے سے یہ نام بہت اہمیت کے حامل ہیں اور اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب پر اور خصوصاً عصری ادب پر گہری نظر رکھنے والی شخصیات ہیں۔ تیسرا حصہ 'تنقید و تحقیق شناس' ہے۔ اس کے تحت بارہ افراد سے انٹرویو کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے نقاد اور محقق کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جیسے وہاب اشرفی، حامدی کاشمیری، لطف الرحمٰن، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، سلیم شہزاد، مہدی جعفر، یوسف سرمست، سید عبدالباری، سلیمان اطہر جاوید، وہاب عندلیب اور سید مجیب الرحمٰن ہیں۔ جبکہ اس کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ 'صحافت شناس' ہے۔ جس میں دو احباب سے مصاحبہ کیا گیا ہے وہ ہیں افتخار امام صدیقی اور دوسرے سید ظفر ہاشمی۔

ان کے علاوہ اور بھی مصاحبے ہیں جو اردو دنیا میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں کرناٹک کے معروف ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار جناب انل ٹھکر سے کیا گیا انٹرویو، اور دوسرا محترمہ شائستہ یوسف سے لیا گیا انٹرویو۔

2014 میں جناب اکبر زاہد کی 'گفت و شنید' کے عنوان سے اس صنف پر شائع ہوئی کتاب ہے۔ جس میں جملہ 44 شخصیات کے انٹرویوز ہیں۔ اور بیشتر مذہبی افراد سے کیے گئے انٹرویوز ہیں۔ بعض سیاسی اور سماجی افراد بھی ہیں جبکہ ادبی شخصیات کے انٹرویوز میں شمس الرحمٰن فاروقی، مجتبیٰ حسین، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر م۔ ن۔ سعید، وہاب عندلیب، علیم صبا نویدی اور پروفیسر کے ایس نثار احمد شامل ہیں۔ ان انٹرویوز میں ایک طرح کی یکسانیت ہے۔ اور ان کے منصب کے پیش نظر گفتگو کی گئی ہے۔ البتہ ڈاکٹر م ن سعید سے زیادہ تر افسانہ نگاری سے متعلق پوچھا گیا ہے جبکہ ان سے تعلیمی، تدریسی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے سوالات ہو سکتے تھے۔

2015 میں ایک اور دستاویزی کتاب اسی صنف میں سرزمین بندہ نواز سے ڈاکٹر انیس صدیقی نے بہ اشتراک رحیل صدیقی، 'سو تکلف اور اس کی سیدھی بات' کے عنوان سے شائع فرمائی۔ جس میں 35 افراد کے جملہ 28 انٹرویوز شامل ہیں۔ کبھی انیس نے کہا تھا کہ

ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھو

اس کی عملی تفسیر اس کتاب کی صورت میں ہمیں نظر آتی ہے۔ ہر شخص کا اپنا رنگ استفسار ہے اور ہر محاذ پر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی بصیرت افروز جواب دیتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ باصر تہذیب، ناصر تنقید، غائر ادب، حامی فکشن، مترجم و مدیر ہیں۔ دور حاضر کی نابغہ شخصیت اس کتاب میں جملہ 28 افراد کے انٹرویوز جو زائد از پانچ صد صفحات پر محیط ہے۔ میری دانست میں اگر کسی طالب علم، ریسرچ اسکالر اور استاد کو ادب کے تئیں شمس الرحمٰن فاروقی کے افکار سے مستفیض ہونا ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے۔ مرتبین کی رائے سے میں ہی کیا ہر شخص اتفاق کر سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب میں جو مصاحبات شامل ہیں۔ ان میں نظریۂ ادب و زبان، نظری تنقید کے مختلف مباحث، اردو زبان و ادب کی موجودہ صورتحال پر فاروقی صاحب کے خیالات، بے لاگ انداز میں اور ان کی معمولہ بے خوفی و دیانت داری کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

ایک طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ فاروقی صاحب کی ادبی شخصیت کو سمجھنے اور مختلف ادبی مسائل کو جاننے میں نہ صرف معاون ہے بلکہ ناگزیر کی حیثیت رکھتی ہے۔[3]

ان انٹرویوز کو پڑھتے ہوئے افتخار عارف کا وہ شعر ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

ہم کہاں کسی اور کو گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

2016 میں دیار گیسو دراز سے جدید شاعر جناب اکرم نقاش نے انٹرویوز پر مشتمل کتاب بعنوان 'خانہ تکلم' شائع کیا۔ اس میں ادب کی سرکردہ، معتبر اور مقتدر گیارہ شخصیات کے انٹرویوز ہیں۔ جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، فضیل جعفری، محمد علوی، ندا فاضلی، بشر نواز، بلراج کومل، خلیل مامون، اکرام باگ اور خالد جاوید کے نام آتے ہیں۔ ان انٹرویوز کے تعلق سے خود انٹرویو نگار نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

.....انٹرویوز میں ایسے سوالات قائم کیے جائیں جو ادب کی افہام و تفہیم اور ادب کی سمت و رفتار کی نشاندہی میں مددگار ثابت ہوں..... کتاب میں شامل جتنی شخصیات سے انٹرویو کیے گئے ہیں وہ سبھی جدیدیت اور جدید ادب کے بنیاد گزار اور علم بردار رہے ہیں۔ سو ان سے جدیدیت کے موضوع پر زیادہ استفسار کیا گیا۔[4]

ان تمام میں انٹرویو نگار نے علمی، ادبی اور فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔

ایک اور انٹرویو بنگلور سے شائع ہونے والے جریدے طنز و مزاح سے دستیاب ہوا ہے۔ وہ انٹرویو ایک طنز و مزاح نگار نے معروف طنز و مزاح نگار سے میری مراد ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے ڈاکٹر مجتبیٰ حسین سے لیا ہے۔ اس میں تنوع ہے۔ انٹرویو نگار نے مجتبیٰ حسین کی زندگی اور ادب کے تعلق سے سوالات کیے ہیں اور یہ اپنی نوعیت کا ایک اچھا انٹرویو ہے۔

ان کے ساتھ ساتھ ریڈیو انٹرویو میں چند اہم نام ملتے ہیں جنھوں نے یادگار انٹرویوز کیے جو نشر بھی ہوئے مگر تحریری طور پر کم ہی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں جناب ملنسار اطہر، ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین اور محترمہ نصرت جہاں کے نام آتے ہیں۔

جبکہ جناب ماہر منصور ایک شاعر، مترجم اور نقاد کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے بھی کنڑی فنکاروں کے انٹرویوز لیے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ حنیف قمر جو متوطن گلبرگہ کے ہیں مگر ان دنوں ممبئی میں قیام پذیر ہیں۔ انھوں نے کئی اہم ادبی شخصیات کے انٹرویوز کیے ہیں جن میں ضمیر کاظمی، جاوید صدیقی، انیس عادل، مراق مرزا، قیصر خالد، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سلام بن رزاق، وغیرہ کے انٹرویوز تریاق ممبئی میں سلسلہ وار شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور نام ملتے ہیں جنھوں نے اس صنف کو وسعت دینے میں اہم رول ادا کیے ہیں۔ وہ نام یہ ہیں۔ اعظم شاہد، حامد اکمل، صبیحہ زبیر، چاند اکبر، اطہر معز وغیرہ ہیں۔

حواشی:

1. ملاقات نگاری از ڈاکٹر مظفر اقبال، بحوالہ اردو میڈیا، ص 206
2. فرہنگ ادبیات از سلیم شہزاد، ص 135
3. سو تکلف اور اس کی سیدھی بات از ڈاکٹر انیس صدیقی / رحیل صدیقی ص 9
4. خانہ تکلم از اکرم نقاش ص 7

■

Dr. Abdul Rub Ustad
Department of Urdu and Persian,
Gulbarga University
Kalaburagi - 585106 (Karnataka)

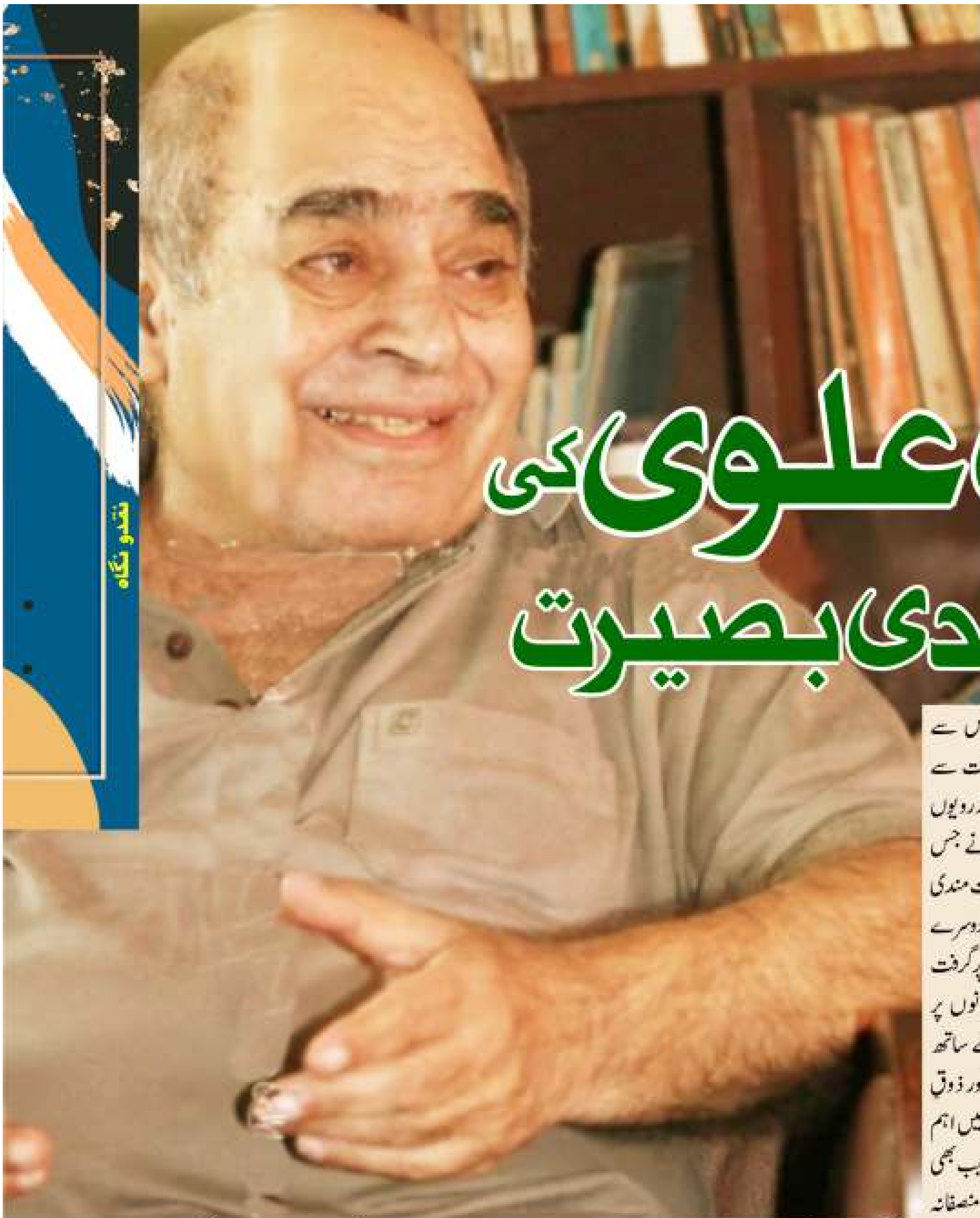

محمد زبیر

وارث علوی کی تنقیدی بصیرت

وارث علوی دورِ جدید کے ان ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو تنقید کو نئے امکانات سے روشناس کیا بلکہ اپنے فکروفن اور غیر جانب دارانہ رویوں سے اردو ادب کو اعتبار بھی بخشا ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، بے لاگ لکھا اور بڑی جرأت مندی کے ساتھ اپنی ناقدانہ آرا پیش کیں۔ ان کی تحریریں دوسرے ناقدین کی خامیوں، کمزوریوں اور دیگر پہلوؤں پر گرفت کرتی ہیں۔ انھیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل ہے، لہٰذا ہندوستانی ادبیات کے ساتھ مغربی لٹریچر بھی زیرِ مطالعہ رہے۔ یہی مطالعے اور ذوقِ کتب بینی ان کے ادبی شعور کو پروان چڑھانے میں اہم اور کارگر ثابت ہوئے اور تنقیدی رجحان کا سبب بھی بنے۔ وارث علوی کی تنقید حقیقت پسندانہ اور منصفانہ رویوں پر مبنی ہے لیکن اسلوب میں طنز و استہزا کی فراوانی کے سبب بعض ناقدین کے لیے گراں بار ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو کے اکثر ناقدین ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کے معترف تو ہیں لیکن انھیں وہ مقام دینے کے حق میں نہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔

وارث علوی نے ادب کی مختلف اصناف پر اپنے تنقیدی نظریے پیش کیے ہیں۔ ہرچند کہ ان کا شمار فکشن ناقدین میں ہوتا ہے اور ان کی فکشن تنقید ایک مستقل عنوان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ انھوں نے افسانے کی تنقید میں نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے اضافے کیے ہیں تاہم ان کی نگارشات نہ صرف ناول اور افسانے کا ہی احاطہ کرتی ہیں بلکہ اردو شاعری اور تنقیدیں بھی ان کے مطالعے کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو ان کی درجن بھر کتابیں ان موضوعات کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے ہیں، جن میں 'خندہ ہائے بیجا' (1987)، 'پیشہ تو سپہ گری کا بھلا' (1990)، 'کچھ بچا یا لا ہوں' (1990)، 'اوراق پارینہ' (1998)، 'بورژوا بورژوازی' (1999) 'ادب کا غیر اہم آدمی' (2001)، 'لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر' (2001)، 'ناخن کا قرض' (2003)، 'حالی، مقدمہ اور ہم' اور 'بتخانہ چین' (2010) وغیرہ اہم ہیں۔

کسی اہم اور غیر جانب دارانہ ناقد کی تنقید ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا کرتی ہے۔ وارث علوی کا تنقیدی شعور ایسا ہی ہے جو ان کے خالص علمیاتی جذب واخذ کا نتیجہ ہے۔ تنقید کا کام نہ صرف شعروادب کی آبیاری کرنا ہے بلکہ باذوق قارئین بھی پیدا کرنا ہے۔ تنقیدی دورانیے میں باذوق قارئین کا اضافہ اسی وقت ممکن ہے جب نقاد اپنے علومِ دیزہ سے ادب میں کسی نئے پہلو کو ایک نئے استدلال اور نئے طریقۂ کار کے ساتھ پیش کرے اور یہ امر ملحوظ رکھے کہ موضوع اور لفظ و معنی کے مابین کوئی حدِ فاصل موجود نہ ہو۔ کیونکہ موضوعِ نقد اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے اور اس بات کا متقاضی بھی ہوتا ہے کہ اسی کے موافق لفظ و معنی لائے جائیں۔ اگر موضوع ان خصوصیات سے عاری ہے تو قاری کے لیے گراں بار ہوتا ہے اور بآسانی وہ اسے قبول بھی نہیں کرتا۔ وارث علوی کی تنقید اس کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ جیسا کہ آلِ احمد سرور کی تنقید سے متعلق لکھا ہے:

''سرور کے یہاں تفحص اور انکشاف کی کوشش ملتی ہے، لیکن کوشش بارآور ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ تنقید میں

موضوع اسی وقت اپنے معنوی اسرار بے نقاب کرتا ہے جب تجزیہ، تحلیل، تفسیر اور تشریح کے محاذوں سے اس پر بیک وقت دھاوا بولا جائے۔ سرور ایسا نہیں کرتے۔ وہ تلوار چلانے کے بجائے تلوار سے کھیلنے لگ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چکا چوند سے بھی وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو تُلا ہوا وار کرنے سے پیدا ہوتا ہے.......... اگر وہ اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکے تو اس میں قصور ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا نہیں، بلکہ طریقۂ کار کا ہے۔ سرور کے طریقۂ کار کے نقائص ہیں، تجزیاتی مطالعہ کی کمی، عمومی بیانات کی فراوانی، غیر متعلق مباحث کی بھرمار، پیش پا افتادہ خیالات کا چمک دار اقوال میں آواگون، اور وہ خاص نیم مدرسانہ، نیم شاعرانہ، نیم متصوفانہ اور نیم شاطرانہ رویہ شامل ہے۔''

(خندہ ہائے بیجا: وارث علوی، ص 88)

وارث علوی نے ایک طرف سرور کی کمزوریاں اجاگر کی ہیں تو دوسری جانب ان کی ادب فہمی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ہر چند کہ اردو تنقید میں آل احمد سرور کو ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ ان کے ادب پاروں نے نہ صرف شعر و ادب کو ایک معیار عطا کیا ہے بلکہ اسے ایک رخ بھی دیا ہے اور مختلف زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ ہمارے ناقدین اور ادیبوں کے یہاں مغربی دانشوروں کے طرز پر سوچنے، غور و فکر کرنے، حق و صداقت اور فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی وہ صلاحیت نہیں جو ان کے یہاں موجود ہے تاہم اس بات سے انکار بھی نہیں کہ اردو ناقدین نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں سے ادب کو فروغ دینے میں حتی الوسع سعی کی ہے۔ وارث علوی نے مشرقی ادب اور ناقدین کے تنقیدی رویوں کے متعلق لکھا ہے:

''علم کو علم کی طرح حاصل کرنا، جہانِ افکار کی بے لوث سیاحت پر نکل جانا، مکمل معروضیت سے حقائق کو جانچنا پرکھنا اور ایک بے لاگ اور بے پایاں تجسس کے تحت صداقت کی تلاش کرنا، دانشوری کے وہ آداب ہیں جن کا مغرب کے ادیبوں اور مفکروں کی طرح ہم نے کبھی پاس نہیں کیا۔ کچھ سلیقے کا کام ہونے لگتا ہے کہ عظمت لیڈری اور چودھراہٹ کا کیڑا سر میں کلبلانے لگتا ہے۔ پھر تو نظریہ عقیدہ بن جاتا ہے اور عقیدہ مذہب اور نقاد پیغمبر یہ پورا رویہ مخالف دانشورانہ ہے۔''

(لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر: ص 150)

وارث علوی کا نظریۂ نقد نہ کسی عقیدہ اور مذہب کا پابند ہے اور نہ ہی ان کے یہاں پیغمبرانہ رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی تنقیدی نگارشات کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ان کی کتاب ''حالی، مقدمہ اور ہم'' اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں انھوں نے حالی اور مقدمہ پر کھل کر بحث کی ہے۔ یہ کتاب حالی فہمی میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ مولانا حالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو تنقید کو مقام و معیار بخشا۔ انھوں نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' اپنے دیوان کے لیے بطور مقدمہ لکھ کر اردو تنقید کی بنیاد ڈالی۔ یہ کتاب ہمارے ناقدین ادب کے نزدیک اس قدر منفرد اور گراں قدر ثابت ہوئی کہ انھوں نے اس کو اردو ادب کی مستند تنقیدی کتاب کے طور پر تسلیم کیا اور حالی کو باقاعدہ اردو تنقید کا بانی مان لیا کیونکہ حالی سے پہلے جو تنقید ملتی ہے وہ محض چند تذکروں تک ہی محدود ہے۔ ان تذکروں میں میر کے تذکرے 'نکات الشعرا' کو اولیت حاصل ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ قائم چاندپوری کے تذکرے سے ہوتا ہوا محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' تک پہنچتا ہے۔ آزاد نے اردو تنقید و تحقیق کے موضوع پر اپنی کتاب 'آب حیات' ادبی دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنی خلاقانہ صلاحیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اردو تنقید کے ابتدائی دور میں محمد حسین آزاد سے قبل تذکروں کی تنقید اور آگے چل کر مولانا حالی سے شروع ہونے والی ادبی تنقید سامنے آتی ہے۔

محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' کے بعد اردو ادب میں باقاعدہ طور پر تنقید کی شروعات حالی کے 'مقدمہ' سے تسلیم کی جاتی ہے۔ مولانا حالی نے اردو تنقید و تحقیق میں نظم و ضبط کی پوری پوری پاسداری کی ہے جب کہ آزاد کے یہاں تنقیدی تصورات نہ صرف منتشر معلوم ہوتے ہیں بلکہ بنیادی مسائل پر تفصیلی اظہار بھی نہیں کرتے۔ حالی کو اپنے ماقبل نقادوں پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ ان سے قبل تنقید کے موضوع پر کوئی تخلیق نہیں ملتی صرف چند تذکرے یا دو ایک تاریخی کتب ہی سامنے آتی ہیں۔ یہ تذکرے یا تاریخی کتب تنقید کے فرائض انجام نہیں دیتے۔ مولانا حالی کی تصنیف 'مقدمۂ شعر و شاعری' (1893) اردو کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مقدمہ میں جن باتوں پر تفصیلی بحث کی ہے، ان میں ایک اہم اور بنیادی پہلو اردو شاعری کی خصوصیات سے متعلق بھی ہے۔ ایک شاعر میں شاعری کے لیے ایسی خصوصیات کا ہونا لازم ہے جو اسے غیر شاعر سے ممیز کر سکے۔ مقدمۂ حالی کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے دلائل کو بنیاد بنایا۔ ان کے مطابق برائے شعر گفتن ایک شاعر میں تین خصوصیات، تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کا پایا جانا ضروری ہے، جن کے بغیر عمدہ شاعری کا تصور ممکن نہیں کیونکہ حالی نے جن خصوصیات کو ناگزیر قرار دیا ہے ان میں اولیت تخیل کو ہی ہے۔ کسی شاعر میں شاعرانہ تخیل کی پرواز جتنی بلند ہوگی اس کی شاعری اسی قدر معیاری اور اعلیٰ پائے کی ہوگی، اگر پروازِ تخیل بلند نہیں ہے تو اس کی شاعری کمتر درجے کی ہوگی۔ وارث علوی نے مولانا حالی اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' پر صرف اپنی ناقدانہ آرا ہی پیش نہیں کیں بلکہ ان ناقدین ادب پر ضرب کاری بھی لگائی ہے جنھوں نے حالی کو اپنا ہدف بنایا۔ انھوں نے لکھا ہے:

''ہمارے نقاد نئے نئے انگریزی کے پروفیسر بن کر آئے۔ انگریزی تنقید میں کالرج کے تخیل کے چرچے بھی عام تھے۔ انگریزی کا بی اے کا طالب علم چوں کہ اسکاٹ جیمز کو پڑھتا ہے اس لیے فینسی اور امیجنیشن اور Esemplastic امیجنیشن کی گردان کیا کرتا ہے۔ حالی کے نکتہ چیں بھی یہی گردان کرنے لگے۔ حالی آج کے فنکاروں کی طرح یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ تخیل کے موضوع پر انھوں نے کون کون سے تیس مار خانوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ تو تخیل کے موضوع پر کچھ ایسی کام کی باتیں بتانا چاہتے تھے جو تخلیق شعر کے عمل پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔ چناں چہ انھیں جانسن، مکالے وغیرہ کے یہاں سے اس موضوع پر جو کچھ تھوڑا بہت مواد مل سکتا تھا اس سے فائدہ اٹھایا اور اس مواد کو بنیاد بنا کر تخیل کی ایسی تعریف کی جو آج بھی اردو تنقید میں حرف آخر کا مقام رکھتی ہے۔''

(حالی، مقدمہ اور ہم: وارث علوی، ص 20-19)

وارث علوی نے بھی تخیل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے کالرج جیسے مغربی نقاد کو پڑھا اور اپنی ذہنی اور فکری صلابت سے تخیل جیسے خشک موضوعات کی باریکیوں سے نہ صرف آگاہی حاصل کی بلکہ اپنی ناقدانہ آرا سے نام نہاد ناقدین کو آئینہ بھی دکھایا۔ حالی اردو کے اہم نقاد تسلیم کیے گئے ہیں تاہم بعض ناقدینِ ادب نے نظریاتِ حالی سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن وارث علوی کی نظر میں حالی کا مقدمہ اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ قبل ازیں اس موضوع پر کوئی مستند کتاب دستیاب نہیں تھی اور نہ ہی بعد میں کوئی ایسی مفصل اور مدلل کتاب سامنے آسکی۔ لہٰذا اس کے بعد جن ناقدین نے مذکورہ موضوع پر لکھنے کی سعی کی ہے وہ تحریریں یا تو غیر معیاری ہیں یا حالی کے مقدمہ کی نقالی۔ بقول وارث علوی ''حالی پورے آدمی تھے جب کہ ہم لوگ ادھورے آدمی ہیں۔ ہمارے پاس نظامِ اقدار نہیں، تاریخی تناظر نہیں، روایت کا شعور نہیں، کھرے کھوٹے کے پیمانے نہیں۔ روشن خیالی کی جگہ تنگ نظری اور انتہاپسندی ہے...... ہم اثرات قبول نہیں کرتے، نقالی کرتے ہیں۔ تنقید نہیں کرتے، رائے زنی کرتے ہیں، نظریہ سازی نہیں کرتے، حزبی اور گروہی اعلان نامے شائع کرتے ہیں۔ تنقیدی کتابیں نہیں لکھتے، تعصبات کے دفتر سیاہ کرتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 84)

بعینہٖ احسن فاروقی کی تنقید سے استدلال کرتے ہوئے وارث علوی نے لکھا ہے:

''آپ یہ نہ سمجھیں کہ احسن فاروقی کے دل میں حالی کے لیے کوئی عزت نہیں۔ حالی کی تعریف میں چند بہترین جملے بھی انھوں نے ہی لکھے ہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نقاد جب حولداروں کی طرح بات کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا طرزِ گفتگو بھی کتنا غیر شریفانہ بن جاتا ہے۔ جوشِ تنقید میں انھیں یہ تک خیال نہیں رہا کہ حالی جیسے نقاد پر قلم اٹھاتے وقت ہمیں آدابِ گفتگو کی پاس داری کرنی پڑتی ہے۔ اگر احسن فاروقی 'مقدمہ' کو ذرا غور سے پڑھتے تو حالی کا اسلوبِ نگارش انھیں آدابِ تنقید بھی سکھاتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تنقید سخت نہیں ہونی چاہیے۔ میں تو صرف عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سخت ترین تنقید میں بھی ایک لفظ ایسا نہیں آنا چاہیے جو نقاد یا فن کار کی شخصیت کے شایانِ شان نہ ہو، یا جو نقاد کو ہمارے سامنے حقیر بنا کر پیش کرتا ہو۔ احسن فاروقی کی نیت خراب نہیں، صرف زبان خراب ہے۔'' (ایضاً، ص 25,26)

احسن فاروقی کی تنقید اور زبان پر وارث علوی کا ایسا شدید طنز یہ واران کی ادب دوستی اور ادب پروری کا ہی ثبوت ہے۔ اردو تنقید میں کلیم الدین احمد، محمد احسن فاروقی اور وحید قریشی جیسے ناقدینِ ادب نے حالی کے مقدمہ سے جس قدر فیض حاصل کیا ہے اسی قدر اس کی تنقیص بھی کی ہے۔ ادب میں اس طرح کی نقص طرازی دانش مندانہ کام نہیں کیونکہ یہ رویہ ناقدینِ ادب اور ان کے دامن کو داغ دار کرتا ہے۔ حالی اور مقدمہ شناسی میں وارث علوی کا معیارِ نقد خاصا وقیع ہے جو زبان پر ان کی قدرت اور مختلف ادبیات پر مطالعے کی وسعت کی دین ہے۔ انھوں نے مشرقی اصولِ تنقید کے ساتھ مغربی افکار و نظریات کا نہ صرف سرسری مطالعہ کیا ہے بلکہ تصوراتِ نقد اور نت نئے اصول و ضوابط کا بھرپور جائزہ بھی لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ علوی نے مستند اور مدلل حوالوں سے مذکورہ ناقدینِ ادب کی تنقید پر اپنی مہرِ تنقید ثبت کی ہے۔ اس لحاظ سے وارث علوی اور ان کی تنقیدی جہات دوسروں سے نہ صرف منفرد ہیں بلکہ لائقِ اعتنا بھی ہیں۔

حالی پر متعدد ناقدین نے اپنی بے لاگ آرا پیش کی ہیں ان میں کلیم الدین احمد کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ حالی کی تنقیدی بصیرت اور ادب فہمی کے بارے میں ان کا نظریہ تھا کہ ''خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط۔ یہ تھی حالی کی کائنات۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، ص 109)

کلیم الدین احمد کی تنقید چونکہ مغربی ادب کے زیرِ اثر وجود میں آئی تھی، بایں سبب ان کی آنکھوں پر

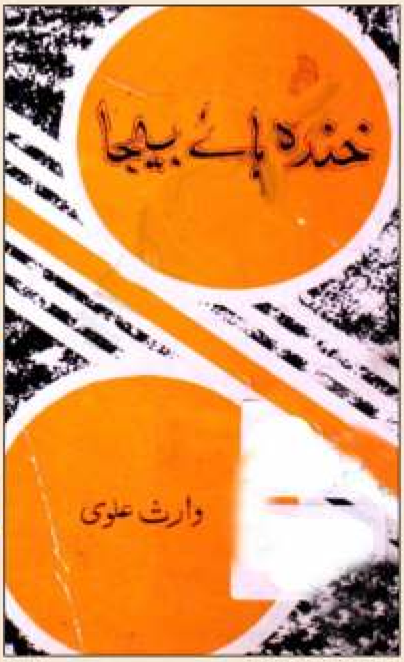

انگریزی ادب کی عینک چڑھ گئی تھی، لہٰذا مشرقی ادب میں بھی ان کی نظر مغربی طرزِ ادب کی متلاشی تھی۔ اسی لیے انھوں نے حالی کی انگریزی ادب سے واقفیت کو محدود گردانا۔ یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ حالی کا مقدمہ مشرقی ادب خصوصاً اردو شاعری کی تنقید سے متعلق ہے نہ کہ انگریزی ادب سے۔ جیسا کہ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں حالی کے مقدمہ کے متعلق لکھا ہے ''یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ مقدمہ میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ حالی پوری عربی، فارسی اور اردو شاعری پر حاوی نظر آتے ہیں لیکن انگریزی ادب سے حالی کی واقفیت محدود تھی۔'' (ایضاً، ص 109)

وارث علوی نے کلیم الدین احمد کے ان جملوں پر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان جملوں میں حالی کی طاقت اور کلیم الدین احمد کی کمزوری کا پورا راز چھپا ہوا ہے۔ 'مقدمہ' کا اہم اور وافر حصہ انگریزی ادب پر نہیں بلکہ اردو شاعری کی نہایت جز رس اور بصیرت افروز تنقید پر مشتمل ہے۔ عربی، فارسی، اردو شاعری، غزل، قصیدے، مثنوی اور مرثیے پر حالی نے جو کچھ لکھا، کلیم الدین احمد کو اس سے سروکار نہیں۔ انھیں تو صرف انگریزی ادب سے حالی کی ناواقفیت کو بے حجاب کرنے کے مزے لوٹنے ہیں۔ ایسی تنقید طبیعت کو بہت متغض کرتی ہے کیونکہ اس کا بڑا عیب اسپرٹائز (Expertise) کا کلچر پر حملہ ہے۔'' (حالی، مقدمہ اور ہم: وارث علوی، ص 51)

بعینہٖ وارث علوی نے شمیم حنفی کی تنقید پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شمیم حنفی کو اس بات کا بڑا اصرار ہے کہ شاعری میں اساسی حیثیت خیالات کی نہیں شعری تجربے کی ہے۔ لیکن

وارث علوی نے بھی تخیل کا گھرا مطالعہ کیاتھا۔ انھوں نے کالرج جیسے مغربی نقاد کو پڑھااوراپنی ذھنی اور فکری صلابت سے تخیل جیسے خشک موضوعات کی باریکیوں سے نہ صرف آگاھی حاصل کی بلکہ اپنی ناقدانہ آرا سے نام نہاد ناقدین کو آئینہ بھی دکھایا۔ حالی اردو کے اھم نقاد تسلیم کیے گئے ھیں تاھم بعض ناقدین ادب نے نظریات حالی سے اختلاف کیا ھے۔ لیکن وارث علوی کی نظر میں حالی کا مقدمہ اس لحاظ سے بھی اھمیت کا حامل ھے کہ قبل ازیں اس موضوع پر کوئی مستند کتاب دستیاب نھیں تھی اور نہ ھی بعدمیں کوئی ایسی مفصل اور مدلل کتاب سامنے آسکی۔

حالی کی کتاب کا نام 'مقدمہ شعروشاعری' ہے، جب کہ شمیم حنفی کی کتاب کا نام 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' ہے۔ شمیم حنفی فلسفہ، تاریخ، سائنس، نفسیات پر نہایت بور مبتدیانہ لن ترانیاں کرتے ہیں اور پوری کتاب میں ایک نظم، ناول اور ڈرامے کا تجزیہ نہیں ملتا۔ اِدھر حالی ہیں کہ غزل، مرثیے، قصیدے اور مثنوی پر لگاتار بحث کرتے چلے جاتے ہیں اور بحث بھی ایسی کہ قدامت پسند حلقوں میں مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔'' (ایضاً، ص 62)

ان اقتباسات میں ہم دیکھتے ہیں کہ وارث علوی نے کس طرح اردو کے اہم ناقدین کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ان کے یہاں جس طرح کے بے باکانہ اور بے مہابانہ رویے دیکھنے کو ملتے ہیں، دوسروں کے یہاں اکثر مفقود ہیں۔ ان کی تنقید میں بصیرت کے ساتھ مسرت بھی ہے اور طنز کے ساتھ مزاح بھی ہے۔ ان کی یہی خوبی انھیں دیگر نقادوں سے ممتاز و نمایاں کرتی ہے۔ شمیم حنفی سے وارث علوی کا یہ اختلاف کوئی ذاتی مسئلہ نہیں اور نہ ہی ان سے بغض و عناد رکھتے ہیں بلکہ یہ ان کے اسلوب، ان کی فکر اور طرزِ تحریر کا تقاضا ہے جو ادب کے لیے کارآمد اور سودمند بھی ہے۔ شمیم حنفی کی کتاب 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں اور نہ ہی وارث علوی کی کچی تنقید نگاری سے روگردانی کی جاسکتی ہے۔ ان کی تنقید براہ راست ہوتی ہے لہٰذا وہ سیدھی بات کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں تنقیدی رویے بالمقابل دیگر ناقدین کے مختلف اور معنی خیز ہوتے ہیں اسی لیے ذہن و دل پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔

وارث علوی نے اردو کے اکثر بڑے ناقدین پر اپنے تنقیدی مضامین لکھ کر اپنی ناقدانہ صلاحیتوں سے بھرپور جائزہ لیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وارث علوی نہ صرف ادب کے بنیادی پہلوؤں سے کماحقہٗ واقف تھے بلکہ تنقید و تبصرہ کی اساس ان کی سرشت میں پوری طرح داخل تھی۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اردو کی تقریباً تمام اصناف پر اپنے تنقیدی نظریات کھل کر پیش کیے ہیں۔ مولانا حالی کی کتاب 'مقدمہ شعروشاعری' پر ایک پوری کتاب (حالی، مقدمہ اور ہم) لکھ ڈالی ہے، انھوں نے مولانا کو جس روپ میں پایا اپنی تنقیدی بصیرت سے اسے جاوداں کر دیا۔ اس سے حالی اور وارث علوی کے تنقیدی اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں حالی کے مقدمہ کا عالمانہ جائزہ لیا ہے اور اپنے منفرد طرزِ اسلوب سے اس کے وقار میں نہ صرف اضافہ کیا ہے بلکہ اس کو ایک معیار بھی عطا کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں وارث علوی نے اپنے مطالعے کی بنا پر وزیر آغا کی تنقید نگاری اور گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور محمد حسن جیسے ناقدین ادب کے شعور نقد سے بھی اختلاف کیا ہے، لہٰذا وارث علوی کا یہ اختلاف بے سبب نہیں۔ ادب کے ان جید ناقدین سے اختلاف صرف وہی کر سکتا ہے جس کے اندر جذبہ و حوصلہ ہو اور دلائل و براہین بھی ہوں۔ اس لحاظ سے بھی غور کریں تو وارث علوی کے یہاں یہ فکری خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر انور ظہیر انصاری کا یہ اقتباس دیکھیے، رقم طراز ہیں:

''کسی کی تنقید پر تنقید کرنا بہت مشکل نہ سہی لیکن آسان تو قطعاً نہیں ہے، وہ بھی پروفیسر نارنگ جیسا جید عالم ہو تو اور بھی ناممکن ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو نہ صرف الفاظ کے استعمال کا سلیقہ شعار ہو بلکہ لفظیات پر قدرت، صنائع لفظی و معنوی پر دسترس، ان کی جزئیات سے کماحقہٗ واقفیت اور اس سے بھی زیادہ اردو ہی نہیں دوسری ادبیات سے متعلق گہرا مطالعہ اور وسیع تر بصیرت و آگہی رکھتا ہو اور سب پر بالا بے مثل انتقادی قوت سے بہرہ ور بھی ہو تو باور کرنا چاہیے کہ یہ حوصلہ وارث علوی کا ہی ہو سکتا ہے۔''

(سرسید سے شہریار تک: پروفیسر انور ظہیر انصاری، ص 206)

وارث علوی کے مطابق تنقید وہی اچھی ہوتی ہے جو ذوقِ سلیم کی تربیت کے ذریعے قاری میں ہر رنگ اور ہر آہنگ کے اشعار سے لطف اندوزی کی صلاحیت پیدا کر دے۔ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'شعر غیر شعر اور نثر' پر اپنی تنقیدی آرا پیش کی ہیں اور حسن عسکری کی اس رائے کو بھی درست ٹھہرایا ہے جس میں انھوں نے فاروقی کا نام حالی کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اردو تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ اردو تنقید خصوصاً شعریات فہمی میں جس ڈھنگ سے انھوں نے اپنا عندیہ پیش کیا ہے، عہدِ حاضر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''فاروقی کے یہاں اکثر محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر میں ضرورت سے زیادہ معنی پڑھ رہے ہیں۔ لیکن یہ احساس بھی صرف ان مضامین میں ہوتا ہے جو فی الواقعی سبق اور درس ہیں اور لفظ کے جدلیاتی استعمال، لفظی انسلاکات اور ابہام کی نوعیت سے بحث کرتے ہیں ورنہ فاروقی کو معنی آفرینی کا خاص شوق نہیں اور حتی الامکان وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر شوق ہوتا تو وہ اسطوری تنقید کی طرف ضرور توجہ دیتے کیونکہ دور از کار تاویلات، بوالعجب تفاسیر اور محیر العقول معنی آفرینی کی جتنی گنجائش اسطوری تنقید میں ہے اتنی ہیئتی تنقید اور اسلوبیات میں نہیں۔'' (ادب کا غیر اہم آدمی: وارث علوی، ص 28)

وارث علوی نے اپنی زبان دانی، بے لاگ تنقیدی سوجھ بوجھ، اپنے بے باک لب و لہجے اور اپنے فکر و خیال کی گہرائی و جدت کے سبب معاصر ناقدین میں ایک منفرد شناخت قائم کر لی ہے۔ ادب کے تئیں ان کا تنقیدی رویہ اور نظریہ غیر جانب دارانہ اور راست گوئی پر مبنی ہے۔ انھوں نے ادبی تجربات میں اپنا فکری ارتباط ہمیشہ برقرار رکھا۔ ان کے مطابق تخلیقی تجربات میں قلم کار کو مکمل آزاد ہونا چاہیے کیونکہ آزادیِ اظہار سے ہی فن کار اپنے فن کو بخوبی اجاگر کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے تنقیدی خیالات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے موقف کو جس بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے اردو تنقید میں ایسی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔ ان مضامین میں جس نہج پر انھوں نے مختلف اصطلاحات اور تشبیہات کے وسیلے سے اردو کا موجودہ منظر نامہ پیش کرنے کی سعی کی ہے وہ یقینی طور پر قارئین کے لیے پُرلطف ہونے کے ساتھ دل پذیر بھی ہے۔ برمحل فقروں، لفظوں اور اصطلاحوں کے استعمال میں ان کا طریقِ کار بڑا دلچسپ اور نرالا ہے لیکن کبھی کبھی جارحانہ انداز اختیار کر جاتا ہے اور گراں بار بھی ہوتا ہے۔ ادب کے لیے انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی صداقت کو اجاگر کرنے میں بخل اور مصلحت پسندی سے کام لیا ہے، جس کو جیسا پایا ویسا ہی پیش کر دیا۔ ان کی یہی خوبی قارئین کو اپنی گرفت میں لیتی ہے اور مطالعے کی جانب راغب بھی کرتی ہے۔

■

> کسی کی تنقید پر تنقید کرنا بہت مشکل نہ سہی لیکن آسان تو قطعاً نہیں ہے، وہ بھی پروفیسر نارنگ جیسا جید عالم ہو تو اور بھی ناممکن ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو نہ صرف الفاظ کے استعمال کا سلیقہ شعار ہو بلکہ لفظیات پر قدرت، صنائع لفظی و معنوی پر دسترس، ان کی جزئیات سے کماحقہٗ واقفیت اور اس سے بھی زیادہ اردو ہی نہیں دوسری ادبیات سے متعلق گہرا مطالعہ اور وسیع تر بصیرت و آگہی رکھتا ہو اور سب پر بالا بے مثل انتقادی قوت سے بہرہ ور بھی ہو تو باور کرنا چاہیے کہ یہ حوصلہ وارث علوی کا ہی ہو سکتا ہے۔

Dr. Mohammad Zubair
Dept. of Urdu, Sahitya Vidya Peedh
Mahatma Gandhi Antar Rashtriya Hindi Vishv Vidyalaya, Wardha.(M.S)-442001
Mob:902295108l
Email:m.zubair.mau@gmail.com

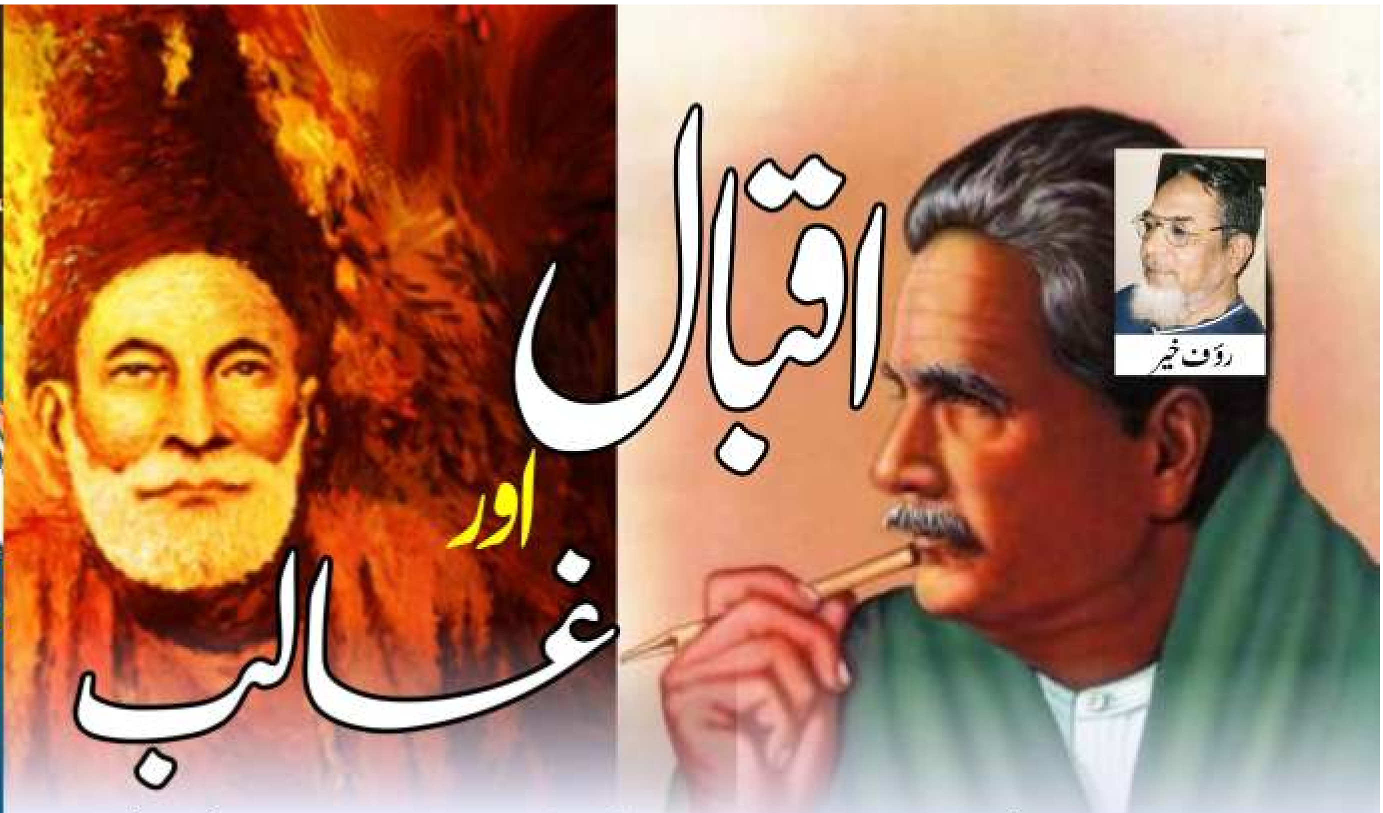

اقبال اور غالب

رؤف خیر

علامہ اقبال کے قریبی دوست سرشیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا مدیر مخزن نے اقبال کے پہلے اردو مجموعۂ کلام 'بانگ درا' کے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے:

''غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو و فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیال کوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔''

(کلیات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ایڈیشن دوم 1976)

غالب اور اقبال دونوں اپنی فارسی شاعری پر نازاں تھے۔ غالب نے کہا تھا کہ میری اردو شاعری تو بے رنگ ہے میرا اصل رنگ دیکھنا ہو تو میری فارسی شاعری پڑھو۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

اسی طرح اقبال بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ ''اگر ہو شوق تو فرصت میں پڑھ 'زبور عجم' ظاہر ہے زبور عجم اقبال کا ایسا فارسی مجموعہ ہے جس پر اقبال بھی نازاں ہیں۔

اقبال اور غالب میں اشتراک کے کئی پہلو اور کئی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ دونوں اردو اور فارسی کے منفرد بے نظیر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں شاعروں کو تصوف سے بھی علاقہ رہا ہے۔

فکر و فن کے اعتبار سے بھی غالب روایتی اسلوب کے بجائے عصری و جدید طرزِ فکر کے قائل تھے چنانچہ سرسید احمد خان کی مرتبہ 'آئین اکبری' پر غالب کی رائے گواہ ہے۔ اسی جدید لب و لہجہ کی وجہ سے غالب روایت پرستوں کو کھل گئے۔ غالب کو کہنا پڑا۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

علامہ اقبال بھی اپنے دور کے جدید ترین شاعر ہیں جو ماضی پرستی سے نالاں اور حرکی تصور کے مبلغ ہیں۔ انھوں نے شاہین اور مردِ مومن کی صفات بیان کر کے نیک و بد کی تمیز سکھائی اور جد و جہد سے آشنا کیا۔

غالب نے کئی امرا کے قصیدے لکھے بلکہ ایک ہی قصیدہ کو نام بدل کر دوسرے نواب کو پیش کیا تا کہ اس سے کچھ مالی فائدہ ہو جائے۔ اسی طرح انگریزوں کی شان میں بھی قصیدے لکھے تا کہ اس کی جاگیر اور وظیفہ بحال ہو جائے۔

اقبال نے بھی فرماں روائے بھوپال اور حیدرآباد کے مہاراجہ کشن پرشاد اور حضور نظام سابع میر عثمان علی خان کی شان میں قصیدے لکھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ حیدرآباد میں ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر ان کا تقرر ہو جائے۔ اس قسم کی تگ و دو اگر دونوں شاعروں نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے طور پر کی ہے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض حرکت تھوڑی ہے۔ بڑے بڑے شاعروں ادیبوں نے درباروں میں رسائی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ تاریخ میں کئی مثالیں مل جائیں گی۔

اقبال مرزا غالب کی بڑائی کے دل سے قائل تھے چنانچہ انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک نظم 'مرزا غالب' ستمبر 1901 میں لکھی جو سرشیخ عبدالقادر کے رسالہ 'مخزن' میں شائع ہوئی۔ اقبال کی ابتدائی نظمیں مسدس کی ہیئت (فارم) میں ہیں۔ یہ نظم بھی پانچ بندوں کی مسدس پر مشتمل ہے اور غالب کے تئیں اقبال کی عقیدت کا مظہر ہے۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے سے اقبال کو بڑی انسیت رہی ہے۔ گوئٹے کا دیوان مغرب West Osticher Divan آج سے دو سو سال پہلے 1819 میں منظر عام پر آیا، جس کے جواب میں علامہ اقبال نے تقریباً ایک سو سال بعد 'پیام مشرق' پیش کیا۔ غالب کی فکر کے ڈانڈے بھی اقبال اپنے پسندیدہ شاعر گوئٹے سے ملاتے ہوئے مرزا غالب کی تعریف اگلے بند میں اس طرح کرتے ہیں۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ، دلی گلِ شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

ویمر وہ مقام ہے جہاں یہ جرمن شاعر گوئٹے مدفون ہے۔

اقبال نے غالب کی انفرادیت بتاتے ہوئے کہا کہ "لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں"۔ اس بند کے آخری شعر میں غالب کی بڑائی یوں بیان کی۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے

مسدس کے آخری بند میں دلی سے خطاب کرتے ہوئے یہ احساس کراتے ہیں کہ کیسا نابغہء روزگار اس کی خاک میں آسودہ ہے ہر چند کہ دلی کئی بے مثالوں کا مقتل و مدفن ہے۔ مگر پوچھتے ہیں۔

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبال نے زبان بھی وہ استعمال کی جو غالب کے شایانِ شان ہے اور خود علامہ اقبال کی خلاقی و صناعی بھی ایک ایک مصرعے سے بولتی ہے۔ گویا ممدوح و مداح دونوں ہم پلہ دکھائی دیتے ہیں۔ غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح نے بھی غالب کے آسودۂ خاک ہونے پر کہا تھا 'گنج معانی ہے تہ خاک' جس سے غالب کی تاریخ وفات 1285ھ برآمد ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے شاہ کار 'جاوید نامہ' میں بھی غالب سے اپنے دلی لگاؤ کا ثبوت دیا ہے۔ فلکِ مشتری پر اقبال بہ صورتِ زندہ رود تین بے مثال شخصیتوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج، جس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا، جس کی پاداش میں اُسے 309 ہجری میں قتل کر دیا گیا مگر صوفیہ اور شعرا کے پاس وہ حق گوئی کا علم بردار ہیرو ہے۔ دوسری شخصیت قرۃ العین طاہرہ تھی۔ سید علی محمد باب (1821-1850) کی پیغمبری پر ایمان لاکر اس نے بابی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ وہ اس قدر راشد تھی کہ 1852 میں اس نے قتل ہونا گوارا کیا مگر بابی مذہب سے روگردانی گوارا نہ کی۔ تیسری شخصیت مرزا اسد اللہ خان غالب (1797-1869) کی ہے۔ اقبال کو ان تینوں سے عقیدت رہی ہے۔ اقبال تو اپنے آپ کو حلاج کا جانشین تک سمجھتے ہیں کہ خودی کا فلسفہ آشکار کیا جو منصور حلاج کے نعرے ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اسی لیے منصور حلاج اقبال کو چوکنا کرتا ہے۔

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس
محشرے برمردہ آور دی بترس

میں نے جو کیا ہے وہ تم بھی (قوم و ملت کو) بیدار کرنے کے لیے کر رہے ہو مگر ذرا چوکنا رہو کہ کہیں تمھارا بھی وہی حشر نہ ہو جو میرا ہوا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ ہے۔ علامہ اقبال فلکِ مشتری پر غالب سے اس کے ایک گنجلک شعر کا مطلب پوچھتے ہیں۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

پھر غالب اپنے اس شعر کی تشریح فرماتے ہیں جو گنجلک ہے۔

اس شعر کا مطلب غالب کے شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی نے خود غالب سے پوچھا تھا تو غالب نے صراحت فرمائی تھی۔ ملاحظہ ہو یادگار غالب صفحہ 103 حالی لکھتے ہیں:

"(غالب نے) فرمایا اے کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں۔ ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔"

'جاوید نامہ' میں مرزا غالب کی شمولیت ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی معرکہ آرا کتاب 'تقویۃ الایمان' میں لکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ علیٰ کل شیء قدیر۔ ایسی کئی دنیائیں، ایسے کروڑوں اولیا انبیا بنا سکتا ہے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کو اس پر اعتراض تھا۔ 1820 میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے مابین ایک مناظرہ ہوا جس کا موضوع تھا: "آیا اللہ تعالیٰ آں حضرت محمدؐ کی نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں"

مولانا فضل حق کا موقف تھا کہ "بالکل نہیں" جب کہ اسمٰعیل شہیدؒ فرماتے تھے "قادر ہے ضرور مگر پیدا نہیں کرے گا"

فضل حق خیرآبادی مرزا غالب کے قریبی دوست تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ غالب بھی اس معاملے میں ان کی تائید کریں۔ غالب نے امتناع نظیر کے موضوع پر ایک مثنوی ضرور لکھی مگر اس میں ایک شعر ایسا رکھ دیا جس سے شاہ اسمٰعیل شہید کی تائید ہوتی تھی اور جو فضل حق کے موقف کے خلاف پڑتا تھا۔

(مخفی مباد اس سے پہلے بھی مولانا فضل حق خیرآبادی جہاد کے معاملے میں بھی شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کی تائید میں مومن خان مومن کی لکھی 'مثنوی جہاد' کا رد غالب سے کروانا چاہتے تھے مگر غالب نے انکار کر دیا تھا)

'جاوید نامہ' میں امتناع نظیر کے فلسفیانہ موضوع پر اقبال مرزا غالب سے سوال کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ سیکڑوں جہاں پیدا کرے تو کیا ہر جہاں کے اولیا و انبیا الگ الگ ہوں گے؟ اس پر غالب اپنی مثنوی کے دو شعر سناتے ہیں جن سے امتناع نظیر کے مسئلے پر روشنی پڑتی ہے۔

نیک بنگر اندریں بود و نبود　　پے بہ پے آید جہاں ہا در وجود
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمۃ للعالمینے ہم بود

(بہت غور سے وجود و عدم پر نظر ڈالی جائے تو دیکھو گے کہ مسلسل کئی جہاں عالم وجود میں آرہے ہیں جہاں کہیں ہنگامۂ عالم ہوگا وہیں 'رحمۃ للعلمین' بھی ہوں گے)

اقبال چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر غالب کھل کر گفتگو کریں۔ تاکہ ان کی فہم نارسا اُسے پا سکے۔ اس لیے کہتے ہیں۔

فاش تر گو زانکہ فہمم نارسا ست

مگر غالب جواب دیتے ہیں کہ اسے فاش کرنا خطا ہے: "ایں سخن را فاش ترگفتن خطاست"

زندہ رود کے 'سوزِ طلب' کے اصرار پر غالب کہتے ہیں۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینے انتہا ست

زندہ رود مزید تشریح چاہتا ہے کہ "من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز"۔

ابھی بھی معنی کھل نہیں پا رہے ہیں۔ تو غالب جواب دیتے ہیں۔

اے چوں من بینندۂ اسرارِ شعر
ایں سخن افزوں تر است از تارِ شعر
شاعراں بزمِ سخن آرا ستند
ایں کلیماں بے یدِ بیضا ستند
آنچہ تو از من بخواہی کافریست
کافری کو ماورائے شاعریست

(یعنی میری طرح تو بھی اسرار شعر کا متلاشی ہے۔ یہ تار شعر پر اور سُر دیتا ہے شعرائے کرام محفل شعر تو برپا کرتے ہیں مگر یہ لوگ 'بے ید بیضا' ہیں۔ تو مجھ سے کافری چاہتا ہے اور کافری کہاں ماورائے شاعری ہے)۔

اس طرح 'جاوید نامہ' میں اقبال و غالب کے مابین مکالمہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad 500008.
Cell : 9440945645
Email : raoofkhair@gmail.com

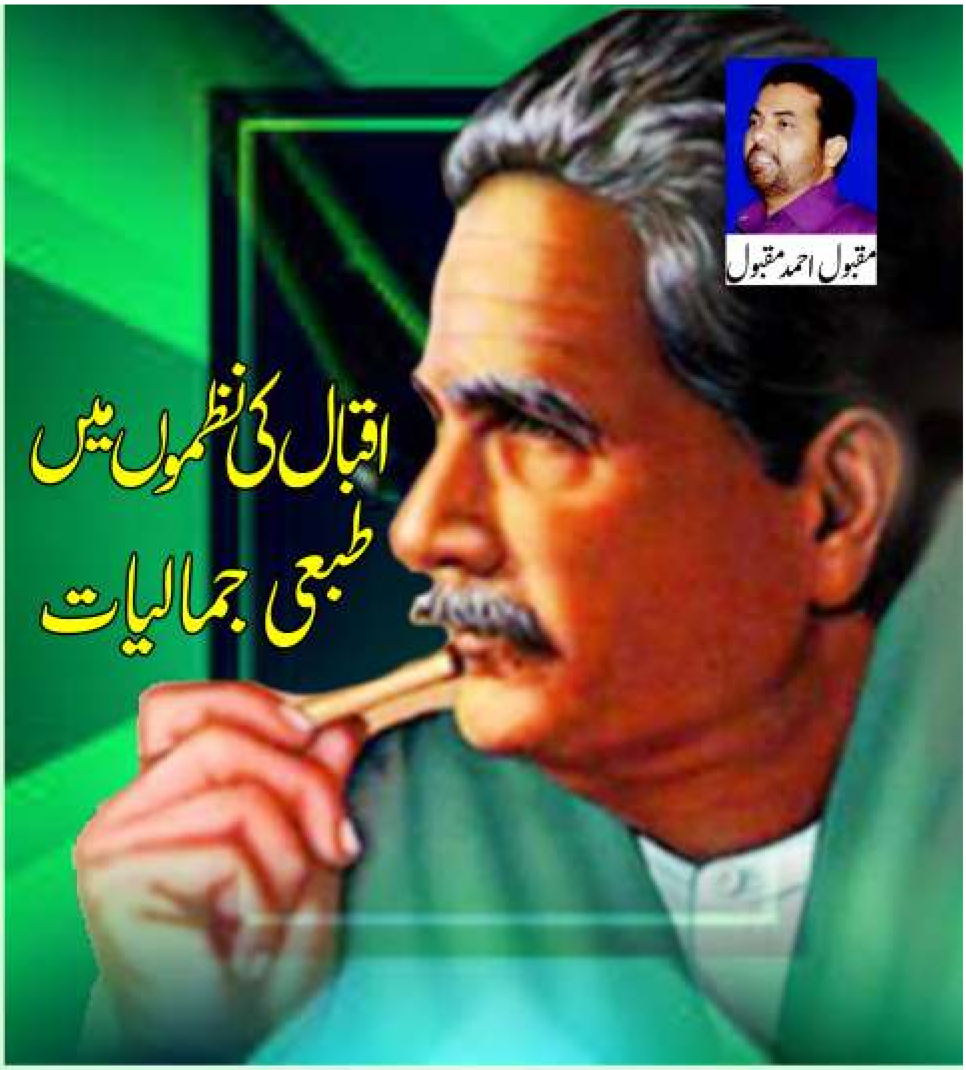

اقبال کی نظموں میں طبعی جمالیات

مقبول احمد مقبول

اردو شاعری کی تاریخ میں بے شمار شعرا گزرے ہیں۔ بلا شبہ ان تمام شاعروں نے اپنے اپنے مبلغِ علم و فکر کے اعتبار سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے۔ ان شاعروں میں کم کم ہی سہی ایسے شعرا بھی گزرے ہیں جو اپنے منفرد اسلوب اور اچھوتے مضامین اور خیالات کی وجہ سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں لیکن جب ہم ان شاعروں میں ایسے شعرا کی تلاش کرتے ہیں جنھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت، علمی بصیرت، اعلیٰ درجے کی سیاسی و سماجی سوجھ بوجھ، دینی شعور، ملّی و قومی درد، فلسفے اور دانشوری سے فکر و نظر کے چراغ روشن کیے ہوں اور اپنی شاعری سے پیغمبری کا کام لیا ہو، تو ہماری نظر صرف اقبال پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اقبال ہی واحد شاعر ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے پیغمبرانہ کام لیا ہے۔

اقبال کی شاعری پیامی ضرور ہے لیکن یہ پیام شعر و فن کے پردے میں دیا گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کی شاعری نری پیامی شاعری نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں شعر و فن کے تمام تقاضوں کی تکمیل بھی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ زبان کے حسن، تشبیہات، استعارات، تلمیحات، علامات، رمز و کنایہ اور دیگر شعری صنعتوں کے فن کارانہ استعمال کے اعتبار سے بھی ان کا کلام نہایت شاندار اور جاندار ہے۔ فنی حسن کے حوالے سے پنجاب کے اقبال کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے کسی بھی بڑے سے بڑے استاد شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

طبعی جمالیات یا حسنِ فطرت کی مصوری کے حوالے سے جوش اور انیس کا نام زیادہ لیا جاتا ہے۔ جوش کو تو شاعرِ فطرت قرار دیا گیا ہے۔ فطرت نگاری کے تناظر میں جب ہم اقبال کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ فطرت کی مصوری میں اقبال کا موئے قلم بھی جوش یا انیس سے کسی طرح کم نہیں۔ محاکات نگاری میں اقبال کو بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ لفظوں کے ذریعے کسی واقعے یا منظر کی ایسی بہترین تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔

اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں حسنِ فطرت کے ایسے ایسے مرقعے کھینچے ہیں کہ ان کا اعتراف نہ کرنا اور ان کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔ فطرت کے نظارے بجائے خود حسین ہوتے ہیں، اور جب یہ نظارے کسی فسوں کار شاعر کے قلم سے بیان ہوتے ہیں تو ان میں ایک عجیب طرح کا 'حسنِ سحر کار' پیدا ہوتا ہے جو باذوق قارئین کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے؛ اور وہ لفظوں کے ذریعے کھینچے گئے ان حسین مرقعوں سے جمالیاتی تلذذ حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کی ایسی کئی نظمیں ہیں جن میں حسنِ فطرت کی مصوری کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً: ہمالہ، ایک آرزو، بزمِ انجم، انسان اور بزمِ قدرت، جگنو، ابرِ کہسار، گلِ رنگیں، ایک شام، عشق اور موت، خضرِ راہ (پہلا بند) ساقی نامہ (پہلا بند) وغیرہ۔

نظم 'ہمالہ' اقبال کی ایسی نظم ہے جس میں جلال و جمال کا حسنِ امتزاج نظر آتا ہے۔ اس نظم سے دو بند ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے بند میں اقبال نے پہاڑ کی بلندی سے آتی ہوئی ندی کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

اقبال نے کہا ہے کہ فرازِ کوہ سے جو ندی گاتی ہوئی آرہی ہے اس کا پانی اس قدر صاف و شفاف ہے کہ اس کے سامنے کوثر و تسنیم کی موجیں بھی شرماتی ہیں۔ کوثر اور تسنیم جنت کی دو نہروں کے نام ہیں۔ یہ پانی اس قدر صاف اور شفاف ہے گویا آئینہ ہے جس میں اس کے اطراف و اکناف کی چیزوں کا عکس نظر آرہا ہے۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے اقبال نے "شاہدِ قدرت کو آئنہ دکھاتی ہے" سے تعبیر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ ندی رستے کے پتھروں سے کبھی بچتی ہوئی اور کبھی ٹکراتی ہوئی آرہی ہے۔ پہاڑی ندیوں کے بہنے سے ایک طرح کا ترنم پھوٹتا ہے۔ اس لیے اقبال ندی کو گویا اور موسیقی کار تصور کر کے اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اے ندی! تیری طرح میرا دل بھی نغموں سے معمور ہے۔ اس طرح میں بھی تیرا ہمراز و ہمدم ہوں۔ تو میرے دل کے ساز کو بھی چھیڑتی جا۔ اقبال نے اپنے دل کو ساز سے تعبیر کیا ہے۔ پھر اسے "عراقِ دلنشین کہا ہے 'عراق' ایک موسیقی کا نام ہے یعنی میرے دل کے ساز میں پوشیدہ موسیقی کو بھی انگیز کر۔ اگر اس بند کو توجہ سے پڑھا جائے تو ہماری نظروں کے سامنے بل کھاتی ہوئی پہاڑی ندی کا مکمل منظر گھوم جاتا ہے۔

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اس بند میں شام کے پُر کیف منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کہا ہے کہ جب لیلائے شب اپنی زلفِ رسا کھولتی ہے۔ یعنی جب سورج ڈھلتا ہے اور تاریکیوں کے سائے بڑھتے جاتے ہیں تو اس وقت آبشاروں کی مترنم صدا کچھ اور بھی پُر کیف ہو جاتی ہے۔ شام کی خموشی اس قدر دل فریب ہے کہ اس پر گفتگو بھی قربان ہو جائے۔ درختوں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھڑے ہیں۔ شفق کی لالی کو دیکھ کر اقبال کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کسی نے کہسار کے چہرے پر غازہ لگا دیا ہے جس سے کہسار مزید حسین معلوم ہو رہا ہے۔

نظم 'ایک آرزو' میں اقبال نے ہنگامہ ہائے دنیا سے دور کسی پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹے جھونپڑے میں بے فکر زندگی گزارنے کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ اس پہاڑی دامن کا منظر کیسا ہونا چاہیے؟ اقبال کی زبانی ملاحظہ کریں۔

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

پہاڑ کا دامن ہو۔ ہر طرف چڑیوں کے چہچہے ہوں۔ چشمے کا ساز بج رہا ہو۔ ندی کے کنارے ہرے ہرے پودے صف باندھے کھڑے ہوں۔ ندی کا صاف پانی ایسا ہو گویا آئینہ۔ کہسار کے دلفریب نظارے کو دیکھنے کے لیے ندی کا پانی موج بن کر اوپر اٹھ رہا ہو۔ زمین کی آغوش میں سبزہ ہو اور جھاڑیوں میں پانی پھر رہا ہو جس میں چمک ہو۔ ندی کے پانی میں کسی گل کی ٹہنی اس طرح جھک رہی ہو جیسے کوئی حسین آئینہ دیکھتا ہو۔ غروب آفتاب کے حسین منظر کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ سورج شام کی دلہن کو مہندی لگا رہا ہو، اور ہر پھول کی قبا سنہری ہو۔ جیسے جیسے قاری یہ اشعار پڑھتا جائے گا ویسے ویسے یہ حسین اور دلکش منظر اس کی نظروں کے سامنے ابھرتا چلا جائے گا۔ محاکات کی اس سے بڑھ کر اور بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے۔ تمام اشعار حرکیاتی کیفیت سے معمور ہیں۔ پڑھنے والا یوں محسوس کرے گا گویا وہ اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہا ہے۔ اقبال نے ان اشعار میں بھی حسنِ فطرت کی ہو بہو عکاسی کی ہے۔ جس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

نظم 'بزمِ انجم' کے ابتدائی تین شعر ملاحظہ کریں جن میں غروب آفتاب کی منظر کشی کی گئی ہے۔

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کے لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

غور کیجیے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ شام کالی ہوتی ہے۔ اس لیے شاعر نے اسے 'شامِ سیہ قبا' کہا ہے۔ آسمان کے کناروں پر جو رنگِ شفق پھیلا ہے وہ شاعر کے نزدیک گلہائے لالہ کا طشت ہے۔ شاعر نے دن کے اجالے یا سورج کی روشنی کو چاندی کے گہنوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چاندی کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ شفق میں لالی کے ساتھ ساتھ سنہرا رنگ بھی ہوتا ہے اس لیے اسے سونے کا زیور کہا ہے۔ آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو عروسِ شب یعنی رات کی دلہن کے موتی کہا ہے۔ ان تین اشعار میں اقبال نے غروب آفتاب کے منظر کو ایسے حسین اور دلکش استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعے بیان کیا ہے کہ طبیعت بے ساختہ جھومنے لگتی ہے۔ اور زبان سے صدائے مرحبا نکلتی ہے۔

نظم 'ایک شام' میں اقبال نے دریائے نیکر (ہائڈل برگ، جرمنی) کے کنارے کی ایک پُر سکوت شام کا منظر بیان کیا ہے۔ اقبال کا کمالِ فن دیکھیے کہ انھوں نے اس نظم میں جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں اس کے ہر لفظ سے سکوت ہی سکوت ظاہر ہو رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش شجر کی
وادی کے نوافروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت مراقبے میں ہے گویا

مکمل خاموشی اور سکوت کی ترجمانی کے لیے 'قدرت کو مراقبے میں ہے' سے تعبیر کرنا کس قدر بلیغ انداز

بیان ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چاند کی چاندنی خاموش ہے۔ تمام درخت ساکت و صامت کھڑے ہوئے ہیں۔ وادی کے نوافروش یعنی طائرانِ خوش نوا بھی خاموش ہیں۔ فطرت بے ہوش ہو کر شب کی آغوش میں سو چکی ہے۔ تاروں کا قافلہ بھی خاموش اور بے درا ہے۔ یعنی وہاں بھی کوئی حرکت نہیں۔ گویا ساری کائنات بے ہوش اور مدہوش ہے۔ اس نظم میں ایسی کیفیت ہے کہ نظم پڑھنے سے قاری پر ایک غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ طبعی جمالیات کی ایسی تصویر کشی کیا قابل داد و تحسین نہیں؟ ایک اعلیٰ درجے کا فطرت نگار شاعر ہی حسنِ فطرت کی ایسی لفظی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

نظم 'خضرِ راہ' کے پہلے بند کے یہ ابتدائی اشعار بھی دیکھیں جن میں سکوتِ دریا کی کس قدر بہترین مرقع کشی کی گئی ہے۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

دریا کے سکوت کو تصویرِ آب سے تعبیر کرنا، موجوں کی خاموشی کو گہوارے میں سوئے ہوئے طفلِ شیر خوار کی خاموشی سے تشبیہ دینا فن کارانہ حسن کی بہترین مثال ہے۔ ان اشعار سے دریا کے سکوت کی تصویر بخوبی نمایاں ہوتی ہے۔

'ساقی نامہ' اقبال کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم غیر معمولی سلاست و روانی، اور صوری و معنوی

حسن کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس نظم کے پہلے بند میں اقبال نے موسمِ بہار کی منظر کشی کی ہے۔ یہاں بھی اقبال جمال پرست شاعر اور بہترین مصورِ فطرت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ موسمِ بہار ہے، پہاڑ کے دامن میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں جن سے دامن کوہسار باغ ارم بن گیا ہے۔ ہواؤں میں ایسا کیف اور سرور ہے کہ پرندے اس کیف وسرور سے سرشار ہیں اور اپنے آشیانوں میں ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان پُر کیف ہواؤں سے سرشار ہو کر وہ اپنے نغموں سے فضاؤں کو اور بھی کیف آگیں بنا رہے ہیں۔ پہاڑی ندی اچکتی، لچکتی، اٹکتی، سرکتی اور بل کھاتی ہوئی بہتی چلی جا رہی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں طرح طرح کے پھول، پرندوں کی نغمہ زنی پُر کیف ہوائیں، ندی کا بل کھاتے ہوے بہنا۔ اقبال نے ان تمام مناظر کی ایسی دل نشین تصویر کھینچی ہے کہ اس بند کو بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ مصرعوں کی ترنم خیزی ایک الگ جادو جگاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار　　ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن　　شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں　　لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سُرور　　ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی　　اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
سرکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ　　پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

نظم 'جگنو' اقبال کے پروازِ تخیل اور زبردست قوتِ متخیلہ کی دلیل ہے۔ رات ہے اور چمن میں جگنو اڑ رہا ہے۔ جگنو کو کس نے نہیں دیکھا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہر کسی نے دیکھا ہوگا اور بیسیوں بار دیکھا ہوگا۔ لیکن جب اقبال اس جگنو کو دیکھتے ہیں تو ان کا پروازِ تخیل کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے ملاحظہ کریں۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

چمن میں جگنو کی چمک اور روشنی کو دیکھ کر شاعر پر ایک عجیب سحر طاری ہے۔ وہ اس ننھے سے کیڑے کی روشنی سے ایسا متاثر ہے کہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیا نام دے۔ کہتا ہے کہ چمن میں جگنو چمک رہا ہے یا بزمِ گلستاں میں کوئی شمع جل رہی ہے۔ آسمان سے کوئی ستارہ چمن میں آگیا ہے یا چاند کی کرن میں زندگی پیدا ہو چکی ہے۔ رات کی حکومت میں کوئی دن کا سفیر آیا ہے جو اپنے وطن میں تو گمنام تھا لیکن مسافرت کی حالت میں چمکنے لگا ہے۔ چاند کی پوشاک سے کوئی چمکتا ہوا تکمہ گرا ہے یا سورج کے لباس میں کوئی ذرہ چمک رہا ہے۔ کیا یہ حسنِ ازل (خدا کے حسن) کی ایک پوشیدہ جھلک تھی جسے قدرت نے عالمِ بالا کی خلوت سے دنیا کی جلوت میں لے آئی ہے۔ آخر یہ چمکتا ہوا ننھا سا کیڑا کیا ہے؟ پھر شاعر نے اسے ایک چھوٹا سا چاند کہا ہے جس میں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی۔ کبھی یہ چاند گہن میں آجاتا ہے تو کبھی گہن سے باہر نکل جاتا ہے۔ یعنی جب جگنو اپنی دم کو بازوؤں میں چھپا لیتا ہے تو ظلمت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جب اڑنے لگتا ہے تو سراپا نور بن جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ یوں تو پروانہ اور جگنو دونوں ہی چھوٹے سے پتنگے ہیں لیکن قدرت کی کاریگری اور شان دیکھیے کہ پروانہ روشنی کا طالب ہوتا ہے جب کہ جگنو سراپا روشنی ہے۔

'عشق اور موت' انگریزی کے ملک الشعرا ٹینی سن سے ماخوذ دلچسپ اور خوبصورت نظم ہے۔ اس میں اقبال نے تخلیقِ کائنات کی ابتدا کا ایک خیالی منظر پیش کیا ہے۔ یہاں اقبال نے چشمِ تصور سے کام لے کر ایک منظرِ تخلیق کیا ہے جو سراسر حرکیاتی ہے۔ جدھر نظر ڈالیں ادھر کچھ نہ کچھ سرگرمی جاری ہے۔ گویا ایک پراسیس ہے جو مسلسل جاری ہے۔

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی
تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا
عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے
ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے
کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گل کو پہلے پہل آرہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو
خودی تشنہ کام مے بے خودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی
زمیں کا تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لا مکاں ہوں

یہاں اقبال نے اپنے غیر معمولی پروازِ تخیل سے کام لے کر ابتدائے آفرینش کا ایسا جمال پرور نقشہ کھینچا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کی ابتدا میں ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا۔ ابتدائے آفرینش کا سہانا منظر ہے۔ تبسم فشاں زندگی کی کلی ہے۔ یعنی دنیا میں زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ مہر کو تاجِ زر مل رہا ہے۔ یعنی سورج کو روشنی دی جا رہی ہے۔ چاند کو چاندنی عطا ہو رہی ہے۔ شام کو سیہ رنگ کا لباس پہنایا جا رہا ہے تو ستاروں کو چمکنے دمکنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یعنی رات اور دن کا نظام قائم کیا جا رہا ہے۔ کہیں شاخِ ہستی میں پتے لگ رہے ہیں۔ یعنی دنیا میں مختلف چیزیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ فرشتے شبنم کو رونا سکھا رہے ہیں تو کہیں پھولوں کو ہنسنا سکھایا جا رہا ہے۔ گویا کارکنانِ قضا و قدر نظامِ کائنات قائم کرنے میں مصروف ہیں۔ کالی کالی گھٹاؤں کو شاعر نے حور کی چوٹی سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ کہیں حور اپنی چوٹی کھولے ہوئے کھڑی تھی۔ یہ تمام مناظر وہ ہیں جسے شاعر نے کبھی دیکھا نہیں۔ اَن دیکھے واقعے یا منظر کو اپنے زورِ تخیل کے سہارے تخلیق کرنا کمالِ فنکاری نہیں تو اور کیا ہے۔ اس بند کا اگر غور سے مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے ایک فلم چل رہی ہے اور ہم یہ تمام مناظر بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔ ایسے دلکش و دلفریب خیالی منظر پر ہزار ہا واقعات قربان۔

مختصر یہ کہ اقبال کی نظمیں فکر و فلسفہ، پیغامِ ہدایت، گہری بصیرت، درسِ اخوت اور نکتہ ہائے دقیق ہی کی حامل نہیں بلکہ ان کی نظموں میں وہ تمام فنی نزاکتیں، شعری حسن لطافت و پاکیزگی اور زیبائی و رعنائی بھی ہے جو اعلیٰ درجے کی شاعری کے اجزائے لازمہ سمجھے جاتے ہیں۔ حسنِ فطرت کی مصوری کے اعتبار سے بھی اقبال کی نظمیں بے مثال اور انتہائی حسین ہیں۔

■

Dr. Maqbool Ahmed Maqbol
Associate Professor,Dept of Urdu,
Maharashtra Udayagiri College
UDGIR-413517,Disti Latur(M.S)
Mob:09028598414
Email:maqboolahmedmaqbool@gmail.com

اطہر حسین

ادب وصحافت کی باکمال شخصیت جمیل مہدی

اردو کے وہ صحافی جنھوں نے قوم وملت کے لیے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر رکھا تھا ان میں ایک نام جمیل مہدی کا بھی ہے۔ جمیل مہدی کا تعلق دیو بند سے تھا۔ انھوں نے وہاں سے کسب فیض کرنے کے بعد لکھنؤ کو اپنی عملی زندگی کے لیے منتخب کیا۔ ایک عرصے تک یہاں لوح وقلم کی پرورش کرتے رہے۔ لکھنؤ کی ادبی وتہذیبی زندگی کو قریب سے دیکھا، شہر نگاراں کی بھری پڑی زندگی ان کو مہمیز تو کرتی رہی لیکن ایک عرصے تک صحافت کے بے لوث خادم کی طرح انھوں نے خود کو دنیاوی آلائشوں سے محفوظ رکھا۔ یہیں انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں، ادب وصحافت کی معتبر شخصیات کو قریب سے دیکھا اور ان سے قلم وکتاب کے رشتے کو سیکھا۔

دیو بند کی سرزمین مذہب وتہذیب کے تناظر میں عالمی شناخت کی حامل ہے۔ وہاں کی مٹی میں علم وادب کی خوشبو ہے۔ جس خوشبو سے انھوں نے خود کو معطر کر رکھا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو بچپن سے تھا۔ قومی اور ملی مسائل پر ان کا قلم خوب چلتا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کتابوں کے ساتھ ساتھ دیو بند میں چلتے پھرتے سیکھ رکھی تھی۔ مسلمانوں کے سماجی اور ثقافتی معاملات اور پس منظر سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ زندگی کے ان ابتدائی نقوش نے انھیں عملی زندگی میں کافی فائدہ پہنچایا۔ اخذ نتائج اور حالات کے تجزیے میں مذہبی اور تاریخی تناظر کی گہری واقفیت نے ان کے قلم کو کبھی بھٹکنے نہیں دیا۔ حالانکہ ان کو یہ احساس تھا کہ انھیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع بہت کم ملے ہیں اور جو کچھ انھوں نے روایتی طریقہ تعلیم سے سیکھا ہے اس سے وہ بہت زیادہ مطمئن نہیں تھے لیکن ان کا یہی اضطراب ان کی علمی کارگزاریوں کا ایک اہم سبب بن گیا۔ جمیل مہدی کا تعلیمی سفر نہ کے برابر ہے انھوں نے روایتی تعلیم کے علاوہ کوئی ڈگری نہیں حاصل کی۔ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق، کتابوں کا مطالعہ اور قومی وملی مسائل پر قلم اٹھانا ان کا مشغلہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے سیاسی وسماجی پس منظر پر ان کی گہری نظر تھی، جس کے سبب بہت جلد ان کی تحریروں نے منفرد اسلوب کی حیثیت اختیار کرلی اپنے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"میری تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے، کیونکہ مڈل اور میٹرک اور عربی فارسی کی ابتدائی اور متوسط کتابوں کی تعلیم کو میں تعلیم نہیں مانتا، ویسے ساٹھ سال کے قریب میری طویل عمر میں ایک بھی موقع ایسا نہیں آیا کہ کسی نے میری رسمی تعلیم پوچھی ہو یا کوئی سرٹیفکیٹ طلب کیا ہو... میری زندگی کا سب سے بڑا تجربہ یہ ہے کہ علم کتابی نہیں ہوتا سماعی اور تجرباتی ہوتا ہے۔ مجھے مولانا سندھیؒ نے حجۃ اللہ البالغہ سبقا سبقا اس وقت پڑھانی شروع کی جب کہ میں عربی کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا، لیکن آگے چل کر کان میں پڑے ہوئے وہ تمام الفاظ نہ صرف روشن ہوئے بلکہ آگے کی راہ کے لیے مشعل ہدایت بھی ثابت ہوئے۔"

(پیش لفظ، افکار وعزائم، مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، میر اکادمی لکھنؤ 1989)

ان سطور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا قلم اپنے بارے میں کسی مصلحت یا مبالغے کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ زندگی کے ہنگاموں نے انھیں یہ فرصت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ لکھتے۔ عین ممکن ہے کہ ان کے نزدیک اس کی بہت زیادہ اہمیت نہ ہو۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے اور لوگوں کو بتانا بھی تاکہ بعد کی نسل یہ جان سکے کہ اس آباد خرابے میں کیسے کیسے لوگ گزرے ہیں اور انھوں نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اسی احساس کے پیش نظر یہ چند سطور رقم کی جارہی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ کہ جمیل مہدی کی شخصیت اور ان کے فن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

جمیل مہدی کی بنیادی حیثیت ایک معتبر صحافی کی ہے مگر انھوں نے متعدد مضامین اور خاکے بھی لکھے ہیں ان کے خاکوں میں "مولانا آزاد کی یاد میں، شکیل بدایونی، روش صدیقی بھی چلے گئے، مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر فریدی، مقبول احمد لاری، عرب دنیا بے چراغ ہوگئی اور ایک ہاتھ کا آدمی" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام خاکے اپنی تمام تر صفات کے ساتھ خاکوں کے لوازمات پر کھرے اترتے ہیں۔ 'ایک ہاتھ کا آدمی' جمیل مہدی کے بھائی عقیل مہدی کا خاکہ ہے جو جذباتی اور تاثراتی نوعیت کا خاکہ ہے۔ انھوں نے اس نفاست سے لکھا ہے کہ بھائی عقیل مہدی کی شخصیت، سیرت، خوبیاں خامیاں غرض زندگی کے ہر پہلو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ اپنے بھائی عقیل مہدی کے متعلق لکھتے ہیں:

"کیسا عجیب آدمی تھا، کتنا بہادر، کتنا شریف، کتنا باہمت، کیسا متحمل مزاج، منکسر اور صلح کل انسان تھا۔ کیسا سعادت مند بیٹا، کیسا فرماں بردار بھائی، کیسا وفا شعار شوہر، کیسا شفیق باپ اور کیسا وفادار دوست۔ ایک ایک بات یاد آتی ہے، ایک ایک نشتر چبھتا ہے۔ چالیس برس وہ طویل زندگی جس کے ایک ایک دن پر اس کی رفاقت کے نقوش ثبت ہیں سامنے آتی ہے تو ہر چیز بے معنی اور اپنا وجود بے مصرف دکھائی دینے لگتا ہے۔

(افکار وعزائم، مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، 1989 ص 504)

جمیل مہدی نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز رسالہ 'شاعر' سے کیا۔ یہ رسالہ ممبئی سے نکلتا تھا اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کا شمار اردو کے اہم ادبی رسائل میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ممبئی ہی سے نکلنے والے روزنامہ 'جمہوریت' کی بھی ادارت سنبھالی۔ روزنامہ 'ہندوستان' اور روزنامہ 'خلافت' میں بھی اداریے لکھے۔ ان کے بھائی عقیل جو خود بڑے پایے کے شاعر تھے اور ایک سہ روزہ اخبار 'مرکز' نکالتے تھے، جس سے جمیل مہدی بھی وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ سہارنپور سے 'بیباک' اور دیگر بڑے رسائل واخبارات سے منسلک رہے اور خدمات انجام دیتے رہے۔

جمیل مہدی کا مطالعہ وسیع نظر عمیق اور حافظہ بہت قوی تھا۔ پرانی سے پرانی خبریں تفصیل کے ساتھ یاد ہوتی تھیں۔ ان سب کے پیچھے ان کی لگن اور کڑی محنت تھی۔ جمیل مہدی حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی مسلسل

سفارش پر لکھنؤ آئے اور 'قائد' اور 'ندائے ملت' کی ذمے داری سنبھالی۔ 1968 میں عزائم نکالا جو دس سال تک ہفت روزہ رہا پھر عزائم کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے روزنامہ کردیا گیا۔ یہی اخبار آگے چل کر جمیل مہدی کی شہرت اور شناخت کا سبب بنا۔ نسیم اختر شاہ قیصر جمیل مہدی کی شخصیت کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جمیل مہدی صاحب اردو کے دور حاضر کے صف اول کے صحافی ہیں ان کے مضامین میں غیر معمولی علمی، ادبی، تہذیبی، اور معلوماتی خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی بات بلند نظری، وسیع المشربی، حقائق پسندی اور بین الاقوامی معاملات کی پرکھ ہے جس نے ان کی صحافت کو عام اردو صحافت سے بہت بلند بہت کارآمد اور معیاری بنادیا ہے۔''

(نسیم اختر شاہ قیصر، میرے عہد کے لوگ، ازہر اکیڈمی شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند، 2005 ص 176)

جمیل مہدی عاجزی وانکساری کے پیکر تھے بڑے حسن خوبی کے ساتھ اپنے اخباری فرائض کو انجام دیتے تھے۔ وہ خود اپنے صحافتی سفر کے متعلق لکھتے ہیں:

''مصنف بننے کی حرص، ستائش اور داد حاصل کرنے کا شوق، قابلیت اور صلاحیت کی سند اور اعتراف کی تگ ودو اور نمود ونمائش کا جذبہ کسی زمانے میں بھی، جوانی کے زمانے میں بھی جو اس طرح کی چیزوں کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے میرے نزدیک لائق توجہ نہیں رہا بلکہ افتادِ طبیعت اس کے اس درجہ خلاف رہی کہ تعریف وتوصیف کے مراسلوں تک کی اشاعت کبھی 'عزائم' میں مناسب نہیں سمجھی بلکہ وقتاً فوقتاً اس طرح کے مراسلوں پر پابندی کے فیصلے کا اعلان بھی کیا جاتا رہا ہے۔''

(نوائے خاموش، معصوم مرادآبادی، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، 2019 ص 135)

جمیل مہدی کے اداریوں کو اپنے عہد کی دستاویزی تاریخ قرار دیا جاسکتا ہے نیز یہ بھی کہ انھوں نے اپنے اداریوں سے اردو صحافت کی روایت کو فروغ اور اداریہ نویسی کو اعتبار بخشا۔ عزائم میں انھوں نے قومی، ملی، سیاسی اور دیگر موضوعات پر مسلسل اداریے لکھے جس کا ایک انتخاب ان کی زندگی ہی میں ڈاکٹر ذکی کاکوروی نے 'افکار وعزائم' کے نام سے شائع کیا۔ ان کے اداریوں میں جاذبیت، پختگی، عصری آگہی، سماجی بصیرت اور ایک طرح کی کشش نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی خوبی جمیل مہدی کا جارحانہ اسلوب اور جرأت مندانہ انداز تحریر ہے۔ وہ تلخ سے تلخ حقائق پر بھی قلم اٹھانے سے نہیں گھبراتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں کئی دفعہ بعض دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے عزائم میں اداریے لکھ کر قارئین کی ذہن سازی میں جو نمایاں رول ادا کیا ہے اس کی صدائیں آج بھی سنائی دیتی ہیں۔

مشہور افسانہ نگار رام لعل جمیل مہدی کے متعلق لکھتے ہیں:

''بطور صحافی جمیل مہدی کا مرتبہ میرے نزدیک مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی اور بعض دوسرے دانشوروں کے بعد خاصا اہم رہا ہے۔ جمیل مہدی صاحب کے بارے میں، میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ ایک چھوٹے اخبار کے بڑے ایڈیٹر تھے۔ لیکن بعض کم تعداد میں چھپنے والے اور ظاہری شان وشکوہ سے عاری اخبار بھی محض اپنے اداریوں کی وجہ سے اہم تصور کیے جاتے رہے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان اخبارات کی فائلیں عرصہ دراز تک مختلف کتب خانوں اور ذاتی لائبریریوں میں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔''

(جمیل مہدی کے اداریے، نیا دور، فروری۔ مارچ 1990)

لکھنؤ سے جمیل مہدی کی قربتوں کا سبب اردو اخبارات تھے۔ یہاں کے اہم اخباروں میں ندائے ملت بھی تھا جس کے مدیر حفیظ نعمانی تھے۔ اس اخبار کے تاریخ ساز نمبر 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر' کے سلسلے میں حفیظ نعمانی نے قید وبند کی صعوبتیں بھی اٹھائی تھیں، جس کی ایک الگ داستان ہے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ ان کی کتاب 'روداد قفس' میں کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ جمیل مہدی کی سوانح اور شخصیت کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ حفیظ نعمانی جو کہ ان کے دوست اور ساتھی تھے خود صحافت کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں وہ جمیل مہدی سے نہ صرف قریب تھے بلکہ ان سے خوب واقف تھے۔ حفیظ نعمانی نے ایک طویل خاکہ جمیل مہدی پر لکھا ہے اس سے جمیل مہدی کو باسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ حفیظ نعمانی کے بقول:

''مارچ 1962 میں جب ندائے ملت نکالنے کا فیصلہ کیا گیا تو قلمی معاونین کی جو فہرست بنی ان میں دیوبند سے ایک نام جمیل مہدی کا بھی تھا۔ دوسرا نام مولانا حامد اللہ انصاری غازی کا تھا۔ لیکن ان سے کچھ لکھوا کر بھیجنا جمیل بھائی کی ذمے داری تھی۔ اخبار نکلتا رہا جمیل بھائی کا مضمون مہینہ میں کم از کم ایک آجاتا تھا۔''

(بجھے دیوں کی قطار، مرتب محمد اویس سنبھلی، تنویر پریس لال باغ لکھنؤ، 2010 ص 105)

حفیظ نعمانی اور جمیل مہدی دونوں بنیادی طور پر قلم کے سپاہی تھے۔ انھوں نے آزادی کے فوراً بعد کے پرآشوب دور میں ملت کی رہنمائی کے لیے قلم کو وسیلہ اظہار بنایا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بے تکان اور مسلسل لکھا۔ اخبار نویسی ان کے یہاں ذریعہ معاش نہیں بلکہ ایک مشن اور نصب العین تھا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ نصب العین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دی جاسکتی ہے جو کہ انھوں نے دی بھی۔ جمیل مہدی کے بارے میں حفیظ نعمانی کی کتاب 'بجھے دیوں کی قطار' میں ایک خاکہ موجود ہے جس سے جمیل مہدی کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے کس قدر واقفیت ہوتی ہے۔ اس خاکے سے ان دونوں کی دوستی ہی نمایاں نہیں ہوتی بلکہ ان کی زندگی کے نشیب وفراز سامنے آتے ہیں۔ اس خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ صحافت اور صحافتی زندگی جمیل مہدی کی زندگی کا جزو لاینفک تھی۔ زندگی کے کڑے سے کڑے وقت میں بھی نصب العین سے گریز کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے پاس دو بجے دن میں والد ماجد کا فون آیا انھوں نے بتایا کہ بھائی جمیل کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے تم فوراً ان کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے بلوا سیہ جاکر دیکھا تو بیٹھے ہوئے اداریہ لکھ رہے تھے۔ میرے ساتھ چند باتیں ہوئیں، میں نے معلوم کیا کہ کیا پروگرام بنایا؟ کہنے لگے دہرہ شام کو سات بجے جاتی ہے اس وقت تک رونے سے بہتر یہ ہے کہ دو چار اداریے لکھ دوں باقی تم کرلینا، نہ معلوم کب واپسی ہو یا ہو بھی نہ۔''

(بجھے دیوں کی قطار، مرتب محمد اویس سنبھلی، تنویر پریس لال باغ لکھنؤ، 2010 ص 116,117)

مذکورہ اقتباس سے جمیل مہدی کی شخصیت، محنت، لگن اور فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ والد کے وصال کی خبر موصول ہوجانے کے باوجود اداریہ لکھنا نہ بھولے کہ کہیں عزائم کا کوئی شمارہ اداریے سے محروم نہ رہ جائے۔ ایسے فرض شناس صحافی کی ادبی خدمات کا اعتراف بہت ضروری ہے جس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اردو ادب و صحافت کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ انھوں نے اپنی صحافتی خدمات سے اردو صحافت کو جو فروغ اور اعتبار بخشا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ اردو کے صحافتی ادب کی جب بھی تاریخ مرتب کی جائے گی عزائم اور جمیل مہدی کے کارناموں کو ضرور یاد کیا جائے گا۔

حوالے:

1. افکار وعزائم، مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، میرا اکادمی لکھنؤ 1989
2. نسیم اختر شاہ قیصر، میرے عہد کے لوگ، ازہر اکیڈمی شاہ منزل محلہ خانقاہ
3. بجھے دیوں کی قطار، مرتب محمد اویس سنبھلی، تنویر پریس لال باغ لکھنؤ 2010
4. لکھنؤ کے بھولے بسرے صحافی، عبد النافع قدوائی، صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ، 2016
5. نیا دور، لکھنؤ فروری۔ مارچ 1990
6. نوائے خاموش، معصوم مرادآبادی، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، 2019

■

Athar Husain
MANUU Lucknow Campus
504/122 Tagore Marge Near Shadab Market
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.:8074378735

شاہ رشاد عثمانی

الیکٹرانک میڈیا

میں بذریعہ اردو روزگار کے مواقع

اردو میں روزگار کا سوال اس عہد کا ایک سلگتا ہوا سوال ہے، جس نے اردو تعلیم کے سلسلے میں کئی اہم سوالات پیدا کر دیے ہیں ۔ جیسے کہ ہم اردو کیوں پڑھیں؟ اردو پڑھ کر ہم کیا کریں گے؟ اردو پڑھ کر نوکری ملے گی یا نہیں؟ میرے نزدیک یہ تمام سوالات لاحاصل اور بے معنی ہیں۔ میں اصولی طور پر اردو زبان کو روزی روٹی سے جوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔اردو زبان ہی نہیں، دنیا کی کسی بھی زبان، ادب اور علم کے حصول کا اصل مقصد کیا ہے، پہلے یہ جاننا ضروری ہے۔ دیکھیے تعلیم کے حقیقی رازداں علامہ اقبال اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

علم سے عزت بھی ہے شہرت بھی دولت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سرغ

یعنی جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں انھیں عزت، شہرت اور دولت تینوں ملتی ہے جس کا انسان ہمیشہ سے حریص رہا ہے۔مگر یہ علم کا مقصد نہیں ہے، اگر ہے بھی تو ذیلی ہے بنیادی نہیں ہے۔علم کا اصل مقصد اور غرض و غایت تہذیب نفس ہے، عرفان ذات ہے، خودشناسی اور خداشناسی ہے جسے اقبال نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔'اپنا سراغ یا سراغ زندگی' کا پانا ہی تعلیم کا بنیادی مقصد رہا ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی سچی کامیابی اور حقیقی مسرت و شادمانی ممکن ہے۔

دراصل تعلیم کا مقصد انسان کی ظاہری و باطنی شخصیت کی تعمیر (Personality development) ہے۔خاص طور سے اردو تعلیم کے ذریعے انسان کے اندر تہذیب آتی ہے، اردو کی تعلیم سے انسان کی شخصیت میں ایک ایسی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے اٹھنے بیٹھنے، طور طریقہ اور انداز گفتگو میں وہ نکھار آجاتا ہے جس سے سامنے والا بے حد متاثر ہوتا ہے اور یہی زندگی کی راہ میں کامیابی کا پہلا قدم ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف جہاں تک روزی روٹی، رزق اور روزگار کا معاملہ ہے تو اس کا تعلق تمام تر تقدیر پر ہے۔ انسان کے چاہنے اور اس کی صلاحیتوں اور کوششوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا، یہ خدا کی مشیت ہے، رزق جب جتنا اور جہاں سے ملنا ہے اسے مل کر رہے گا۔ اس کے لیے یقیناً محنت و تگ و دو کرنی چاہیے مگر اس کا تعلق زبان اور علم سے کسی طور پر نہیں ہے۔ اور جہاں تک لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اردو پڑھنے والا نکمار رہتا ہے، اردو سے روزگار نہیں ملتا، تو یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے، روزگار کا اصول بالکل دوسرا ہے، مانگ ہوگی تو مانگ کو پورا کرنے کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ مانگ پیدا کیجیے تو روزگار کے مواقع پیدا ہونگے۔ اردو کی مانگ، اردو بولنے والے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اردو پڑھ کر صرف ابتدائی، ثانوی اسکول اور یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح کے تدریسی و تعلیمی شعبے میں جگہ ملتی ہے یہ تو ہے ہی، علاوہ ازیں اردو صحافت، پرنٹ میڈیا کے مختلف شعبوں ترجمہ نگاری، اشتہار نویسی اور طباعت و اشاعت کے مختلف شعبوں میں روزگار کے بڑے مواقع آج سامنے آئے ہیں۔ ہم اردو کے وسیلے کے ساتھ معیاری کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے تو ان مواقع میں مزید توسیع ہوگی۔ جہاں ایک طرف یہ بات درست ہے کہ آج ملک میں اردو جاننے والوں کے تناسب میں ان کے لیے مواقع کی کمی ضرور ہے لیکن دوسری طرف جو مواقع موجود ہیں ان سے پورا پورا اور بہتر سے بہتر صلاحیت کے ساتھ فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ جس حد تک ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو رہا ہے، اس کے لیے آپ کا اس زبان میں مہارت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ صرف ٹوٹی پھوٹی اور کام چلاؤ اردو زبان سے آپ کام لیں گے تو پھر بات نہیں بنے گی۔ ٹوٹی پھوٹی اور کام چلاؤ ہندی اور انگریزی سے بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اگر لوگ یہ سمجھ لیں کہ اردو مضمون لے کر امتحان میں آسانی سے اچھے نمبر مل جاتے ہیں تو بغیر قابلیت اور استعداد کے اچھے نمبر حاصل کر لینے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ آگے چل کر مایوسی ہی ہوگی۔ اس سہل پسندی کی وجہ سے عام لوگوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ اردو میں پڑھنے لکھنے والے کوئی خاص محنت نہیں کرتے اور وہ دوسرے سماجی علوم اور سائنسی موضوعات میں بھی اچھی معلومات نہیں رکھتے۔ اسی لیے ایسے دوسرے درجے کے لوگوں کو آج کوئی نہیں پوچھتا۔ لہذا ہمیں پہلے اردو زبان میں اچھی قابلیت اور مہارت پیدا کر کے اور اردو کو اعلیٰ علمی ضرورتوں کا وسیلہ بنا کر اس کھوئے ہوئے اعتماد کو پھر سے بحال کرنا چاہیے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ذہین طالب علموں کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ اردو زبان کی طرف متوجہ ہونا ہوگا تا کہ وہ اپنے آپ کو روزگار کے بہتر مواقع کا اہل ثابت کر سکیں۔

اکیسویں صدی کی اس دوسری دہائی میں اردو زبان کو ایک نیا چیلنج درپیش ہے۔ برقی ذرائع ابلاغ (Electronic Media) کی ایجاد نے سب سے پہلے ساری دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) میں

تبدیل کر دیا اور اب اس عالمی گاؤں میں جمہوریت کے چوتھے ستون ذرائع ابلاغ کی حکمرانی قائم ہے۔ عوامی ذرائع ترسیل خصوصاً انفارمیشن ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقی نے تمام عالم انسانیت کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ آج ریڈیو، سنیما، ٹیلیویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای میل، ویب سائٹس، ریڈیو کانفرنسنگ، سیٹلائٹ چینلوں، فیکس اور سیلولر فون کا دور دورہ ہے۔ آج کے معاشرے کو پوری طرح ایک معلوماتی معاشرہ (Information Society) بنانے میں جدید الکٹرانک وسائل کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ پوری دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں نہیں بلکہ موبائل کے ایک چھوٹے سے sim میں سمٹ آئی ہے، بقول منور رانا

اب فاصلوں کی کوئی حقیقت نہیں رہی
دنیا سمٹ کے چھوٹے سے اک سم میں آگئی

الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے استعمال اور روزگار کے مواقع پر جب ہم ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ریڈیو کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا آغاز تقریباً ایک سو سال قبل ہوا تھا۔ پھر جیسے جیسے ٹکنالوجی نے ترقی کی اسی مناسبت سے ریڈیو کو بھی فروغ ہوا۔ ریڈیو پر ہر دور میں ادبی، تعلیمی اور تفریحی پروگرام اردو زبان میں بھی نشر ہوتے رہے۔ ریڈیو کے تقریباً تمام مراکز سے اردو نیوز، حالات حاضرہ پر تبصرے، مشاعرے اور ڈرامے وغیرہ اردو سروس کے تحت نشریات میں شامل رہے ہیں۔ یہاں بڑے پیمانے پر جزووقتی اور کل وقتی پروڈیوسر اور پروگرامر کی جگہیں نکلتی ہیں۔ اور اردو قلم کاروں کو کام کے کافی مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

ہندوستان کا قدیم الیکٹرانک ماس میڈیا ریڈیو کے ساتھ سینما بھی ہے۔ گزشتہ صدی میں ان دونوں ذرائع عامہ یعنی ریڈیو اور سینما نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ آج ہندوستان کی مختلف زبانوں میں فلم پروڈکشن کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری نے جو غیر محسوس طور پر اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے وہ قابل ستائش ہے، اس نے اردو زبان اور کلچر کو عوام کے ذہنوں میں زندہ اور محفوظ رکھا' گرچہ آج یہ فلمیں ہندی کے نام پر ریلیز ہورہی ہیں مگر ان کے گیت' ٹائٹل' مکالمے وغیرہ سب نوے فیصد 90% اردو میں ہیں اور اس کے لکھنے والوں میں تقریباً تمام اردو کے ادیب و شاعر ہیں۔ ظاہر ہے سینما کے ڈائرکشن سے لے کر ایکٹنگ تک کے مختلف شعبوں میں اردو والوں کے لیے لامحدود امکانات ہیں۔

ٹیلی ویژن نیٹ ورک گزشتہ بیس پچیس برسوں سے بڑی سرعت کے ساتھ وسعت پذیر ہورہا ہے۔ دوردرشن نے پورے ملک میں اپنے کئی طرح کے ٹرانسمیٹر نصب کر رکھے ہیں اور تنصیبات کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس طرح ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں اور دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں بھی دوردرشن کے پروگرام دیکھے جا رہے ہیں۔ ریڈیو کی طرح ٹی وی پر بھی مختلف مراکز سے اردو پروگرام نشر کیے جارہے ہیں۔ مختلف کیبل اور پرائیویٹ ٹی وی چینلز کے ذریعے اردو نیوز مشاعرے ڈرامے اور سیریلز وغیرہ بڑے پیمانے پر ٹیلی کاسٹ کیے جارہے ہیں، خصوصاً ڈی ڈی اردو، نیوز 18 اور ذی سلام جو صرف اردو زبان میں ہی اپنے تمام پروگرام نشر کرتا ہے ان سے اردو زبان کی مقبولیت اور فروغ میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ آج ماس میڈیا کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے' جس میں اردو زبان کی ضرورت واہمیت مسلم نہ ہو' اخبار ہو یا ریڈیو' فلم ہو یا ٹیلی ویژن۔ اردو زبان کی قوت، اس کی ہمہ گیری' گہرائی وگیرائی' شیرینی' حسن' فصاحت وبلاغت اور اشارت وشعریت ہر جگہ کام آتے ہیں۔ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا میں اردو کی اہمیت اور ضرورت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ ٹی وی کی نجی کاری (Privatisation) کے بعد اردو زبان کا چلن اور بھی بڑھا ہے۔ اس لیے کہ عوامی رابطے کے لیے انھیں اس زبان کی ضرورت ہے۔ اردو تاریخی اعتبار سے اپنی پیدائش سے ہی عوامی رابطے کی زبان (LinkLanguage) رہی ہے، اور اثر پذیری اس کی خصوصیت ہے۔ اس لیے میڈیا کو یہ ہمیشہ راس آئی ہے۔

آج انسان کے پاس فرصت کے لمحات بہت کم ہیں' ضروریات زیادہ ہیں۔ اردو اپنی جامعیت کی وجہ سے اختصار کے ساتھ موثر ہونے پر قادر ہے۔ اس کی ایک مثال ٹی وی پر اشتہارات کی مقبولیت ہے۔ ظاہر ہے ٹی وی کے لیے اشتہارات تیار کرنے اور پھر اسے ٹیلی کاسٹ کرنے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں کم وقت میں ضروری مواد پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس جامعیت اور اختصار کے لیے اردو زبان بہت کام آتی ہے۔ کسی بھی وقت ٹی وی پر دکھائے جانے والے اشتہارات کو غور سے سن لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ استعمال کیے جانے والے لفظوں میں غالب عنصر اردو کا ہے' مثال کے طور پر چند اشتہارات دیکھیے: کرلو دنیا مٹھی میں (ریلائنس فون) کھولے گا تو بولے گا (کولڈ ڈرنکس) سب سے تیز (آج تک نیوز) آپ کو رکھے آگے (اسٹار نیوز) دل مانگے مور (پیپسی ڈرنک) اپنا خیال رکھنا (گارنیر کاسمٹک) دیش کی دھڑکن (ہیرو ہونڈا) وغیرہ وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹی وی کے لیے اشتہار لکھنا ایک پروفیشنل معاملہ ہے اور بڑی حد تک تکنیکی بھی۔ مگر ایسے لوگوں کے لیے جو خیال کو لفظوں میں ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہیں کوئی مشکل کام نہیں، وہ پیشہ ورانہ بنیاد پر اسے حصول روزگار کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ' ویب سائٹس اور آن لائن میڈیا کی بات کریں تو وہاں بھی اردو کے حوالے سے روزگار کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ ہند و پاک کے مختلف شہروں سے اردو میں شائع ہونے والے بڑے بڑے اخباروں کے ویب سائٹس ہیں، جن پر ویب ایڈیشن نکل رہے ہیں، اب ای نیوز پیپر نکالنا بہت آسان ہوگیا۔ اگر ان کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہو جاتی ہے تو Google Adsense کے ذریعے اس پر اشتہارات بھی مل جاتے ہیں۔ اردو کی پرنٹ میڈیا میں جہاں ریڈرشپ کا بازار نہایت سکڑا ہوا ہے وہیں ویب سائٹ پر یہ اخبارات لاکھوں قارئین کے ذریعے پڑھے جارہے ہیں۔ اسی طرح ادبی ویب سائٹ، اردو کتابوں کی ویب سائٹ، طب، صحت اور نفسیاتی مسائل پر کونسلنگ کے ویب سائٹس چلائے جارہے ہیں۔ آج کل انٹرنیٹ پر بلاگس Blogs بنا کر بھی خوب کمارہے ہیں۔ ڈیجیٹل ورلڈ کا ایک اہم حصہ یوٹیوب ہے، یوٹیوب پر مفت وڈیو اپ لوڈ Up Load کیے جاسکتے ہیں۔ جیسے خبروں کا چینل، مشاعرہ کا چینل، مزاحیہ ڈراموں کا چینل، ادب اطفال کے مختلف پروگراموں کا چینل وغیرہ وغیرہ۔ جب ان چینلس کو دیکھنے والوں کی تعداد گوگل کے حساب خاصی بڑھ جاتی ہے تو وہ آپ کے چینل پر اشتہارات پوسٹ کرتا ہے اور یوں آپ کو بھی اپنے نفع میں شریک کرتا ہے۔ سوشل میڈیا، فیس بک، ٹیوٹر اور واٹس اپ کا استعمال بھی اردو والے بطور روزگار کر رہے ہیں۔ اردو سافٹ وئیر اور اردو ایپس بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ اردو آن لائن شاپنگ سنٹرس بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ دراصل ڈیجیٹل ورلڈ میں زبان کی اتنی اہمیت نہیں رہی ہے بلکہ زبان کے ساتھ ٹکنالوجی کا ملاپ ہونا زیادہ ضروری ہے۔ اردو Key Pad کی ایجاد نے یقیناً اردو کو ڈیجیٹل دنیا میں داخل کردیا ہے۔ مگر اس کا خوب تر استعمال اردو والوں کی اپنی استعداد اور دلچسپی پر منحصر کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ الیکٹرانک میڈیا جہاں عالمی سطح پر اردو زبان کے فروغ میں اپنا موثر کردار ادا کر رہا ہے، وہیں اردو زبان میں روزگار کے نئے نئے مواقع بھی پیدا کر رہا ہے، جس نے یقیناً ہمارے لیے امید و امکانات کی وسیع دنیا کے دلکش دروازے کھول دیے ہیں۔

■

Dr. Shah Rashad Usmani
Retd. Asso. Prof. & Head Dept of Urdu
Anjuman Degree College & PG Centre
Bhatkal - 581320 (Karnataka)

اردو کے فروغ میں ٹیکنالوجی کا حصہ

فیاض حمید

انسان کا تعلق ٹیکنالوجی کے ساتھ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ جب انسان نے پہلی مرتبہ جنگلوں اور بیابانوں سے نکل کر شعور کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے، گھر، کنبہ اور خاندان کی بنیاد ڈالی تو اس دور میں پتھر اور مختلف دھاتوں سے بنائے گئے اوزاروں کی مدد حاصل کی گئی۔ جوں جوں انسان زراعتی دور میں داخل ہوتا گیا انسان سے ٹیکنالوجی کا تعلق مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔ زراعتی دور میں استعمال ہونے والے مختلف اوزاروں کے ساتھ ساتھ انسان نے زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی مشینی ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا۔ یوں انسانی ارتقاء کے اس پورے سفر میں ٹیکنالوجی اُس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی اور دنیا کے مختلف وسائل کو بروئے کار لانے میں انسانوں کی معاون ومددگار ثابت ہوئی۔

اکیسویں صدی انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کے فروغ کی صدی ہے، جس نے روزمرہ زندگی کے ہر شعبے پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تعلیم، کاروبار، بینکنگ، آمدورفت، تفریح۔۔ ہر شعبے کو ان سہولیات نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ ٹیکنالوجی کی اس ترقی نے ساری دنیا کو ایک گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس صدی میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر نے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی مختلف جہتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اردو ادب نے اس نئی ٹیکنالوجی کو اس کی شروعات میں ہی اپنا لیا تھا یہی وجہ ہے کہ اس میں انٹرنیٹ پر دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مواد موجود ہے۔ انٹرنیٹ نے دنیا کے تمام فاصلوں کو کم کر دیا اور دوسری طرف تمام معلومات کا انبار لگا دیا ہے جس کے ذریعے منٹوں میں کوئی بھی معلومات آسانی سے گھر بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسی معلومات بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں کا سفر اور دیگر ملکوں کو جانے کی ضرورت درپیش تھیں۔ لیکن آج انٹرنیٹ نے تمام وسائل کو ہمارے قریب لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ ہم کمپیوٹر کی مدد سے اپنی ضروریات کی معلومات آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اصغر علی ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی ضروریات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا موجودہ عہد کے انسان کے لیے آکسیجن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ایک منٹ کے لیے انٹرنیٹ تعطلی کا شکار ہو جائے تو اندازاً اکیس کروڑ پیغامات کی ترسیل جمود کی شکار ہو جائے گی۔ زمینی، فضائی، اور سمندری سفر متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اربوں روپے کا کاروباری نقصان ہوگا۔ گویا انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ آج کی روح عصر ہے۔ انٹرنیٹ موجودہ عہد کے دل کی دھڑکن ہے ادھر دل نے دھڑکنا بند کیا اُدھر موت واقع ہوئی''۔

دیکھا جائے تو اس ٹیکنالوجی کے دور میں اردو والوں نے بھی وقت کی تیز رفتار کا ساتھ دینا سیکھ لیا ہے۔ انھوں نے بھی اپنی بقا کی خاطر انٹرنیٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنا شروع کیا ہے۔ جہاں تک اردو زبان وادب کے تحفظ کا سوال ہے تو انٹرنیٹ نے نہ صرف اس کے تحفظ کو یقینی بنایا ہے بلکہ اس کے فروغ میں کلیدی کردار بھی ادا کیا ہے۔ اردو کیلی گرافی کو ان پیج کے متنوع اور دیگر سافٹ ویئر نے نئے آفاق سے روشناس کروایا ہے۔ فوٹو شاپ، پیج میکر سافٹ ویئر نے گرافک ڈیزائننگ اور تصاویر کو صفحے کے مطابق ڈھالنے جیسے مشکل کاموں کو سہل بنایا ہے۔ انٹرنیٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کو اردو صحافت نے بڑی خوش اسلوبی اور مہارت سے استعمال کیا ہے۔ آج کل یہی کام اردو جرائد اور کتب کی اشاعت کے لیے بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں کتب خانوں میں کتب بینی کی روایت نے دم توڑا ہے وہاں اب انٹرنیٹ اس کمی کو پورا کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔ اس طرح عصر حاضر میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر ہماری زندگی کا بنیادی جز بن چکا ہے۔ اس لیے قلم کے بدلے کی بورڈ، کتاب کے بدلے ای کتاب اور خط کے بدلے ای میل تک کا سفر انسان نے بہت جلد طے کر لیا۔ دیکھا جائے تو انٹرنیٹ فاصلاتی تعلیم وتدریس کے سلسلے میں بھی کافی معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اسباق کی تیاری طلبہ تک کی رسائی اور طلبہ سے اس کے ردعمل کو اس ٹیکنالوجی کی مدد سے جانا جا سکتا ہے اور ان کی ضرورت اور تقاضے کے مدنظر تدریسی مواد تیار کیا جا سکتا ہے۔

ابتدا میں ٹیکنالوجی کا استعمال اردو زبان وادب کی تعلیم کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک ہی محدود تھی۔ لیکن ان دنوں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے سہارے اس دائرہ کا ورلڈ وائیڈ ویب WWW کے ذریعے پوری دنیا پر چھا گیا ہے۔ ای ٹیوشن، ای لرننگ، ای ایجوکیشن، ای بکس کمپیوٹر یا موبائل کے ننھے چپس (Micro Chips)، ایجوکیشنل آڈیو ڈیو سی ڈیز، ای میل، کمپیوٹر کانفرنسنگ اور وائس ای میل، تصاویر گرافکس وغیرہ کے ذریعے انسان نے دنیا کو مٹھی میں بند کر لیا ہے۔ انٹرنیٹ کی مختلف ویب سائٹوں کے ذریعے کتابوں، ناولوں، ادبی جرائد اور خصوصی شماروں

کو محفوظ کرنے کا کام تیزی سے جاری وساری ہے۔ان میں کراچی سے تعلق رکھنے والے ادب دوست راشد اشرف کو کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا جنھوں نے اب تک پرانی کتب کے تقریباً چار لاکھ صفحات سکین کرکے انٹرنیٹ پر محفوظ کردیے ہیں۔اس طرح کلاسیکی ادب کا وہ خزانہ جو ضائع ہورہا تھا،وہ اب نئے انداز سے محفوظ ہوگیا ہے اس کے علاوہ عصر حاضر میں ایک ریختہ ڈاٹ او آرجی ہے جسے غیر مسلم عاشق اردو سنجیو صراف ٗنہایت کامیابی اور عمدگی کے ساتھ انٹرنیٹ پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ریختہ ویب سائٹ جس میں شاعری،نثر،تحقیق وتنقید کی بے شمار نئی پرانی کتابیں،پرانے اہم رسائل کی فائلیں اور بھی بہت کچھ مواد ہے کے بارے میں ڈاکٹر حامد اشرف یوں رقمطراز ہیں کہ:

''آج ریختہ ڈاٹ او آرجی پر ابجدی فہرست میں 3000 سے زائد شاعروں کے کلام کے ویڈیوز موجود ہیں جسے تین ہزار سے زائد مختلف گلوکاروں نے گایا ہے اس ویب سائٹ پر تاحال 18633 غزلیں، 14335 متفرق اشعار نظمیں، تمام فلمی غزلوں کے ویڈیوز اور 18490 ای بکس کا گراں قدر سرمایہ اپ لوڈ کیا گیا ہے جسے 154 ممالک کے ڈھائی لاکھ سے زیادہ اردو شائقین کی نگاہیں بقدر ظرف وشوق ملاحظہ کررہی ہے۔یہ سب اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس ویب سائٹ کے بانی اردو شاعری سے بے حد فطری اور وراثتی لگاؤ رکھتے تھے۔''

('اردو کی اہم ویب سائٹ: ریختہ ڈاٹ او آرجی: ڈاکٹر حامد اشرف: 2017،ایم ایم پبلی کیشنز دہلی)

اس کے علاوہ 'بزم اردو لائبریری'،'اردو ڈیجیٹل لائبریری' اور اردو دوست آن لائن لائبریری' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اردو کا کون سا خزانہ ہے جو اس وقت انٹرنیٹ پر موجود نہیں۔تاریخ،جغرافیہ،صحافت، سیاست، قانون، سائنس، ادب، لسانیات، فلسفہ، مذہب، اور سیاحت غرض ہر موضوع پر اب انٹرنیٹ پر مواد موجود ہے۔اردو شعر وادب پر جتنا مواد انٹرنیٹ پر موجود ہے اتنا دیگر شعبوں کے حوالے سے موجود نہیں۔ان لائبریریوں کے علاوہ اردو زبان میں بے شمار ادبی اور نیم ادبی ویب سائٹس بھی موجود ہیں۔شعرا و ادبا نے بڑی تیزی میں انٹرنیٹ کو اپنایا اور آج سوشل نیٹ ورک سائٹوں،فورم اور بلاگ سائٹوں میں اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد دکھائی دیتی ہے۔ ادبی ویب سائٹس،آن لائن رسالوں اور آن لائن لائبریریوں نے اردو ادب کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچادیا ہے۔اب نہ دوریاں ہیں اور نہ ہی سرحدیں۔عصر حاضر میں اردو ڈیجیٹل لائبریری کی اہمیت کے متعلق راغب اختر اپنے مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

''ڈیجیٹل لائبریری اس دور میں اس لیے خاص اہمیت کی حامل ہوتی جارہی ہے کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ کتابوں کو بہ آسانی دور دراز علاقوں تک پہنچایا جاسکتا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک فلسفہ پنہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگوں کے پاس یہ کتابیں ہوگی اتنی ہی زیادہ طویل اس کتاب کی زندگی بھی ہوگی''۔

(اردو میڈیا: ترتیب: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پبلشر: NCPUL دہلی،ص 355)

اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر اردو کی کئی اہم تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں جو بیش بہا ادبی اور علمی خزانے سے لبریز ہیں۔ اردو وکی پیڈیا جسے اردو دائرۃ المعارف کہاجاتا ہے پر بھی کافی اہم معلومات دستیاب ہے۔اردو کی اس ترقی میں بین اقوامی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قابل ستائش اردو ادارہ ہے جو اردو زبان وادب کو ٹیکنالوجی سے جوڑنے کا ایک اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔جن کا بہترین کارنامہ اردو پورٹل ہے جس کے ذریعے اردو سرچ انجن 'اردو انسائکلو پیڈیا' لغات اور ستاویزات کی طباعت' کیلی گرافی' گرافک ڈیزائن' اردو آموزش سافٹ ویئر اور بچوں کے ادب وغیرہ پروگرامس مہیا کیے جاتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے اس دور میں ذرائع ابلاغ نے بھی بہت ترقی کی ہے۔پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے تقاضوں کے تحت اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا۔سینما اور ٹی وی کی دنیا کی بقا اسی زبان سے ہے نوے فی صد فلمیں اور سیریلس اسی زبان میں لکھے اور فلمائے جاتے ہیں لیکن لیبل اس پر ہندی کا لگتا ہے۔جس سے اردو کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔عصر حاضر میں تو سمارٹ فون نے لوگوں کو اپنا عادی بنادیا ہے اس کا فائدہ اردو زبان کو بھی ہوا ہے۔ کیونکہ موبائل میں بھی اردو کا کی بورڈ استعمال کرکے کسی بھی ویب سائٹ سے ہم تمام معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف اردو موبائل ایپس کی تیاری میں بھی پروگرامر حضرات کی دلچسپی کی بدولت صارفین کو بہت سے مفید ذرائع میسر آئے جن میں اردو زبان سیکھنے کے علاوہ کئی بہترین لغات،تفریح اور معلوماتی ایپس شامل ہیں۔اطلاعات کا یہ شعبہ بھی ہر ممکن حوالے سے اردو زبان کی ترویج وترقی میں معاون و مددگار ثابت ہورہا ہے۔سوشل میڈیا جن میں فیس بک، وٹساپ،ٹویٹر، بلاگ اور گوگل ٹرانسلیٹر وغیرہ ایسے اپلیکیشن ہیں جو اردو کی ترقی میں عصر حاضر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے دنیا کے کسی بھی حصے میں رہ کر اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جاسکتی ہے اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر سافٹ ویئر کی مدد سے لغات کی تیاری اور مشینی ترجمہ ممکن ہو پایا۔اس کے لیے مختلف سافٹ ویئر مرتب کیے گئے جن کی مدد سے اردو سے انگریزی ترجمے کی محدود صلاحیت موجود تھی۔اس طرح گوگل ترجمے میں بھی اردو کو جگہ ملی اور آج صارفین اس سہولت کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کی مختلف زبانوں میں تحریر کی گئی زبانوں کا محدود اردو ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اردو ٹیکنالوجی سے واقفیت کے لیے پاک اردو انسٹالر کمپیوٹر پر اردو لکھنے کے لیے ایک سافٹ ویئر ہے اس کے علاوہ ان پیج کا بھی بول بالا ہے۔لیکن ان پیج میں تحریر کردہ مواد کو انٹرنیٹ کے سرچ انجن سے تلاش نہیں کیا جاسکتا ہے اس کے برعکس پاک اردو انسٹالر ایک یونیکوڈ سافٹ ویئر کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مدد سے سرچ انجن میں اردو میں اپنی پسند کے مواد تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔یونیکوڈ کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایم ایس ورڈ میں بھی کام کرتا ہے۔کمپیوٹر سافٹ ویئر اور انٹرنیٹ کے استعمال سے اردو تحقیق میں بھی کافی آسانیاں پیدا ہوئیں۔تاہم لسانی تحقیق اور اردو تدریس میں مزید استفادہ کی گنجائش موجود ہے۔عام طور پر اردو زبان وادب کے محققین کو مقالے کی تسوید سے لے کر اعشاریہ سازی کتب اور مواد تک رسائی میں جو مسائل درپیش تھے،اس ٹیکنالوجی نے کافی حد تک ان مسائل پر قابو پاتے ہوئے اردو میں ادبی،لسانی اور علمی تحقیق کے لیے راہیں ہموار کردی ہیں۔

مختصر جہاں سائنس نے انسان کی بہت ساری گتھیاں سلجھادی ہیں،وہیں انفارمیشن ٹکنالوجی نے انسان کو سوشل میڈیا کا سہارا دے کر معلومات،تفریحات اور باہمی روابط کا بے تاج بادشاہ بنایا ہے اور اس جدید ٹکنالوجی کی بدولت اردو کی ایک نئی دنیا آباد ہوچکی ہے اور خاص طور پر انٹرنیٹ نے اردو کے فروغ کی رفتار کو تیزی اور ایک نئی سمت عطا کی ہے۔اس لیے ایک زندہ زبان کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرے جس کا ثبوت اردو کی ترقی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

■

Fayaz Hameed
Ph.D Research Scholar, Dept of Urdu
Dr. Hari Sing Gour Central University
Sagar - 470003 (MP)
Mob.:7006148112

محمد زبیر احمد

انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں

لائبریری کا صحیح استعمال اور اس کے فوائد

لائبریری کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصور اُبھرتا ہے جہاں پڑھنے کے لیے کتابیں، رسائل اور جرائد موجود ہوں اور اس علمی ذخیرے سے کوئی بھی بغیر کسی خرچ کے (Free of cost) استفادہ کرسکتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ لائبریری یا کتب خانہ ایک ایسا مقام ہے جہاں لوگوں (جو لوگ کتابیں خریدنے سے قاصر ہوتے ہیں) کو مطالعے کے لیے کتابیں، رسائل اور جرائد مہیا کرائے جاتے ہوں۔

حصول علم ہر انسان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسلام میں علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کے لیے فرض قرار دے دیا گیا ہے۔ اسی طرح علم سکھانا اور اس کو فروغ دینا بھی بہترین اعمال میں شمار کیا گیا ہے۔ کتب خانے علم کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کتب خانوں کے قیام اور ان کے ذریعے علم کے فروغ کے بغیر کسی بھی قوم یا ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

لائبریری معلومات اور اس سے تعلق رکھنے والے وسائل کا مجموعہ ہے جسے ایک مخصوص کمیونٹی تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ وہ دارالمطالعہ (Reading room) میں کتب اور رسائل کے مطالعے کے علاوہ مزید استفادے کے لیے کچھ کتابیں اپنے ساتھ Borrow بھی کرسکتے ہیں۔ لائبریری وہ جگہ ہے جہاں متفرق قسم کے علوم، اطلاعات، ذرائع اور خدمات وغیرہ کا مجموعہ دستیاب رہتا ہے۔ لائبریری میں کتابیں، جرائد، رسائل، اخبارات، مخطوطے، مطبوعات، نقشے اور دستاویزات کے ساتھ ساتھ مائکرو فارم، CDs، DVDs، سمعی فیتے (Audio Tapes)، کیسٹس (Cassettes)، بصری فیتے (Video Tapes) اور Digital Video Discs، الیکٹرانک کتابیں (E-Books)، بولتی کتابیں (Audio-Books)، الیکٹرانک رسائل (E-Journals) اور Databases بھی فراہم ہوتے ہیں۔

لائبریری کی اقسام:

لائبریریاں کئی قسم کی ہوتی ہیں جیسے اکیڈمک لائبریری، چلڈرین لائبریری، نیشنل لائبریری، پبلک لائبریری، ریفرینس لائبریری، ریسرچ لائبریری اور اسپیشل لائبریری۔ جب ہم اکیڈمک لائبریری کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی لائبریری۔ اکیڈمک لائبریری کا استعمال وہاں پڑھنے والے طلبا، اساتذہ اور غیر تدریسی عملہ اپنے تفویضات (Assignments)، گھر کا کام (Home work)، تحقیقی کام (Research work) اور تدریسی کام کے لیے کرتے ہیں۔ چلڈرین لائبریری سے مراد ایسی لائبریری ہے جس میں بنیادی طور پر بچوں اور نوعمروں کے لیے کتابیں موجود ہوں۔ اس طرح ہر لائبریری اپنی نوعیت، اہداف اور خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہوتی ہے۔

لائبریری کی اہمیت:

عصر حاضر میں لائبریری میں صرف کتابیں، رسائل اور جرائد کا ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ آج کے انفارمیشن اور ٹکنالوجی کے اس دور میں اب لائبریری کا رول اور اس کی اہمیت میں خاصی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اب لائبریری کو انفارمیشن سنٹر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس میں کتابیں، رسائل اور جرائد Hard Copy کے علاوہ Soft Copy، E-Book اور E-Journal کی شکل میں کمپیوٹر میں موجود ہوتے ہیں جس سے ہم انٹرنیٹ کی مدد سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہم اپنی ضرورت کے مطابق کوئی بھی معلومات، کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، کسی بھی صورت میں انٹرنیٹ کی مدد سے حاصل کرسکتے ہیں جسے آج کل لائبریری 24x7 کا نام دیا گیا ہے۔

آج سے پچیس تیس برس پہلے ہمیں کوئی جانکاری

حاصل کرنی ہوتی تھی خواہ وہ اسکول کا ہوم ورک ہو، کالج اور یونیورسٹی کے طلبا کو دیا گیا مفوضہ (Assignment) ہو اور ریسرچ سے متعلق کام ہو، اسے کرنے کے لیے طلبا کو کتاب، ڈکشنری یا انسائیکلو پیڈیا کی مدد لینی پڑتی تھی جس سے مواد کو ڈھونڈنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔ یہ کام کرنے کے لیے طلبا کو گھنٹوں لائبریری میں بیٹھ کر مواد اکٹھا کرنا پڑتا تھا۔ مطلوبہ مواد کے حصول کے لیے کئی کئی لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔ لیکن اب انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں کمپیوٹر کی مدد سے یہ کام دھیرے دھیرے آسان ہوتا جا رہا ہے۔ طلبا اگر چاہیں تو وہ اپنے مطلوبہ مواد کی کاپی کروا کر اسے اپنے گھر لے جا کر اس سے اپنی سہولت کے لحاظ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

دوسری چیز جو آج کل سب سے زیادہ استعمال کی جاتی ہے وہ ہے انٹرنیٹ۔ انٹرنیٹ کی مدد سے ہم اپنا کام آسانی سے اور جلد سے جلد کر سکتے ہیں۔ یہ کام طلبا اپنے گھر یا ہاسٹل کے علاوہ لائبریری میں بھی بیٹھ کر کر سکتے ہیں۔ آج کل سبھی لائبریریوں میں انٹرنیٹ کی سہولت دستیاب کرائی جاتی ہے جس سے طلبا بہ آسانی اپنا کام کر سکتے ہیں۔ یہ سہولت طلبا اور اساتذہ کو مفت میں (Free of cost) دستیاب کرائی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ سے تعلیمی مواد حاصل ہونے کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ اب لائبریری کی اہمیت کم ہو گئی ہے بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لائبریری کی اہمیت اب اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جس کا استعمال طلبا اور اساتذہ اپنے تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

لائبریری کا صحیح استعمال:

مندرجہ بالا باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے لائبریری کے بارے میں صحیح جانکاری رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس سے ہم لائبریری کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں اور اس سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم آپ کو لائبریری کے صحیح استعمال کی مختصر مگر ضروری باتیں بتاتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر سال نئے تعلیمی سال کی شروعات میں لائبریرین اور لائبریری اسٹاف کی جانب سے User Education/Orientation کے نام سے ایک پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس میں لائبریری کے استعمال کا صحیح طریقہ اور اس میں موجود ذخیرے کے بارے میں طلبا اور اساتذہ کو صحیح جانکاری دی جاتی ہے۔ جسے Power Point Presentation (PPT) یا کسی اور ذریعے سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک لائبریری پروفیشنل ہونے کے ناطے میں اپنا تجربہ قارئین کے ساتھ Share کرنا چاہتا ہوں جو شاید لائبریری صارفین کے لیے سود مند ثابت ہو۔

لائبریری میں جب بھی ہم داخل ہوتے ہیں تو بابِ داخلہ کے نزدیک ایک کاؤنٹر دکھائی دیتا ہے جسے Property Counter کے نام سے جانا جاتا ہے، وہاں طلبا/صارفین کو اپنا ذاتی سامان جمع کروانا ہوتا ہے۔ ذاتی کتاب، تھیلا یا بیگ وغیرہ لائبریری میں لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ طلبا کو لائبریری کے اندر صرف کاپی، رجسٹر اور قلم وغیرہ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لیپ ٹاپ یا موبائل فون بھی اپنے ساتھ لائبریری کے اندر لے جانے کی اجازت ہے۔ جب آپ لائبریری سے اپنا کام پورا کر کے واپس جاتے ہیں تو اپنا سامان واپس لے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا کاؤنٹر بھی ہوتا ہے جسے Circulation Counter کہتے ہیں اس کا استعمال طلبا گھر یا ہاسٹل میں پڑھنے کے لیے کتابیں Issue کرانے کے لیے کرتے ہیں۔ اگر کسی طالب علم نے لائبریری سے کتاب اپنے نام پر جاری (Issue) کرائی اور اس کا کام ختم ہو گیا ہو یا اس کا Due date ختم ہو گیا ہو تو اسے Circulation Counter پر واپس کرنا یا پھر سے دوبارہ Issue کروانا ہوتا ہے۔

لائبریری کے اندر داخل ہوتے ہی ایک Catalogue Cabinet دکھائی دیتا ہے جس کے اندر Catalogue Card رکھا ہوتا ہے جس میں کتاب سے متعلق Biblio-graphic جانکاری درج ہوتی ہے۔ اس کا استعمال لائبریری صارفین (Library Users) کتاب کے بارے میں صحیح جانکاری حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ یعنی کتاب کا نام، موضوع، مصنف کا نام، اشاعت کا سال، پبلشر کا پتہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا Call Number اور Shelf Location بھی پتہ چلتا ہے، جس سے لائبریری صارفین کو اس کتاب کو ڈھونڈنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس سے صارفین کا وقت بھی بچتا ہے۔ Catalogue Card کو دو طرح سے Arrange کیا جاتا ہے، Dictionary Catalogue اور Classified Catalogue۔ Dictionary Catalogue میں Catalogue Card کو حروف تہجی یا Alphabetically (A-Z) انداز میں رکھا جاتا ہے جس کی مدد سے صارفین کتاب کو اس کے مصنف یا مدیر (Author/Editor) کے نام سے آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ Classified Catalogue میں Catalogue Card کو Call Number یا مضمون کے لحاظ سے Arrange کیا جاتا ہے جس سے صارفین اپنے مضمون کے اعتبار سے کتاب کو آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہیں۔

آج کل کمپیوٹر کے استعمال کی وجہ سے دھیرے دھیرے Catalogue Card کا استعمال ختم ہوتا جا رہا ہے اور اب اسی کام کو Library Automation کے ذریعہ Online Public Access Catalogue (OPAC) کی مدد سے کیا جا رہا ہے جس سے لائبریری کے صارفین کم وقت میں آسانی سے کمپیوٹر کی مدد سے اپنے مضمون سے متعلق کتابوں، رسالوں اور جرائد کے بارے میں صحیح جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کی مدد سے صارفین کو کتاب کی دستیابی کی صحیح جانکاری یعنی کتاب لائبریری میں موجود ہے تو کہاں ہے یعنی کتاب کی Location یا پھر کتاب کسی صارف کو Issue کی گئی ہے تو وہ کتاب کب تک واپس لائبریری میں آنے والی ہے۔ اس کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی مدد سے صارفین کو کتابیں محفوظ (Reserve) کروانے کی سہولت بھی مہیا کرائی جاتی ہے۔ جب وہ کتاب لائبریری میں واپس آتی ہے تو صارف کو اطلاع دی جاتی ہے تا کہ وہ اس کتاب کو Issue کروا سکے۔

لائبریری کے داخلی دروازے اور Circulation counter کے آس پاس ہی Display Racks ہوتے ہیں جن میں لائبریری میں آنے والی نئی کتابوں کے سرورق (Title page) کی نمائش (Display) کی جاتی ہے تا کہ صارفین کو یہ جانکاری دی جا سکے کہ لائبریری میں کون کون سی کتابیں نئی آئی ہیں یا پھر آنے والی ہیں۔

لائبریری کا سب سے ضروری حصہ اس کا Stack Room ہوتا ہے جہاں کتابیں الماریوں میں رکھی ہوتی ہیں۔ ہر لائبریری میں کتابیں رکھنے کا الگ الگ طریقہ ہو سکتا ہے لیکن زیادہ تر لائبریریوں میں کتابوں کو مضمون (Subject) اور زبان (Language) کے لحاظ سے Arrange کیا جاتا ہے۔ تا کہ صارفین کو کتابیں ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو اور کتابیں آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔ اس کے علاوہ کچھ اہم کتابیں جیسے ڈکشنری، انسائیکلو پیڈیا، گلوسری، ہینڈ بک، دستور العمل (Manuals)، گزٹ، اٹلس، Almanacs، سالنامے (Year book)، مردم شماری کی رپورٹ، سالانہ رپورٹ، مختلف کمیشنوں کی رپورٹ اور دیگر قیمتی کتابیں ایک الگ شعبہ جسے ہم شعبہ حوالہ جاتی کتب (Reference Books Section) کہتے ہیں، میں رکھی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں

Issue نہیں ہوسکتی ہیں۔ان کتابوں کو صارفین کو لائبریری کے احاطہ میں ہی بیٹھ کر پڑھنا ہوتا ہے۔

الماریوں (Shelves) میں کتاب تلاش کرتے وقت صارفین کو کچھ باتوں کا دھیان رکھنا بہت ضروری ہے۔اس سے لائبریری کے اسٹاف اور دوسرے صارفین کو پریشانی سے بچایا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اپنے مضمون سے متعلق کتابیں تلاش کریں تو سب سے پہلے لائبریری میں موجود Catalogue Card یا OPAC کی مدد سے یہ جان لینا چاہیے کہ یہ کتاب لائبریری میں کہاں رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد جب صارف کتابیں ڈھونڈنے جائیں اور اپنی کتاب ڈھونڈتے ہوئے کسی دوسری کتاب کو الماری سے باہر نکالیں تو یہ کوشش کریں کہ اس کتاب کو ان کی پرانی جگہ پر رکھ دیں۔ اگر وہ کتاب کو اس کی پرانی جگہ پر نہیں رکھ سکتے تو اسے الماری میں کسی دوسری جگہ نہیں رکھیں بلکہ اس کتاب کو Stack Room میں موجود میز پر رکھ دیں تاکہ لائبریری اسٹاف اس کتاب کو واپس اس کی جگہ پر آسانی سے رکھ سکیں تاکہ دوسرے صارفین کو اس کتاب کو ڈھونڈنے میں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔اس کے علاوہ جب صارف کو کتاب ڈھونڈنے میں پریشانیوں کا سامنے کرنا پڑے تو بہتر ہے کہ وہ وہاں موجود لائبریری اسٹاف سے مدد لیں، اس سے صارف کو کتاب آسانی سے اور کم وقت میں مل سکتی ہے۔کئی بار صارفین کو اپنے مضمون کی کتابوں کے بارے میں صحیح جانکاری نہیں ہوتی ہے اور وہ الماری میں کتابیں اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔انھیں کتاب بھی نہیں مل پاتی اور ان کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔اس کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ لائبریری میں موجود اسٹاف سے رابطہ کریں۔ وہ آپ کو آپ کے مضمون سے متعلق کتابوں کی صحیح جانکاری کم وقت میں دے سکتے ہیں۔اس سے آپ کا وقت بھی بچے گا اور آپ کی مطلوبہ کتاب بھی آسانی سے مل جائے گی۔اس کے علاوہ آج کل لائبریریوں میں Shelve Locator چسپاں کیا جارہا ہے جس میں Shelves میں موجود کتابوں کی صحیح جانکاری Call Number کے ساتھ دی جاتی ہے جس سے صارفین کو کتابیں ڈھونڈنے میں مدد ملتی ہے۔موجودہ دور میں جو لائبریری Computerize Services مہیا کرا رہی ہے وہاں OPAC کی مدد سے صارفین کو کتاب سے متعلق بھی طرح کی معلومات آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں اور صارفین کو کتاب ڈھونڈنے میں مدد ملتی ہے۔ OPAC کی مدد سے صارفین کو لائبریری میں اُس مضمون پر کتنی کتابیں دستیاب ہیں اس کی بھی جانکاری آسانی سے حاصل ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر صارفین چاہیں تو اُس مضمون سے متعلق اور بھی دوسری کتابوں کی جانکاری کمپیوٹر کی مدد سے آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

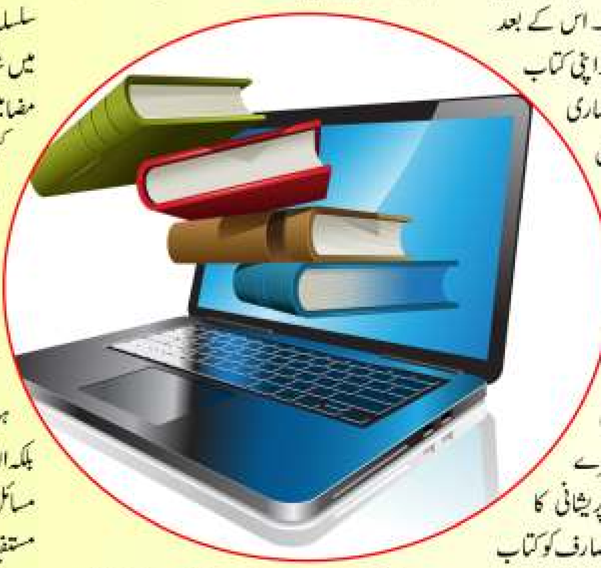

لائبریری میں ایک بڑے ہال میں کچھ میزیں اور کرسیاں لگائی جاتی ہیں جسے دارالمطالعہ (Reading Room) کہا جاتا ہے۔ اس میں صارفین بیٹھ کر کتابیں پڑھتے ہیں اور اپنا ہوم ورک (Home Work) یا مفوضہ (Assignment) آسانی سے مکمل کرسکتے ہیں۔ امتحان کے دنوں میں صارفین وہاں بیٹھ کر اپنے امتحان کی تیاری بھی کرتے ہیں۔خصوصاً امتحان کے دنوں میں Reading Room کو چوبیس گھنٹے کھولنے کا چلن ہے تاکہ طلبا و طالبات اپنی سہولت کے مطابق جب چاہیں لائبریری میں آکر امتحان کی تیاری کرسکیں۔آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریری میں ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کے لیے الگ سے کمرہ (Cubicle) بنایا جاتا ہے اور اسے تمام سہولتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے تاکہ ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ اپنے تحقیقی اور تدریسی کام کو اطمینان اور سکون سے کرسکیں۔

لائبریری کا ایک اور حصہ جو بہت اہم ہے وہ ہے Periodical Section جہاں مختلف مضامین اور زبانوں کے رسائل اور جرائد کے موجودہ اور پرانے شمارے دستیاب ہوتے ہیں۔صارفین وہاں بیٹھ کر اپنے مضمون یا پسند کے رسائل اور جرائد پڑھ سکتے ہیں جو ان کی تعلیمی قابلیت کے اضافے میں معاون ہوتے ہیں۔ بہت سے جرائد کو اکٹھا کرکے ان کی جلد سازی (Binding) کروا کر رکھا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی صارف کسی خاص شمارے کی فرمائش کرے تو اسے اس شمارے سے استفادہ کے لیے مہیا کرایا جاسکے۔خاص طور سے ریسرچ اسکالروں کے لیے یہ شعبہ بہت ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔

لائبریری کا ایک بے حد اہم حصہ ڈاکومنٹیشن (Documentation) کا شعبہ ہوتا ہے جس میں مختلف موضوعات پر اخبارات اور رسائل کے تراشے (Clippings) سلسلہ وار ڈھنگ سے رکھے جاتے ہیں۔ان میں اخبارات میں شائع خبریں، اہم موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین، اداریے اور ادارتی جائزے شامل ہوتے ہیں۔ کسی خاص موضوع پر تحقیق کے ضمن میں ان سے بہت مدد ملتی ہے۔

لائبریری میں کتابوں، رسائل اور جرائد کا ذخیرہ ہوتا ہے جن کے مطالعے سے انسانی ذہن کے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ان کتابوں کے مطالعے کی بدولت ذہن وسیع ہوتا ہے اور کشادہ نظری پیدا ہوتی ہے۔ کتابیں صرف ہماری تنہائی کا ساتھی ہی نہیں بلکہ ان میں ہمارے بزرگوں کے تجربات و مشاہدات اور مسائل حیات پر ان کے افکار کا جو ذخیرہ ملتا ہے ان سے مستفید ہوکر ہماری نئی نسل بہترین زندگی گزار سکتی ہے۔آج کے بدلتے ہوئے حالات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لائبریری میں نئی نئی ٹیکنالوجی کا استعمال شروع کر دیا گیا ہے جس میں لائبریری کا آٹومیشن، ادارہ جاتی ذخیرہ (جس میں ادارہ کے اساتذہ اور طلبا کی تحریر کردہ کتابیں اور تحقیقی مضامین کی سافٹ کاپی) اور OPAC (Online Public Access Catalogue) کی سہولت کی فراہمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے سے نوجوانوں کے اخلاق و کردار پر اس کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتابوں کے مطالعے کے ذریعے ہم اپنی اور اپنے ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔اس کے لیے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ لائبریری کا صحیح استعمال کیسے کیا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم مذکورہ بالا باتوں کا دھیان رکھیں۔

■

Md. Zubair Ahamd
Semi Professional Assistant
Centre for Urdu CultureStudies
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032 Telangana

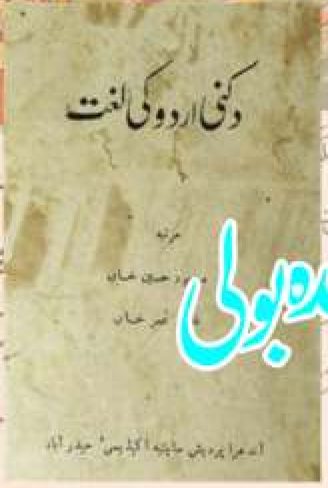

محمد عامل بدایونی

دکنی اردو کی سچی جانشین ایک گم شدہ بولی

زبان، آواز اور الفاظ کا مجموعہ ہے۔ زبان ہمارے احساسات، جذبات وخیالات کو ادا کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ہندوستان میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ زبانیں زمان و مکان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ انھیں میں ایک اہم زبان 'اردو' ہے۔ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ اس کا ارتقا کسی خاص وقت یا لمحہ میں نہیں ہوا۔ وہ اپنی موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے مختلف مراحل سے گزری ہے۔ آج اس کا شمار دنیا کی چند ترقی یافتہ اور کثرت سے بولی جانے والی زبانوں میں ہوتا ہے۔ زبانوں کا جو معیاری لب ولہجہ ہوتا ہے وہ ادیبوں اور اہل زبان کے قائم کردہ اصولوں اور معیاروں کی مطابقت کے نتیجے میں شکل پذیر ہوتا ہے لیکن مختلف اسباب وعوامل کی وجہ سے زبان کے معیاری لب ولہجہ میں تبدیلیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ اس تبدیل شدہ لب ولہجہ کی وجہ سے زبان جو شکل اختیار کرتی ہے، اسے ہم 'بولی' کا نام دیتے ہیں۔ دراصل بولی، زبان کی بدلی ہوئی شکل کو ظاہر کرتی ہے۔ اس تعریف کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بولی زبان سے قدرے مختلف ہے۔ زبان کا علاقہ وسیع ہوتا ہے جب کہ بولی صرف ایک مخصوص علاقے تک ہی محدود ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اردو کی مختلف بولیاں رائج ہیں۔ اردو کی ان بولیوں کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) لسانی بولیاں: کبھی کبھی مختلف زبانوں کا اثر قبول کرنے کے نتیجے میں کسی زبان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، ایسی شکل کو 'لسانی بولی' کہا جاتا ہے۔

(2) سماجی بولیاں: سماج میں طبقاتی فرق کی وجہ سے جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اسے سماجی بولی کہا جاتا ہے۔

(3) علاقائی بولیاں: زبان اپنے مرکز سے دور ہوتی ہے تو اس پر اپنے قریبی علاقوں کا اثر پڑتا ہے اور زبان میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان کی بدلی ہوئی اس شکل کو 'علاقائی بولی' کہتے ہیں۔

یہاں لسانی، سماجی اور علاقائی اثرات کے نتیجے میں بنی اردو کی مختلف بولیوں میں سے چند کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان بولیوں میں بعض کی لسانی حیثیت ہے اور بعض کی سماجی حیثیت۔

پنجابی اردو: یہ اردو کی ایک بے حد اہم بولی ہے۔ اسے پنجابی اردو اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ پنجاب کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ یہ بولی مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب دونوں جگہ بولی جاتی ہے۔ یہ بولی اپنے علاقائی الفاظ سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ چنانچہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی اردو پر پنجابی زبان کے اثرات بڑے گہرے ہیں جس سے اردو کی لسانی ساخت بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔

کلکتیا اردو: یہ کلکتہ شہر میں بولی جانے والی اردو کی ایک زبردست سماجی بولی ہے جو شہر کی مسلمان بستیوں میں خاص طور سے رائج ہے۔ اسے کلکتیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ صرف کلکتہ شہر تک محدود ہے۔ اس پر بنگلہ زبان کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔

کشمیری اردو: جب اردو جموں وکشمیر میں بولی جانے لگی تو وہاں کی علاقائی بولیوں (لداخی، ڈوگری اور کشمیری) سے بہت متاثر ہوئی اور ان تمام بولیوں کے اثرات اردو زبان نے قبول کیے۔ ہر سطح پر کشمیری کے اثرات اردو زبان میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اردو پر پڑنے والے انھیں مقامی اثرات کی بنا پر ہم وہاں کی اردو کو کشمیری اردو کے نام سے پکارتے ہیں۔

کرخنداری: یہ دہلی کے ان علاقوں میں بولی جاتی ہے جسے کبھی شاہ جہان آباد کہا جاتا تھا۔ یہ بولی دہلی کے شہری علاقوں میں جامع مسجد کے اطراف کے علاوہ ان محلوں میں بھی بولی جاتی ہے جہاں مسلمانوں کی گھنی آبادی ہے۔ جن میں اردو بازار، کباڑی بازار، ٹیا محل، لال کنواں، گلی قاسم جان، پہاڑ گنج، صدر بازار، کوچہ پنڈت، فراش خانہ اور چتلی قبر محلے اہم ہیں۔ بالخصوص مزدوروں کی زبان کرخنداری ہے۔ یہ بولی سماج کے ایک مخصوص طبقہ میں رائج ہونے اور سماجی دباؤ کی وجہ سے اردو کی سماجی بولی کہی جاتی ہے۔

مراٹھی بولی: یہ پونا شہر کے اردگرد بولی جاتی ہے۔ مراٹھی اور علاقائی بولیوں کے زیر اثر یہ بولی مراٹھی اردو کہلائی۔ پونا کے علاقے میں اس کے بولنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔

دکنی اردو: عام طور پر جنوبی ہندوستان میں بولی جانے والی اردو کو دکنی اردو کہا جاتا ہے۔دکنی اردو ایک قدیم بولی ہے۔اس کے بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دکنی اردو بولنے والے تامل ناڈو، تلنگانہ، آندھرا پردیش اور کرناٹک کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔متعلقہ علاقوں کی زبانوں کے زیر اثر ان علاقوں کی اردو زبان کے لب ولہجہ میں ایک خاص فرق نمایاں نظر آتا ہے۔اس بولی نے مراٹھی زبان سے بھی اثر قبول کیا ہے۔دکنی اردو میں کئی بڑے شاعروں کے نام ملتے ہیں۔جن میں وجہی، غواصی، نصرتی، سراج اور ولی کے نام قابل ذکر ہیں۔اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق بھی اسی بولی سے ہے۔

سر دست اس مقالے میں قصبہ گنگرالہ کی بولی نے دیگر کون سی زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں اور وہ دکنی اردو سے کس قدر متاثر نظر آتی ہے؟اس پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مدینۃ العلم کہے جانے والے شہر بدایوں سے 14 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع قصبہ 'گنگرالہ' اپنی زبان، اپنی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد پر اپنے گرد ونواح کے قصبات اور علاقوں سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔یہ قصبہ مغربی اتر پردیش سے تعلق رکھتا ہے۔یہ علم وادب کا گہوارہ ہے۔اس سرزمین سے ایسے شعرا کا تعلق رہا ہے جنھوں نے ملک کے طول وعرض میں مقبولیت حاصل کی اور اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔اس اہم اور زرخیز علاقے کے بارے میں نظامی بدایونی لکھتے ہیں:

''گنگرالہ ضلع بدایوں کا ایک ممتاز قصبہ ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کی آبادی قصبات میں سب سے زیادہ ہے بلکہ اس قصبہ میں علمی وادبی ذوق ہمیشہ رہا ہے۔یہاں ہر نو جوان ابتدا ہی سے شاعرانہ جذبات و خیالات کا حامل ہوتا ہے۔اس وقت بھی گنگرالہ میں میرے متعدد عزیز بھائی موجود ہیں جو مشاعروں میں داد وتحسین حاصل کرتے ہیں۔''

(نظامی بدایونی، تقریظ، راز حیات، مرتبہ شاد گنگرالوی، ص6)

یہ قصبہ مغربی اتر پردیش میں اس لیے بھی مشہور ہے کہ یہاں کی بولی بے حد دلچسپ اور اہم ہے۔یہ بولی ہندوستان کی کئی زبانوں کا بے مثال جوڑ ہے۔مسعود حسین خان کے مطابق (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص:59) بدایوں برج بھاشا کا علاقہ ہے۔اس لیے اس علاقے میں برج بھاشا کا اثر پایا جاتا ہے۔لیکن یہاں کے افراد نے معاش کی تلاش میں دہلی اور اس کے اطراف کے علاقوں کا سفر زیادہ کیا، جو اس قصبے اور دہلی کے درمیان ایک رشتہ کی مضبوطی کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔دہلی کھڑی بولی کا علاقہ ہے۔خاصی تعداد میں یہاں کے لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔جس کی وجہ سے یہاں کے افراد نے کھڑی بولی کے اثرات کو بھی قبول کیا۔یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مغربی ہندی کی بولیوں کی درجہ بندی (مسعود حسین خان، مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص 189) جن خصوصیات کی بنیاد پر کی گئی ہے وہ دونوں خصوصیات یہاں کی بولی میں پائی جاتی ہیں یعنی 'او' کو ترجیح دینے والی بولی برج بھاشا اور 'ا' کو ترجیح دینے والی بولی کھڑی بولی دونوں کا اثر پایا جاتا ہے۔

لسانیات میں یہ بات بار ہا بتائی جاتی ہے کہ زبان ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر طے کرتی ہے اور وہاں کی علاقائی بولیوں سے متاثر ہو کر اپنی اصل شکل سے کچھ تبدیل ہو جاتی ہے۔گنگرالہ میں بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اس قصبے کی بولی کا جب مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں دکنی اردو کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے اور دکنی صوتی وصرفی ہیئت سے زیادہ متاثر نظر آئی۔لیکن سوال یہ ہے کہ تقریباً 1500 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع اس قصبے کی بولی دکنی اردو سے کس طرح اور کیسے متاثر ہوئی؟ راقم نے اس سلسلے میں قصبے کے چند بزرگ اشخاص سے بات کی تو معلوم ہوا کہ اس قصبہ کے لوگ کچی شکر بنانے میں ماہر ہیں۔جس کا ذکر ڈاکٹر شمس بدایونی نے (نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، ص 37) میں بھی کیا ہے۔حیدر آباد کے علاقے میں شکر بنانے کی کئی ملیں تھیں۔ان ملوں کو چلانے کے لیے یہاں کے لوگوں نے کافی دلچسپی لی۔یہ لوگ اصطلاح میں 'سیٹھ' کہلائے۔یہ سیٹھ قصبے سے مزدوروں کو لے جاتے تھے اور یہ مزدور وہاں رہ کر مہینوں کام کرتے۔ جس کا سلسلہ کئی برسوں سے آج تک دراز ہے۔میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ زبان ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر طے کرتی ہے۔یہاں کے لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا اور یہاں کے لوگوں نے دکنی اردو کے اثرات کو قبول کیا۔دکنی الفاظ وتراکیب کا سیدھا اثر گنگرالہ کی بولی پر پڑا۔یہاں اس امر پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ کیا دکن سے باہر بھی دکنی اردو (دکنی لب ولہجہ یا انداز بیان) کے بولنے کا رواج رہا ہے یا نہیں؟اس اہم مسئلے پر ہمیں پروفیسر فیروز احمد کا وہ مضمون یاد آتا ہے جو انھوں نے ''دکن سے باہر دکنی (راجستھان کے تناظر میں)'' کے عنوان سے لکھا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دکن سے باہر راجستھان کے علاقے میں ایسے کئی شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں دکنی لب ولہجہ اختیار کیا اور اپنی زبان کو 'دکنی' کہا۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس کی مخصوص صرفی اور نحوی ساخت کی بعض مثالیں دکن سے باہر ان علاقوں میں بھی ملتی ہیں جہاں کی زبان مسلمانوں کے ورود دہلی سے قبل راجستھان سے لے کر ملتان اور لاہور تک پھیلی ہوئی تھی........

مثنوی فیض عام کے مصنف عبدالحمید نے اپنی زبان کو دکنی کہا تھا لیکن تاریخ غریبی کا مصنف باوجود اس کے کہ وہ عبدالحمید کا ہم عصر اور مہدویہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے، اپنی زبان کو دکنی نہیں بلکہ 'ہندی' کہتا ہے۔مگر اس کی یہ 'ہندی' زبان اردو کی ہی قدیم شکل ہے۔جس کی صَرف میں جا بجا دکنی اور راجستھانی کے لسانی عناصر موجود ہیں۔

(پروفیسر فیروز احمد، تحقیقات، دکن سے باہر دکنی راجستھان کے تناظر میں، ص 82,96)

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ دکن سے باہر بھی دکنی لب ولہجہ اور انداز بیان رائج رہا ہے۔اس طرح قصبہ گنگرالہ کی بولی برج بھاشا، کھڑی بولی اور دکنی اردو سے متاثر نظر آتی ہے۔ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ اس اہم بولی کو آج تک کسی نام سے یاد نہیں کیا گیا۔جب اس سلسلے میں راقم نے ڈاکٹر نعمان طاہر (شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے ملاقات کی تو انھوں نے اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ملاقات کے بعد ہم دونوں میں یہ طے پایا کہ صرفی اور نحوی خصوصیات کی بنیاد پر اس بولی کو 'گنگرالوی اردو' کے نام سے یاد کیا جائے۔

ذیل میں دکنی اردو اور گنگرالوی اردو کے درمیان لسانی مماثلت وخصوصیات میں سے چند کا ذکر کیا جا رہا ہے۔یہاں ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ پہلے دکنی اردو کی خصوصیت کو لکھا ہے، پھر اس خصوصیات کو واضح کرنے کے لیے مثالیں پیش کی ہیں اور آخر میں گنگرالوی اردو میں اس لفظ یا خصوصیات کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی لکھا ہے۔

دکنی اردو میں الفاظ کی تکرار کرتے وقت پہلے لفظ کے آگے 'ے' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔جیسے 'بال بال' کی جگہ 'بالے بال' استعمال کیا جاتا ہے۔یہی صورت حالت گنگرالہ میں بھی ہے۔اس عمل کو لسانیات میں Reduplication کہتے ہیں۔مثلاً:

(1) بال بال۔بالے بال

جملے میں استعمال: دیکھا قطعی [بالے بال] بچے۔

(2) جنگل جنگل۔ جنگلے جنگل

استعمال: واں نرا [جنگلے جنگل] ہا۔

حروف استثنا ایک چیز یا شخص کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ اردو میں بغیر اور بجز حروف استثنا ہیں۔ دکنی میں ان کے لیے 'بن'، 'بنا' اور 'باج' لفظ ملتے ہیں۔ گکرالہ میں بھی حروف استثنا یہی ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(1) بن۔ بغیر

استعمال: تونے [بن] دیکھے کیسے یقین کرلیا۔

(2) بنا۔ بغیر

استعمال: جاکے [بنا] کام نابنے آ۔

دکنی اردو کی خصوصیات میں یہ بھی شامل ہے کہ 'خود' کی جگہ ''آپس' کا استعمال ملتا ہے۔ گکرالہ میں بھی 'خود' کی جگہ 'آپس' کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً

خود۔ آپس

(1) استعمال: یہ ان کی [آپس] داری کا معاملا ہے۔

(2) استعمال: [آپس] میں مل بیٹھ کے حل نکال لے او۔

اردو کی طرح دکنی میں بھی مصدر کا لاحقہ 'نا' ہے لیکن بعض اوقات 'ن' استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے 'دیکھن' اور 'بولن'۔ گکرالہ میں بھی یہی طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ دو مثالیں دیکھیں:

(1) دیکھنا۔ دیکھن

استعمال: ہم با کو [دیکھن] گئے ہے۔

(2) بولنا۔ بولن

استعمال: با کو [بولن] دے۔

دکنی اردو کی طرح یہاں کی بولی میں بھی عددی شکلوں میں کہیں کہیں فرق ملتا ہے جیسے 'پیلا'، 'دسرے'، 'تسرے' وغیرہ۔ دو مثالیں دیکھیں۔

(1) پہلا۔ پیلا

استعمال۔ جا کا [پیلا] نمبر ہے۔

دوسرا۔ دسرے

استعمال: تو [دسرے] نمبر پے آئے گا۔

دکنی اردو کی طرح یہاں بھی لفظ کے درمیان آنے والی 'ہ' کو حذف کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ جیسے لفظ 'کہاں' کی درمیانی 'ہ' حذف کرنے پر یہ 'کاں' ہو جاتا ہے۔

(1) استعمال: [کاں] جائے راہئے۔

اسی طرح 'وہاں' کا 'واں' ہو جاتا ہے۔

(2) استعمال: [واں] کیوں جائے راہئے۔

دکنی اردو کی طرح یہاں بھی اس طرح کی تمیزیں ملتی ہیں۔ یاں، واں، اگے۔ اپر وغیرہ۔

تمیز۔ وہ کلمہ یا لفظ ہے جو فعل یا صفت یا دوسری تمیز کے معنی میں کمی وبیشی پیدا کرے یا اس کی کیفیت یا حالت بتائے۔ جیسے اب، جب، تب، جہاں، وہاں اور کب وغیرہ۔

دکنی اردو کی طرح یہاں مضارع کی حسب ذیل بناوٹیں ملتی ہیں۔

چلے، پاوے، جائے، دیوے وغیرہ۔

(1) استعمال: آج موکو جان [دیوے]

(2) استعمال: [جائے] آئیے۔

یہاں دکنی اردو کی طرح علامات مفعول 'کو'، 'کوں' اور 'تئیں' ہیں۔

استعمال: عادل کے [تئیں] خط لکھا۔

یہاں دکنی اردو کی طرح اسم کیفیت کے آخر میں 'اٹ'، 'ت'، 'ئی' وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

گھبرانا۔ گھبراٹ

استعمال: آج بہوت [گھبراٹ] ہے۔

یہاں دکنی اردو کی طرح بڑے مصوتوں کو چھوٹے مصوتوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ دو مثالیں دیکھیں۔

(1) آسمان۔ اسمان

استعمال: آج [اسمان] دیکھو کیسا ہے۔

(2) سورج۔ سُرج

استعمال: آج [سُرج] کیسا لال ہے۔

دکنی اردو کی طرح چھوٹے مصوتوں کو بڑے مصوتوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ دو مثالیں دیکھیں۔

(1) پہر۔ پہار

استعمال: تو آج دو [پہار] کاں ہا۔

(2) سچ۔ ساچ

استعمال: [ساچ] ساچ بولا کر۔

یہاں مصوتوں کو انفیانے کا عمل ('ں' کا اضافہ کرنا) بھی پایا جاتا ہے۔

(1) چائے۔ چائیں

استعمال: [چائیں] بنالے آو۔

(2) سپنا۔ سپناں

استعمال: آج میں نے بہوت برا [سپناں] دیکھا۔

یہاں انفیت کو حذف بھی کردیتے ہیں۔

(1) کنواں۔ کُوا

استعمال: جو [کُوا] سوکھ گیا۔

یہاں نفسیات (ہکاریت) کا حذف کرنا بھی پایا جاتا ہے۔ جن لفظوں میں 'ھ' کا استعمال ہوتا ہے انھیں ہاکاری آوازیں کہا جاتا ہے۔ مثلاً:

(1) سوکھا۔ سوکا

استعمال: جا سال [سوکا] ہے۔

(2) تمھاری۔ تماری

استعمال: [تماری] پنسل کاں ہے۔

الف مقصورہ (مصوتہ) کا تلفظ دروایدی صوتیات کے تحت 'ی' کیا جاتا ہے۔ یہ بول چال کی دکنی اردو میں عام ہے۔ گکرالہ میں بھی یہی عام ہے۔ مثلاً

(1) اتنا۔ اتی

استعمال: [اتی] سی روٹی کھائے آ۔

آوازوں کو مشدد کرنے کا عمل بھی دکنی کی طرح یہاں بھی ہے۔ مثلاً

(1) چادر۔ چدر

استعمال: جا [چدر] گیلی ہے۔

(2) کھادر۔ کھدر

استعمال: جو [کھدر] دیکھو کیسا ہے۔

یہاں دکنی کی طرح الفاظ کو مخفف کرنے کا عمل بھی پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے علاوہ دکنی اردو کی اور بھی کئی خصوصیات یہاں کی بولی میں پائی جاتی ہیں۔ اس گفتگو سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ گکرالہ کی بولی نے دکنی اردو کے جو صوتی اور صرفی اثرات قبول کیے ہیں ان کی بنیاد پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ بولی دکنی اردو کی ایک سچی جانشین ہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ یہ بولی برج بھاشا اور کھڑی بولی سے متاثر نظر آتی ہے۔ لیکن جس قدر یہاں دکنی اردو کے الفاظ وتراکیب کی بھرمار اور ان کا استعمال ملتا ہے اتنا کسی دوسری بولی کا نہیں ملتا۔ اردو لسانیات کے ماہرین کی نگاہ ان امور پر نہیں البتہ اس ذیل میں سب سے بڑا ثبوت پروفیسر فیروز احمد کا مضمون ''دکن سے باہر دکنی (راجستھان کے تناظر میں)'' ہے جو میرے اس مطالعے کی توثیق کرتا ہے۔ جس پر سنجیدگی سے کام کی اشد ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ فی زمانہ مقامی ادب اور بولیوں پر زور دیا جا رہا ہے تا کہ کسی بھی زبان اور اس کے ادب اور ثقافت کے مقامی رنگ کی تفہیم کی جا سکے۔ اکتوبر 2019 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دفتر میں ہوئی ایک میٹنگ میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ ہمیں علاقائی بولیوں کے الفاظ کو محفوظ کرنے اور لغات تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

■

Mohd Amil Badayuni
64, Aftab Hostel
Aligargh Muslim University
Aligarh - 202001
Mob.:9927834915
Email: mohdamil48@gmail.com

مصطفی علی

متن، قرأت اور معانی کے چند وظائف

ادبی متن کی قرأت اور اس سے درست معانی کی یافت بھی ایک فن ہے۔ کسی متن کو متن تسلیم کر لینے کے بعد سب سے پہلے تو یہ طے کرنا پڑے گا کہ متن ادبی ہے یا غیرادبی، اگر غیرادبی ہے تو وہ متن ہماری بحث سے خارج ہے اور اگر ادبی ہے تو یہ سوچنا پڑے گا کہ اس کی قرأت (بہ لحاظِ تفہیم وتاویل) کا زاویہ کیا ہو، آزاد یا پابند؟ اب یہاں پر دشواری یہ طے کرنے میں ہے کہ متن کی آزادانہ قرأت سے درست معنی تک رسائی حاصل ہوگی یا کسی نظریے کی پابند قرأت سے۔ اگر آزادانہ قرأت طے پائی تو ایک بات ہوئی اور اگر نظریاتی قرأت جواب آیا تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ کس نظریے کا پابند ہو۔ ترقی پسند، جدید، مابعد جدید یا کوئی اور؟ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو متن جس زمانے میں یا جس نظریے سے تحریک پا کر تخلیق کیا گیا ہو اسے اسی نظریے سے پڑھنا ٹھیک ہوگا تو پھر امیر خسرو، ولی، میر اور داستانوں و مثنویوں کو کس نظریے کے تحت پڑھا جائے گا؟ یا اگر مان ہی لیں کہ زید نے اپنے کو ترقی پسند نظریے کا پابند بنا لیا اور ترقی پسند دور کے ہی کسی فن پارے کو اپنی قرأت کا موضوع بنایا تو کیا اس کی قرأت سے برآمد شدہ معانی درست ہی ہوں گے؟ اور یہ طے کون کرے گا کہ متن کے جو معنی زید نے سمجھے ہیں وہ درست ہیں کہ نادرست؟

مذکورہ بالا بیان سے یہ قطعی نہ سمجھا جائے کہ کسی فن پارے کی نظریاتی قرأت صحیح نہیں۔ میں تو بس یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ متن کی قرأت جس زاویے کا تقاضا کرے اور جس سے اس کو کما حقہ سمجھا جا سکے اسی زاویے سے اس کی قرأت کی جائے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ایک متن کی قرأت محض ایک ہی زاویے سے ممکن ہے، جہاں پر بھی الگ الگ زاویہ قرأت کے نتیجے میں قاری کے ذہن میں کیفیت وتاثر کے الگ الگ زاویے بنتے ہوں یا معنی کے کثیر الجہات پہلو روشن ہوتے ہوں وہاں مختلف زاویوں کے حوالے سے متن کے تخلیقی تنوع کا عرفان اسے حاصل کرنا چاہیے۔

کسی فن پارے کی قرأت کا زاویہ واحد ہو یا مختلف مگر قرأت کئی بار ہونی چاہیے کیونکہ الفاظ گنجینۂ معانی کا طلسم ہوتے ہیں؛ ان کے بندھن میں کوئی ایک معنی نہیں بندھا ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی دفعہ کی قرأت میں فن پارہ قاری کے پلے ہی نہ پڑے یا پڑے بھی تو بعد والی کسی قرأت میں اس سے ہٹ کر کوئی ایسا معنی ہاتھ لگ جائے کہ وہ اچھل پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ قرأت کو ایک بے حد صبر آزما کام تصور کیا جاتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کے الفاظ میں کہیں تو 'قرأت ایک عمل ہی نہیں، ایک پورا عملیہ ہے' مکمل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ہر تخلیقی متن کئی لسانی اور تکنیکی پیچیدگیوں کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ وہ بہ یک وقت کئی نسلوں کو خطاب کرتا ہے اور کئی دماغوں اور تخیلات سے گزر کر ہم تک پہنچتا ہے۔ قرأت ہمیشہ صبر کی متقاضی ہوتی ہے اور تخلیق از خود بے حد شرمیلی، کم گو، نخریلی، شوخ اور چنچل ہوتی ہے ایک دم نہیں کھلتی اس کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ جب کہیں جا کر تھوڑی بہت، زیادہ سے زیادہ آپ کے قابو میں آتی ہے اور پھر نکل جاتی ہے۔ حصولِ معنی اس طرح صبر کا تقاضا کرتا ہے جس طرح بقول ٹیری ایگلٹن ہمیں عقل ڈاڑھ کو نکلوانے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قرأت ایک عمل ہی نہیں ایک پورا عملیہ (پروسیس) ہے۔''

(بحوالہ: مجلّہ ارمغان، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، شمارہ 6، مقالہ: قاری اور قرأت از عتیق اللہ، ص 18-117)

قاری کو ہر قرأت میں سابقہ قرأت سے مختلف یا اضافے کی صورت میں کچھ نیا معنی و مفہوم فراہم ہو سکتا ہے، اس لیے اس کو کسی بھی متن کے سرسری مطالعے سے پرہیز کرنا چاہیے اور متن کے غائر مطالعے سے جو معنی ہاتھ لگے اسے بروقت اپنی درست رائے تسلیم کر لینی چاہیے۔ بروقت اس لیے کیونکہ بعد میں کسی موقع محل (Situation) کے تحت خود اس کے یا کسی اور قاری کے ذہن میں متن کے معنی کا کوئی نیا اور پہلے سے بہتر یا ان دونوں میں سے کوئی ایک پہلو آشکار ہو سکتا ہے۔ قاری کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی معنی متن کے ساتھ دائمی طور پر مختص نہیں کیا جا سکتا۔ اسی بات کو پروفیسر عتیق اللہ یوں بیان کرتے ہیں:

''کوئی بھی شعری یا افسانوی شہ پارہ کسی ایک خیال یا کسی ایک معنی نہیں خیالات اور معنی کے گچھوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور زبان کا اپنا مجرد اور تخلیقی عمل اسے نامانوس اور اجنبی بنا دیتا ہے۔ شاعری ہی نہیں فکشن میں بھی بہت کچھ مقدر چھوڑ دیا جاتا یا چھوٹ جاتا ہے جنھیں قاری کو قیاس کرنا پڑتا ہے.... ہر دوسری قرأت پہلی قرأت کو پیچھے ڈھکیل دیتی ہے اور خود کو اجنبی بنانے کے لیے تیار بھی ہو جاتی ہے۔ تنقیدی قرأت دراصل کئی قرأتوں کو اجنبی بنانے کا مجموعہ ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص 116)

دراصل الفاظ پردۂ متون میں وہ معنی بھی بیان کر جاتے ہیں جو منشائے مصنف اور منشائے متن سے خارج ہوتے ہیں کیوں کہ کسی معنی کی غلامی متن کی سرشت میں شامل نہیں ہوتی۔ جب تک متن کا وجود باقی رہے گا قاری اس کی قرأت سے نئے معانی دریافت کرتا رہے گا۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں مگر میں یہاں ایک کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ میر کو کافی عرصے تک لوگ رونے رلانے اور دل و دلی کی مرثیہ خوانی کرنے والا شاعر گردانتے رہے مگر عصرِ حاضر کے معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے جب کلامِ میر کی قرأت کی تو انھیں ایک نیا اور منفرد گوشہ نظر آیا۔ جس کی بنا پر انھوں نے میر سے متعلق روایتی مفروضے کو غلط قرار دے دیا اور میر کے خدائے سخن ہونے کی دوسرے مدلل و معتبر وجوہات کو پیش کیا مثلاً ڈرامائی اور افسانوی اظہار، جنس اور عشق کے معاملات میں بے تکلفی، زبان کے سلسلے میں تحکمانہ اور بے پروانہ انانیت، رعایت لفظی

سے شغف، استعارہ اور پیکر کی کثرت، معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کا التزام، حس مزاح اور طنز کی فراوانی، کائناتی احساس جو بیک وقت مقامی بھی ہے اور مقام سے ماورا بھی، تصوف سے واقعی اور اصلی دلچسپی وغیرہ۔

اس فہرست میں ہم کلیم الدین احمد کا نام 'اردو شاعری پر ایک نظر' کے حوالے سے اور شمیم حنفی کا نام بھی 'کہانی کے پانچ رنگ' کے حوالے سے جوڑ سکتے ہیں اور کلام غالب و اقبال کی متعدد شرحوں کا وجود بھی اس کی زندہ مثال ہے۔

ملٹن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ مقبول رہے گا کیونکہ اسے کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ سچ ہے کہ شہرت یافتہ ادیب ہر دور میں بڑا ادیب تسلیم کر لیا جاتا ہے اور المیہ یہ ہے کہ بغیر مطالعے کے کر لیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی ادیب کو خواہ وہ مقبول ہو یا نا مقبول، اس کے متعلق تسلیم شدہ آرا سے متاثر ہوئے بغیر پہلے پڑھا جائے پھر جو بھی تاثر قائم ہو اسے تسلیم کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ مقبول ادیب از سر نو پڑھا جائے تو اس کی مقبولیت پر سوالیہ نشان نہ لگے۔ ہو سکتا ہے اس کی شہرت کے دعوے میں جو دلیل پیش کی گئی ہو وہ باطل ہو جائے یا پھر اس کی مقبولیت کی کوئی نئی جہت مل جائے۔

اختلاف جنس پر بھی معنی متن تبدیل ہو سکتا ہے۔ مرد اور عورت دو الگ جنس ہیں۔ دونوں کی طبیعت، ان کے مسائل اور ضروریات بھی مختلف ہیں، اس لیے ان کے زاویہ نگاہ بھی مماثل نہیں۔ کسی متن یا فن پارے میں بہت سی ایسی باتیں مضمر ہوتی ہیں، مرد کو جن کی ہوا تک نہیں لگتی اور عورتیں ان کو بآسانی پہچان لیتی ہیں، اس لیے کسی متن کی قرأت سے جو معنی مرد اخذ کرے گا یا جو اثرات اس پر مرتب ہوں گے ضروری نہیں کہ اس متن سے عورت بھی وہی معنی مستنبط کرے یا وہی اثرات اس پر بھی مرتب ہوں۔ مثال کے طور پر نیر مسعود کا ایک مشہور افسانہ ہے 'طاؤس چمن کی مینا'۔ اس افسانے پر اظہار خیال کرنے والوں میں سے ہم ایک مرد 'قاضی افضال حسین' اور ایک عورت 'سیما صغیر' کو منتخب کر لیتے ہیں۔ ان دونوں نے دو مختلف نظریات کی روشنی میں اس کی قرأت کی ہے۔ قاضی افضال نے مابعد جدید اور سیما صغیر نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا ہے لیکن ہمیں یہاں نظریاتی اختلاف اور تجزیاتی فضیلت سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ان دونوں سے الگ ایک اختلاف ہے جنس کا، ہمارا مدعا یہی Gender conflict ہے۔

جب قاضی افضال حسین اس افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں تشکیل و لاتشکیل کی عینک سے چمن، قفس، تاریخ، تہذیب، طلسم اور روایت تو خوب نظر آتا ہے مگر کالے خاں کی بے ماں کی بیٹی کے جذبات اور باپ بیٹی کے رشتے کی لطیف و نازک کیفیات کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ اس ننھی بچی کا بس ایک بار ذکر ہوتا ہے اور وہ بھی عام چھوٹی بچیوں کی طرح۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اسی طرح ایجادی قفس کی فلک آرا اور کالے خاں کی فلک آرا جو آواز کی مٹھاس و حرارت تک میں یکساں ہیں، ایک دوسرے کے معنی کو وہ جہات فراہم کرتے ہیں، جو اس افسانے میں ابھرتے ہیں یعنی ان دونوں کے صفات کی یکسانیت کے حوالے سے یہ کہانی ایجادی قفس کے اندر کی معلوم ہوتی ہے اور کبھی اس تمثیلی قفس کے باہر کی۔ کبھی کبھی فلک آرا پرندہ سے زیادہ شہزادی معلوم ہوتی ہے اور کبھی کالے خان کی فلک آرا وہ معصوم پرندہ لگتی ہے جو اس قفس رشہر میں آزادی لطافت اور شفقت سے معمور زندگی گزار رہی ہے۔''

(طاؤس چمن کی مینا: حسن تشکیل کا افسانہ رتاریخ کی لاتشکیل، قاضی افضال حسین، مشمولہ: متن کی قرأت، ص 139)

اور جب سیما صغیر اس افسانے کا مطالعہ کرتی ہیں تو وہ ترقی پسند آلے سے کالے خان کو غریب، مزدور، محنت کش، بادشاہ کو مطلق العنان اور معاشرہ کو فیوڈل ہی نہیں مانتی بلکہ ان کی نظر اس ننھی سی بے ماں کی بچی پر بھی مرکوز ہوتی ہے اور تہی دست باپ پر بھی اور ان کی نظر میں باپ، بیٹی کے یہ نازک جذبات کہانی کا بنیادی تھیم بن جاتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''کہانی کا مرکزی نقطہ وہ انسانی واردات ہے جس میں ایک باپ اپنی بے ماں کی بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر اس کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کے لیے بادشاہ کے چمن سے ایک پہاڑی مینا چرا کر گھر لاتا ہے جب کہ اس کو طاؤس چمن کی نگہداری کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس طرح محبت اور ضمیر کی کش مکش جو اصلاً انسانی فطرت کے تضادات کا مظہر ہے اور جس کو کسی خاص وقت اور مقام سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا، کہانی کی بنیادی تھیم قرار پاتی ہے۔''

('طاؤس چمن کی مینا' کا تجزیاتی مطالعہ: ترقی پسند نقطۂ نظر سے، مشمولہ: متن کی قرأت، ص 144)

اسی طرح مشرف عالم ذوقی کے ناول 'لے سانس بھی آہستہ' کی قرأت سے جو نقطہ شائستہ فاخری اور دوسری عورتیں دریافت کر لیتی ہیں ستیہ پال آنند اور دوسرے مردوں کو ان کے وجود کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ایک اور مثال غضنفر کے ناول 'فسوں' کی ہے۔ اس کو شافع قدوائی اور سیما صغیر دونوں نے جس انداز سے پرکھا ہے اس میں بھی مردانہ اور زنانہ نظریاتی افتراق در آیا ہے۔

جس طرح اختلاف جنس سے ایک ہی متن کی قرأت سے الگ الگ معنی کی دریافت ممکن ہے، اسی طرح نظریاتی اختلاف سے بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر عتیق اللہ رقم طراز ہیں:

''ضروری نہیں کہ دو ناظرین یا قارئین کسی ایک رائے یا ردعمل پر متفق ہوں کیونکہ رائے زنی کا بھی ایک سیاق ہوتا ہے اور رائے زنی کرنے والے کے ذوق و مذاق کی بھی ایک سطح ہوتی ہے نیز بیشتر صورتوں میں اس سوال کی اہمیت ہے کہ آپ اس چیز کو کس زاویے سے دیکھ رہے ہیں یا وہ چیز کس رخ سے آپ کو نظر آ رہی تھی اور دیکھنے کے اس عمل کا سیاق و سباق کیا تھا، انسان کا اپنا داخلی جبر و دباؤ ہی اپنا اثر نہیں دکھاتا، خارجی جبر و دباؤ کا اثر بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے قرأتوں میں جہاں اشتراک کی صورتیں واقع ہوتی ہیں وہیں ان میں کم یا زیادہ افتراق و اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔''

(بحوالہ: مجلہ ارمغان، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، شمارہ: 6، مقالہ: قاری اور قرأت از عتیق اللہ، ص 123)

آپ کو معلوم ہوگا کہ 'نظیر اکبرآبادی' کو ترقی پسندی سے قبل وہ رتبہ و مرتبہ حاصل نہیں تھا جو انہیں اس تحریک کے بعد حاصل ہوا۔ ترقی پسند ناقدین نے جب اپنے قائم کردہ اصول و نظریات کی روشنی میں اردو شاعری کو پرکھنا شروع کیا تو انھیں نظیر اکبرآبادی بڑا شاعر لگا اور غالب چھوٹا۔ انھوں نے بڑے کے بڑا ہونے کا اعلان تو کر دیا مگر ان کی سوئی اٹکی غالب پر۔ اس موقعے پر ان کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں: پہلی تو یہ کہ وہ اپنے متعینہ تنقیدی اصولوں پر کلام غالب کو پرکھیں اور غالب کو چھوٹا موٹا شاعر کہہ دیں اور دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کلام غالب کو پڑھنے کا کوئی دوسرا ڈھنگ اختیار کریں۔ پہلی صورت اختیار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ غالب کے عظیم شاعر ہونے پر اس وقت تک اجماع ہو چکا تھا، ایسے میں وہ اسے چھوٹا کہہ کر اپنی فضیحت کیوں کراتے، لہٰذا اس وقت احتشام حسین جیسے قد آور ترقی پسند ناقد اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں کلام غالب کی قرأت کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اسی طرح فیض کی نظم 'صبح آزادی' کے تعلق سے علی سردار جعفری کی رائے کو دیکھ لیجیے۔ یہ فیض کی معروف ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ پڑھنے کے بعد لوگوں نے اس نظم کی خوب پذیرائی کی لیکن جب اس نظم کی قرأت ترقی پسند ناقد علی سردار جعفری نے کی تو ان کو اس نظم کا آخری (مرکزی) مصرع 'چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی' کسی پر بھی فٹ بیٹھتا نظر آیا اور اس طرح یہ نظم کسی بھی تحریک

کی ترجمانی کرتی ہوئی معلوم ہوئی اس لیے انھیں ترقی پسند نقطۂ نظر سے یہ نظم کسی خاص اہمیت کی حامل نظر نہیں آئی۔

متن کی قرأت اگر بغور کیا جائے تو اس سے اسلوب نگارش کی پہچان سے عہد اور مصنف کی پہچان بھی ممکن ہے۔ خالق باری کو لوگ بڑے زمانے تک امیر خسرو کی تصنیف سمجھتے رہے لیکن جب حافظ محمود خان شیرانی نے اس کی قرأت کی تو اس کے اسلوب کو پہچان لیا اور اسلوب کی شناخت کی بنیاد پر ہی انھوں نے اس کے عہد کو جانا پھر عہد اور اسلوب کی بنیاد پر خالق باری کے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح شاعر عرب کو جب اطلاع دی گئی کہ دیوار کعبہ پر تم سے عمدہ کلام معلق ہے تو وہ بھاگا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کی قرأت کرتے ہی پکار اٹھا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ در اصل اس دیوار پر کلام اللہ کی ایک چھوٹی سورۃ 'سورۃ الکوثر' لٹکائی گئی تھی اور شاعر کو عربی شعرا کے اسلوب کی بخوبی جانکاری تھی، اس لیے اول قرأت ہی سے اس نے جان لیا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔

ایک آخری بات یہ کہ ادبی وفنی اصولوں کے تحت پڑھنا ادبی متن کی قرأت کی ترجیحی صورت ہونی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو قاری آزادانہ طور پر فن پارے کے درست معنی و مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہر خلفشار و اعتراض سے محفوظ بھی رہے گا اور اس کی یہ قرأت غیر جانبدارانہ تسلیم کی جائے گی۔ خاص بات یہ ہے کہ ہر نظریے کے افراد اس سے متفق بھی ہوں گے۔ جس طرح انسان کو انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے پر ملک و مذہب کی دیوار آڑے نہیں آ سکتی یعنی کوئی اس پر ہندو، مسلم، یہودی، عیسائی یا ہندوستانی، پاکستانی، افریقی، یورپی ہونے کے تعصب کا الزام نہیں لگا سکتا اور اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے انسانیت کے نظریے سے انسان کو کیوں دیکھا تمھیں اس کو فلاں مذہب یا ملک کے آئینے میں دیکھنا چاہیے تھا، ٹھیک اسی طرح ادبی متن کو ادب کے نقطۂ نگاہ سے پڑھنے پر کوئی نظریہ رکاوٹ نہیں بن سکتا اور کسی بھی نظریے کا ماننے والا اس سے یہ نہیں کہہ پائے گا کہ تم نے ادبی متن کو ادبی اصولوں کے تحت کیوں پڑھا تمھیں اس کو فلاں نظریے سے پڑھنا چاہیے تھا۔ کسی نظریۂ مخصوصہ کے پابند قاری کے گلے میں تعصب کی گھنٹی باندھنے سے کوئی دریغ نہیں کرتا۔ پروفیسر عتیق اللہ ایسے ہی لوگوں کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک قاری متعصب یا جانب دار ہوتا ہے جو کسی خاص نظریے یا عقیدے کا پابند ہوتا ہے یا علاقائی اور گروہی عصبیت کے باعث اس میں معروضیت اور کشادگی ذہن ونظر کی گنجائش کم سے کم ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص 123)

اسی لیے میرا ماننا تو یہی ہے کہ کسی بھی متن کی قرأت ادبی وفنی اصولوں کے تحت اس دور کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی سیاق وسباق میں کی جانی چاہیے۔ یہ منصف میزان ہوگا ورنہ تحریکاتی ور جحاناتی قرأت چاہتی ہے کہ متن وہی کہے جو وہ اس سے کہلوانا چاہتی ہے، گویا ایک طرح سے وہ مجبور کرتی ہے کہ متن اس کے مطابق تھیوری اور معانی بیان کرے۔ ظاہری بات ہے کہ اس طرح متن سے مبنی بر انصاف معانی کی دریافت ناممکن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادانہ قرأت ہی بہتر تسلیم کی جانی چاہیے۔ ہاں اگر آزادی ایسی نہ ہو کہ متن آم کی خصوصیات سے متصف ہو اور قاری اپنی قرأت سے املی تصور کر بیٹھے۔ جس معنی کا متن میں کوئی سیاق موجود نہ ہو اگر آزادی قرأت سے قاری اس طرف بھٹک رہا ہو تو ضروری ہے کہ اس کے پاؤں میں کوئی نظریاتی بیڑی ڈال کر ہی محفل متن میں رقص کرنے کے لیے لایا جائے، ورنہ ناظرین معانی برہم ہو کر چلے جائیں گے۔ ایسی ہی آزادی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے پروفیسر کوثر مظہری لکھتے ہیں:

''بے شک قاری کو یہ آزادی ہے کہ وہ متن سے معنی اخذ کرے اور اپنی طرح کرے، لیکن وہ اس قدر بھی آزاد نہیں کہ اس متن کو اس کی اصل سے اتنی دور لے جائے کہ متن اور اس میں سانس لیتے ہوئے تہذیبی اور ثقافتی نشانات وعلامات (Cultural signs) کا دم چھولنے لگے۔'' (قرأت اور مکالمہ، کوثر مظہری، ص 13)

ہر قاری کی اپنی لیاقت اور استعداد ہوتی ہے۔ یہ قطعی ضروری نہیں کہ اسے ہر فن پارے کا متن سمجھ آ ہی جائے۔ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی متن اسے مہمل معلوم ہو مگر وہ بامعنی ہو۔ ندا فاضلی کا ایک شعر ہے۔

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

اس شعر کو بہت سوں نے بے معنی خیال کر کے چھوڑ دیا مگر یہ شعر تھا بامعنی اور اس نے اپنی معنویت ثابت بھی کرالی اور آج کی تاریخ میں یہ شعر جدید دور کا اعلامیہ بن چکا ہے۔ کبھی کبھی متن واقعی مہمل ہوتا ہے، اس صورت میں اگر اسے معنی سے عاری گردانا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر اکثر قاری اپنی کم فہمی کی بنا پر گچا کھا جاتا ہے۔ دونوں صورتیں بعید از قیاس نہیں۔ پروفیسر کوثر مظہری اس سلسلے میں بالکل درست فرماتے ہیں:

''کبھی کبھی آپ جس طرح متن کو بے معنی اور از کار رفتہ سمجھ کر پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح متن بھی قاری کو کبھی کبھی ٹھینگا دکھا دیتا ہے۔ وہ بھی قاری کا منہ چڑھاتا ہے۔ جس طرح ہم آپ متن کی اوقات پر گفتگو کرتے ہیں اس کے ڈھیلے پن اس کی فرسودگی کو زیر بحث لاتے ہیں، متن بھی قاری کی بے ذوقی اور کچے تنقیدی شعور کو کوستا ہے۔'' (ایضاً، ص 9)

خیر! یہ رہے متن کی قرأت اور اس کے معانی کے چند وظائف۔ ان متذکرہ وظائف کی روشنی میں میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ ادبی متن کی قرأت اور اس سے درست معانی کی یافت بھی ایک فن ہے، جو کہ خود متن کی سیپ میں گہر کی طرح پنہاں ہے لہٰذا جس کو اس معانی گوہر بار کی دولت سے مالا مال ہونا ہو اسے چاہیے کہ اس میں غوطہ لگائے اور اپنی مراد پائے۔

معاون کتب:

1. متن کی قرأت (مجموعۂ مقالات سیمینار منعقدہ 25,26 نومبر 2006)، مرتبہ: صغیر افراہیم، شائع کردہ: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سنہ اشاعت: 2007
2. قرأت اور مکالمہ، کوثر مظہری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی 6، سنہ اشاعت 2010
3. معرفت شعر نو (تنقیدی مضامین)، شمس الرحمن فاروقی، مرتبہ: سید ارشاد حیدر، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد 59، سنہ اشاعت 2010
4. شعر شور انگیز (تیسرا ایڈیشن مع ترمیم واضافہ)، شمس الرحمن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 66، سنہ اشاعت 2006
5. افسانوی ادب کی نئی قرأت، صغیر افراہیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2، سنہ اشاعت 2011
6. لے سانس بھی آہستہ کا تہذیبی پس منظر، جہاں نظیر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنہ اشاعت 2013
7. فکشن مطالعات (پس ساختیاتی تناظر)، شافع قدوائی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6، اشاعت 2010
8. شعر، غیر شعر اور نثر (طبع سوم تصحیح شدہ ایڈیشن)، شمس الرحمن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 66، سنہ اشاعت 2005
9. اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 4
10. کہانی کے پانچ رنگ، شمیم حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 25، اشاعت: دسمبر 1983
11. مجلّہ 'ارمغان'، شمارہ 6، نگراں: پروفیسر شہپر رسول، ناشر: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25، سنہ اشاعت 2017

■

Mustafa Ali
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:8299535742 Email: mustafaaliias@gmail.com

قرۃ العین حیدر کے چند منتخب افسانوں کے امتیازی خطوط

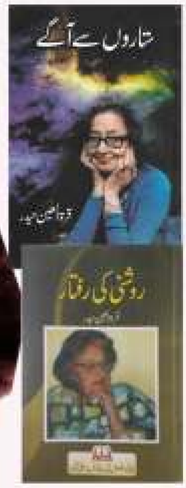

فصیح الرحمن

ایک صدی سے زائد عرصہ پر محیط تاریخ میں اردو افسانہ مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے مسلسل ارتقا پذیر رہا ہے۔ افسانے کے ابتدائی یعنی رومانی دور میں علامہ راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔ جبکہ حقیقت نگاری کے رجحان کے تحت پریم چند، سدرشن اور اعظم کریوی وغیرہ نے کامیاب تخلیقات پیش کیں۔ 1932 میں 'انگارے' کی اشاعت نے اردو افسانے کو جہاں ایک طرف نئے موضوعات ومسائل سے روشناس کرایا تو دوسری جانب ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے بھی انقلاب پیدا کیا۔ دس کہانیوں کے مجموعے 'انگارے' میں ان پہلوؤں کی تصویر کشی کی گئی تھی جنھیں کراہیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دولت کی نابرابری، جھوٹی مذہبیت، معاشرے میں حد درجہ بڑھی ہوئی ریاکاری، گھٹتے ہوئے ماحول کی نفسیاتی اور جنسی الجھنیں ان کہانیوں کے موضوعات بنے۔ 1936 کے لگ بھگ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی۔ ترقی پسند تحریک جس نے غلامانہ سوچوں کی قدیم، بوسیدہ اور شکستہ دیواروں کو مسمار کرکے ادب کو روشن فکر تعمیر سے آشنا کیا۔ آزادی سے قبل اردو افسانے میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی ان کی فہرست طویل ہے۔ اس ضمن میں بیدی، غلام عباس، منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، عزیز احمد، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، کوثر چاند پوری، ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری وغیرہ کے نام خاصے اہم ہیں۔

1956 کے بعد ترقی پسند تحریک کا زوال شروع ہوگیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان افسانہ نگاروں کے پاس کوئی نیا مواد باقی نہیں رہا تھا کیونکہ یہ لوگ جنگ آزادی اور تقسیم ہند کے دوران جو نئے تجربات کر چکے تھے ان کے سامنے مزید نیا تجربہ کرنا ایک نہایت مشکل امر تھا اور ان فنکاروں کے لیے قارئین کی توقعات پر کھرا اترنا آسان نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوگئی اس صورتِ حال میں یہ بات فطری تھی کہ کوئی نئی آواز، نیا رجحان افسانوی میدان میں در آئے لہٰذا ترقی پسند تحریک کے بعد دو ایسے منفرد افسانہ نگار افسانوی اُفق پر نمودار ہوئے جو پہلے سے خامہ فرسائی کر رہے تھے اور کسی نہ کسی سطح پر ترقی پسند تحریک سے متاثر بھی تھے لیکن وقت کے ساتھ ان دونوں نے اپنا الگ الگ رنگ اور جدا انداز اختیار کرلیا یہ دو منفرد تخلیق کار تھے: انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر۔

قرۃ العین حیدر 20 جنوری 1927 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والد سجاد حیدر یلدرم کی ملازمت اور والدہ کی غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے ان کی ابتدائی تعلیم باضابطہ کسی اسکول میں نہیں ہو پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی دہرادون، کبھی علی گڑھ، کبھی لاہور، کبھی لکھنؤ کے مختلف اسکولوں میں وقت گزارا۔ آخر میں دہرادون لوٹ آئیں یہیں سے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایزا بیلا تھوبرن کالج لکھنؤ سے انٹر کیا۔ اندر پرستھ کالج دہلی سے 1945 میں انگریزی میں بی اے کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے 1947 میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

تقسیم کے بعد قرۃ العین حیدر کا خاندان ستمبر 1947 میں پاکستان منتقل ہوگیا۔ بعد ازاں 1960 تک پاکستان میں مختلف عہدوں پر کام کرتی رہیں۔ 1961 میں ہندوستان واپس آگئیں اور ممبئی میں 'امپرنٹ' اور 'السٹریٹیڈ ویکلی' کے ادارتی بورڈ میں شامل ہوگئیں۔ اردو، انگریزی میں صحافتی تحریریں لکھتی رہیں۔ انھوں نے ہندوستانی فلموں کے لیے مکالمے اور کہانیاں بھی لکھیں اور فلم سنسر بورڈ کی ممبر بھی رہیں۔ ممبئی سے دہلی آئیں تو 1979 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں بطور وزٹنگ پروفیسر مقیم رہیں۔ 82-1981 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بطور وزٹنگ پروفیسر خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد مستقل طور پر نوئیڈا میں مقیم ہوگئیں۔ 21 اگست 2007 کو نوئیڈا میں ہی انتقال ہوا۔

اس سلسلے میں جمیل اختر لکھتے ہیں:

"قرۃ العین حیدر آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اردو ادب کی عہد ساز، روایت شکن اور قد آور ادیبہ آٹھ دہوں تک اردو ادب کے اُفق پر ایک درخشاں اور تابندہ ستارے کی مانند جگمگانے کے بعد آخر 21/ اگست 2007 کی درمیانی شب میں تقریباً ساڑھے تین بجے (کیلاش ہاسپٹل نوئیڈا میں جہاں وہ ایک ماہ سے زیادہ مدت تک زیر علاج تھیں) داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔"[1]

قرۃ العین حیدر کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 1967، غالب ایوارڈ 1984، پدم شری ایوارڈ 1984 اور گیان پیٹھ ایوارڈ 1989 خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے 7-6 سال کی عمر میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی تحریر 'کاٹھ گودام کا اسٹیشن' کے نام سے لکھی۔ باقاعدہ طور پر پہلا افسانہ 'ایک شام' جسے وہ اسکرپٹ کہتی ہیں، فرضی نام لالہ رخ سے 'ادیب' نومبر 1943 میں شائع ہوا۔ جس شخص کی تحریک اور دعوت پر قرۃ العین نے معتبر رسائل میں لکھنا شروع کیا اس کا ذکر خود مصنفہ نے کچھ یوں کیا ہے:

"ایک روز حکیم یوسف حسن لاہور سے تشریف لائے اماں سے کہا 'نیرنگِ خیال' کی حالت دگرگوں ہو چکی ہے۔ کوشاں ہوں کہ پھر اسی آب وتاب سے نکلے۔ معاً مجھے مخاطب کیا، اب قلم آپ کے ہاتھ میں آیا ہے۔ آپ نیرنگ خیال میں لکھنا شروع کیجیے۔ میں نے نہایت اطمینان اور خود اعتمادی سے جواب دیا بہت اچھا ضرور لکھیں گے۔"[2]

قرۃ العین حیدر کے مندرجہ ذیل افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔

(1) ستاروں سے آگے 1947 (چودہ افسانے)
(2) شیشے کے گھر 1954 (بارہ افسانے)

(3) پت جھڑ کی آواز 1966 (آٹھ افسانے)

(4) روشنی کی رفتار 1982 (اٹھارہ افسانے)

(5) قندیل چیں 2007 (تیرہ افسانے)

(مذکورہ آخری مجموعے کو جمیل اختر نے ترتیب دے کر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع کیا۔)

اس مضمون میں قرۃ العین حیدر کے چند منتخب افسانوں پر گفتگو کرنا مقصود ہے۔ اولاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے سیاسی اور سماجی محرکات کا جائزہ لیا جائے۔ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر کا تخلیقی شعور پروان چڑھ رہا تھا۔

اردو افسانے کے تعلق سے قرۃ العین حیدر کے تخصص کو سمجھنے کے لیے یہ بھی جاننا اہم ہے کہ انھیں کس قسم کا سماجی، تہذیبی اور علمی ترکہ وراثت میں ملا۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب ملک کے سماجی اور سیاسی حالات میں تغیرات کا دَور دورہ تھا۔ سیاسی حالات روز بروز تبدیل ہو رہے تھے۔ ماضی کی قدریں سیال ہو چکی تھیں حال کی کیفیت اضطرابی اور مستقبل شبہات کے دائرہ میں قید تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے مخصوص علمی نظریے اور منفرد اسلوب کی بدولت اردو افسانے میں اپنی الگ پہچان قائم کی۔ اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتی ہیں۔ افسانوں میں عصری شعور کی روشنی میں انسانی تہذیب اور حیات وکائنات کے مسائل کو فلسفیانہ ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں۔ انھیں ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ قرۃ العین حیدر موضوع اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے بھی اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ بٹوارے کے المناک نتائج، ہجرت اور بے وطنی کا احساس، دونوں ملکوں کے عوام کی ذہنی کشمکش، اعلیٰ طبقے کا تہذیبی و اخلاقی زوال، سیاسی وسماجی اقدار کا انہدام، طبقاتی تضادات، وقت کا جبر، رومانیت سے گریز جیسے موضوعات کو انھوں نے جس فنی چابک دستی کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا اس کی مثال نہیں ملتی۔

1960 تک آتے آتے قرۃ العین حیدر کے فن میں مزید پختگی پیدا ہوگئی اور ان کا افسانوی کینوس وسیع ہوتا گیا۔ شاید ہی کوئی ایسا ثقافتی اور تمدنی موضوع تھا جو ان کے قلم کی گرفت میں نہ آیا ہو۔ قرۃ العین حیدر تاریخ، تہذیب و تمدن پر عالمانہ گرفت رکھتی ہیں۔ وہ بیک وقت ماضی اور حال دونوں میں سانس لیتی ہیں اور اپنے جذبات واحساسات کو اپنی تخلیقات میں ضم کر دیتی ہیں۔ ان کی تخلیقات کو اقدار کی شکست وریخت کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے جس کا بیان کرتے وقت وہ ایسی فضا قائم کرتی ہیں کہ قاری خود ان قدروں کے خاتمہ کا عینی شاہد بن جاتا ہے۔ وہ اندھی تقلید سے اجتناب برتتی ہیں۔ ان کی، عالمی ادب، بطور خاص مغربی ادب سے گہری وابستگی تھی۔ اپنے وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے اپنی راہ خود منتخب کی۔ قرۃ العین حیدر کی فنکارانہ عظمت کے پروفیسر گوپی چند نارنگ یوں معترف ہیں:

''قرۃ العین حیدر جو پہلے سے لکھ رہی تھیں بلا کی ذہانت اور عمیق مشاہدہ رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں خاص طور سے اودھ کی جاگیردارانہ اقدار کے مٹنے کا نوحہ اور ان سے متعلق Nostalgia ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فن، ہیئت، اسلوب واظہار کے تجربوں ہی نے انھیں انفرادی حیثیت عطا کی۔''[3]

قرۃ العین حیدر اپنی افسانہ نگاری کے شروعاتی دور میں جن حالات اور ماحول سے دوچار تھیں اس سے چشم پوشی ممکن نہیں تھی اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں مٹتی ہوئی اعلیٰ قدروں کو پیش کیا۔ تقسیم کے بعد منظر عام پر آئے ان کے افسانوں میں ایسی تخلیقات کی کثیر تعداد ہے جن میں تقسیم ہند کے ردِعمل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور منقسم خاندانوں کی روداد، ہندو مسلم اتحاد، باہمی دشمنی، قتل وغارت گری، ملکی انتشار، ملک وعوام کے حالات وواقعات اور نفسیاتی کیفیات کا بھرپور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ تقسیم کے اس المناک سانحہ کا اثر دیگر ادبی اصناف کی طرح افسانے نے بھی قبول کیا۔ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات، نقل مکانی، مہاجرین کی آبادکاری، جمہوری نظام کا قیام، نئی منصوبہ بندی اور اس پر عمل جیسے موضوعات اردو افسانے میں پیش کیے گئے۔ ان موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے جن فنکاروں نے اعتدال کو ملحوظ رکھا اور انسانی اقدار کی پاسداری کی ان میں قرۃ العین حیدر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں 'جلاوطن' ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ افسانے میں 1947 کے فسادات، ان کی وجوہات، تقسیم کے سماج پر مرتب ہونے والے اثرات اور بٹوارے سے قبل کے منظرنامے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس پورے ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس میں بے بسی، کرب اور انتشار ہے۔ قرۃ العین نے مؤثر انداز میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح دو تہذیبیں آپس میں متصادم ہوتی ہیں۔ کشوری، بھیم وتی، کنول کماری اور آفتاب رائے اس افسانے کے اہم کردار ہیں پوری کہانی انھیں کے اردگرد گھومتی ہے علاوہ ازیں بعض ہندو، مسلم اور عیسائی رئیس گھرانوں کی تہذیبی زندگی کی عکاسی اس افسانے کا خاصہ ہے۔ افسانے کے ابتدائی حصے میں ہندو مسلم طبقے کی مشترکہ تہذیب کی تصویرکشی کچھ اس طرح کی گئی ہے:

''زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منھ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے... برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا.. ہاتھی گھوڑا پالکی... جے کنہیا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا لہٰذا غیر شعوری طور پر... Imagery بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں... بھری گگری موری دھرم کائی شام... کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں۔ جنھیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچی ہوئی جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال یہ محاورے 'یہ زبان' ان سب کی بڑی پیاری اور دل آویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزاپور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقا نے بڑے گمبھیر اور خوبصورت رنگ بھرے تھے۔''[4]

کہانی میں مشترکہ تہذیبی علامتیں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس طرح جلوہ گر ہیں کہ قاری کے سامنے ہندوستانی تہذیب وثقافت کا پورا منظر گھوم جاتا ہے۔ لیکن تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے جو حالات درپیش تھے وہ یقیناً بڑے دشوار تھے۔ کشوری کا پورا خاندان پاکستان ہجرت کر جاتا ہے۔ وہ اپنے بابا کے ہمراہ ہندوستان رہ جاتی ہے لیکن اسے اپنے اس فیصلے کے عوض اپنے ہی ملک میں رہ کر مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال کا بیان فنکار نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ افسانے کا آخری ٹکڑا دیکھیے:

''کنول رانی... کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آجاؤ۔ اب کسی پچھتاوے، کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے۔ کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہوگی۔ ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔

لیکن کنول کماری... تم اب بھی رو رہی ہو....؟''[5]

قرۃ العین حیدر ایک مؤرخ کی حیثیت سے کہانی بیان کرتی ہیں۔ جس کی قرأت سے پورے عہد کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی صورتِ حال ہمارے سامنے واضح ہوجاتی

ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور اور داخلی مشاہدات کی ترجمانی بھی شامل ہے۔ ’جلاوطن‘ کا یہ رجائی اختتام یقیناً ٹوٹے پھوٹے اور شکست خوردہ انسانوں کو حوصلے کے ساتھ زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ساتھ ہی نئے عہد، نئی صبح اور نئے مستقبل کی بشارت دیتا ہے کہ ماضی کی ناکامیوں سے نہ گھبراتے ہوئے ایک تابناک مستقبل کی بنیاد رکھنی چاہیے جس سے آئندہ زندگی روشن ہو سکے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ قرۃ العین حیدر کا ایک منفرد افسانہ ہے۔

افسانہ ’سیتاہرن‘ آزادی کے بعد کے ماحول اور نچلے طبقے کی غربت، بے بسی، المناکی اور محرومی کے حوالے سے لکھی گئی ایک عمدہ کہانی ہے۔ اس افسانے میں ایک سندھی پناہ گزیں لڑکی سیتا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ معاشرے کے اعلیٰ طبقے کی ذہنیت اونچے عہدوں پر فائز لوگوں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک آرٹسٹ اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے آزاد خیال نوجوانوں، مرد اور عورتوں کے ذہن کی عکاسی اس کہانی میں بڑے فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔ سیتا ایک ایسی لڑکی ہے جو جنگل میں وہاں کا قانون اپنا کر زندگی گزار سکتی ہے۔ انسانی قوانین وہاں بے معنی ہیں۔ اس سیتا کو آج کے راون نے اغوا کر لیا ہے۔ عورت یہاں کمزوری اور استحصال کی علامت ہے۔ مگر یہ شکست اور استحصال صرف سیتا جیسی لڑکیوں کے لیے ہی مخصوص نہیں بلکہ کم و بیش یہی حال اس جدید معاشرے کا بھی ہے جہاں عورتوں کو آج بھی کمزور سمجھا جاتا ہے۔

’ہاؤسنگ سوسائٹی‘ قرۃ العین حیدر کی علامتی انداز میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں جدید تہذیب، سیاست و معیشت پر بے باک انداز میں طنز کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں موجودہ تہذیب کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ افسانے کا ہیرو جمشید سید ایک نودولت مند انسان ہے جو دولت کے نشے میں اس قدر چور ہے کہ اپنا ماضی بھی فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن جب اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے تو وہ بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ یہ افسانہ غیر منقسم ہندوستان سے شروع ہو کر تقسیم کے بعد پاکستان کی سرزمین پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس افسانے میں انکشاف، اسرار، تجسس، اور حادثات قدم قدم پر رونما ہوتے ہیں۔ جمشید سید افسانے کے اختتام پر اعتراف حق کے ذریعے انسان دوستی کا پتہ دیتا ہے۔

جاگیردارانہ نظام کے زوال اور جدید طرز پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس صورت حال نے جہاں انسان کو اپنی آن بان کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا وہیں شخصی آزادی کا ایک تصور بھی دیا کہ وہ یک لخت تمام بندشوں سے آزاد ہو گیا معاشرے کے ٹوٹنے بکھرنے کے باعث اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کو بھی اپنی زد میں لیا۔ چنانچہ شخصی آزادی کی آڑ میں انسان نے تمام سماجی، تہذیبی، تمدنی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا۔ نیز ہندوستان کے سیاسی حالات بہ طور خاص تقسیم ہند کے واقعے سے اس تصور کو جلا ملی۔ انسان نہ صرف نقل مکانی کے عمل سے دو چار ہوا بلکہ اسے ایسے بہت سے مسائل بھی درپیش ہوئے جن کا حل تلاش کرنے سے اس کی ذات قاصر تھی۔ آزادی کے سبب اخلاقی قدروں کا انہدام ہوا اور جدید تعلیم کے زیر اثر اعلیٰ سوسائٹی سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جنسی کج روی کو فروغ دیا گیا۔

قرۃ العین حیدر نے ’پت جھڑ کی آواز‘ میں ان ہی دو تصورات سے پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل کو پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے جہاں ایک طرف زمیندارانہ نظام کے خاتمے کا شدید احساس دلایا ہے وہیں وہ دوسری جانب اعلیٰ سوسائٹی میں خوش حال زندگی بسر کرنے والے افراد کی جنسی آزادی کے وسیع پس منظر کے ذریعے زندگی کی ایک واضح اور نئی تصویر پیش کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے یہاں جنس کا ذکر محض جنسی تلذذ کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے وہ سماج میں پھیلی برائیوں اور تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ جنس بلاشبہ انسانی فطرت میں داخل ہے لیکن اس افسانے میں انھوں نے اعلیٰ طبقے کے افراد کے جنسی جذبات کی ترجمانی بڑے فن کارانہ انداز میں کی ہے اور سماج کو اصل حقیقت سے روشناس کرانے کی سعی کی ہے۔ کس طرح ہماری تہذیب و ثقافت پر مغربی تہذیب اثر انداز ہوئی ہے اس المیے کو اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں نئی نسل کے خیالات کی ترجمانی بھی بڑے معنی خیز انداز میں کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کے اسلوب، فن اور تکنیک میں کثیر الجہتی پائی جاتی ہے نیز ان کی کم آمیزی، کم گوئی اور مشکل پسندی نے ان کی انفرادیت کو اور نمایاں کر دیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے اسلوب کی خالق و خاتم وہی ہیں۔

قرۃ العین کے افسانے عصری شعور کی روشنی میں انسانی تہذیب اور حیات و کائنات کے مسائل کا فلسفہ بڑی دیانت داری سے پیش کرتے ہیں۔ وہ صدیوں کے رشتوں، ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل کو گرفت میں لینے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ ان کے کردار وقت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جلاوطن، ڈالن والا اور دوسیاح کے کردار وقت کے زندانی ہیں جو نامعلوم عہد قدیم سے محسوس ماضی قریب یا عہد جدید کا سفر کر کے پھر اپنے اس معین وقت میں مقید ہو جاتے ہیں۔ وقت کا یہ تصور قرۃ العین حیدر کے یہاں جبر کی علامت بن جاتا ہے جو تقدیر اور تاریخ کا جبر ہے اور ان کے اکثر کردار وقت کی اسی جبریت کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرۃ العین نے مغربی ادیبوں کا براہ راست مطالعہ کیا اور اسے اپنے فن میں برتا۔ پروفیسر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

”وہ (قرۃ العین حیدر) اردو کی پہلی افسانہ و ناول نگار ہیں جنھوں نے براہ راست عصر حاضر کے انگریزی فکشن کے جدید ترین ہیئتی تجربوں سے استفادہ کیا ہے، گرچہ یہ ایک مجتہدانہ استفادہ ہے، مقلدانہ نہیں“[6]

بیسویں صدی میں انگریزی کے جن فن کاروں سے قرۃ العین حیدر نے استفادہ کیا ہے ان میں جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے یوروپ کی زندگی کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور بین الاقوامی سطح پر عصر حاضر کے متعدد و اہم مسائل کو مدنظر رکھا ہے، اس کے علاوہ ماضی سے حال تک وقت کا جو بسیط احساس قرۃ العین حیدر کے یہاں ہے وہ انگریزی ناول یا افسانہ نگار کے یہاں نہیں ہے۔

اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر ایک Critical ذہن کی مالک ہیں اس لیے اشیا کو سطحی نظر سے دیکھنے کے بجائے ان کی ماہیت جاننے کی خواہش مند رہتی ہیں۔ ان کے لیے تخلیق ایک داخلی تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کے اکثر افسانوں کی فضا ان کے داخلی احساس کی فضا ہوتی ہے۔

حواشی

(1) جمیل اختر: دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات (مضمون) مشمولہ۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ قرۃ العین حیدر فن اور شخصیت۔ مرتبین۔ ہمایوں ظفر زیدی، محمد محفوظ عالم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2007، ص 7

(2) قرۃ العین حیدر: کار جہاں دراز ہے (جلد اول، دوم) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003، ص 425

(3) گوپی چند نارنگ۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص 736

(4) قرۃ العین حیدر: جلاوطن، مشمولہ شیشے کے گھر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2019، ص 85-284

(5) قرۃ العین حیدر: جلاوطن، مشمولہ شیشے کے گھر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2019، ص 311

(6) عبدالمغنی۔ قرۃ العین حیدر کا فن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1994، ص 7

■

Fasi ur Rehman
Room No. 81, Amin Hostel, M.M Hall,
A.M.U, Aligarh-UP,
Pin code 202002
Mob:9319949794
Email: fasi.khan90@gmail.com

اپنے تحت الشعور کا استعمال کریں

شمس الاسلام فاروقی

اس سرزمین پر اللہ کی بنائی ہوئی سب سے بہتر مخلوق انسان ہے جسے اس نے عقل اور فہم وادراک عطا کر کے دوسری مخلوقات سے ممتاز کردیا ہے۔ اس کی اس عقل کو دو حصوں، شعور اور تحت الشعور، میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ شعور انسانی دماغ کی وہ سوجھ بوجھ ہے جس کی مدد سے وہ اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتا اور اپنے مسائل کو حل کرتا ہے، تاہم تحت الشعور اس شعور کی تہہ میں چھپا ہوا وہ حصہ ہے جسے وہ شاذ و نادر ہی استعمال میں لاتا ہے۔ انسان اپنے تحت الشعور سے جب کبھی بھی بات کرتا ہے وہ اشاروں کنایوں میں الہامی انداز سے ہوتی ہے اور وہ بھی مخصوص حالات میں جیسے جب وہ کوئی چیز حاصل کرنے کی شدید خواہش رکھتا ہو یا پھر اسے کوئی انتہائی سنجیدہ مسئلہ درپیش ہو اور وہ اس پر لمبے عرصے تک غور وخوض کرتا رہے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ تحت الشعور انسانی عقل وفراست کا ایسا بیش بہا خزینہ ہے جس میں وہ تمام تر فہم و ادراک، سوجھ بوجھ، اچھوتے خیالات اور منفرد تصورات موجود ہیں جنہیں کبھی بھی کسی انسان نے سوچا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تحت الشعور میں نسل انسانی کی تمام تر فہم وفراست کا مکمل ماضی اس میں سمویا ہوا ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان اس مشترکہ خزینے تک رسائی حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے بند دروازوں کو کھولنے کا گر جانتا ہو اور اس میں کامیاب بھی ہو جائے۔ تاریخ انسانی کے اوراق پلٹنے پر ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جب سائنسدانوں، تحقیق کاروں، موجدوں، آرٹسٹوں اور فن کاروں نے اس خزانے تک رسائی حاصل کی ہے اور دنیا کو اپنے اچھوتے، بے مثال کارناموں سے حیران کردیا ہے۔ نسل انسانی کا پتھر کے زمانے سے جدید ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہونا اسی تحت الشعور کی دین ہے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ایک اوسط آدمی اپنی زندگی میں اپنے تحت الشعور کا محض 5 سے 10 فیصدی حصہ ہی استعمال کر پاتا ہے جبکہ باقی یوں ہی بے توجہی اور لاعلمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ زندگی میں ایسے تخلیقی کارنامے انجام دینا چاہتے ہیں، کہ تاریخ کے صفحات میں آپ کا نام لکھا جائے آپ دولت، شہرت، عزت اور عمدہ صحت کے مالک بنیں تو ضروری ہے کہ آپ وہ طریقے سیکھیں جن کی مدد سے اپنے تحت الشعور کو بیدار کر کے اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کو کام میں لاسکیں۔

جب کبھی زندگی کے کسی موڑ پر آپ کسی سنجیدہ سلسلے سے دوچار ہوں تو اس کا حل تلاش کرنے کے لیے اپنے تحت الشعور سے رجوع کیجیے۔ وہ یقینی طور پر آپ کی مدد کرے گا کیونکہ وہ آپ کی ہر پریشانی اور مسئلے کا حل پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ غور کریں تو تقریباً ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسے لمحات ضرور آتے ہیں جب وہ کسی ایسے مسئلے سے دوچار ہوتا ہے جو اس کے دماغ پر سوار ہو کر اسے زیادہ گہرائی سے غور وخوض کرنے پر مجبور کردے۔ ایسی صورت میں اچانک ہی ایک جھپاکے کے ساتھ اس کے مسئلے کا حل اس کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اُس کے تحت الشعور کا کمال ہے جو گہری فکر کے ذریعے چشم زدن میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔

ماہر سائنسداں البرٹ آئنسٹائن کا کہنا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی ذہن کے مالک نہیں تھے، البتہ وہ ہر مسئلے کو انتہائی گہرائی سے دیر تک سوچنے کے عادی تھے۔ جب بھی کوئی شخص کسی موضوع پر گہرائی سے دیر تک غور کرتا رہتا ہے تب وہ غیر شعوری طور پر اپنے تحت الشعور سے منسلک ہو جاتا ہے جو چشم زدن میں اسے اس موضوع پر کوئی ایسا اچھوتا خیال، تصور، نظریہ یا فن پارہ پیش کردیتا ہے کہ وہ اس کے حصول پر خود بھی حیران رہ جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا موجد ولبر رائٹ (Wilbur Wright) جو ایک تربیت یافتہ انجینئر تھا، اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ جب وہ فضا میں اڑنے والی ایک مشین بنانے کے اپنے کئی سالوں پر محیط تجربات میں ناکام ہو چکا تھا وہ ایک روز نصف شب تک اس کے بارے میں زیادہ گہرائی سے سوچتے سوچتے چند منٹ کے لیے سو گیا۔ اس دوران اس نے فضا میں

دنیا کے امیر ترین آدمی ہنری فورڈ کا کہنا تھا کہ اپنی سوچوں کو ہمیشہ پرامید رکھیں کیونکہ اس نے اپنی ساری زندگی میں ایک بھی یاسیت پسند شخص ایسا نہیں دیکھا تھا جو دولت مند ہو۔ ناامیدی اور یاسیت لوگوں کو زندہ درگور کردیتی ہے۔ وہ ساری زندگی اپنی محرومیوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ بہتر ہے ایسے لوگوں سے بچا جائے کیونکہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کردیتے ہیں۔ ہمیشہ پرامید رہنے والوں کو اپنا ساتھی بنائیے۔ مثبت سوچ رکھنے والے غیرشعوری طو رپر اپنے تحت الشعور سے رابطہ بنالیتے ہیں اور زندگی میں جو چاہتے ہیں حاصل کرلیتے ہیں۔

اڑنے والی مشین کا نقشہ دیکھا۔ صبح کو اٹھ کر جب اس نقشے کے مطابق مشین بنائی تو وہ کئی منٹ تک فضا میں اڑتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ہوائی جہاز ٹیکنالوجی کا آغاز ہوگیا۔

ہمارا یہ تحت الشعور خود سے کام نہیں کرتا بلکہ اسے متحرک کرنے کے لیے کچھ ہدایات درکار ہوتی ہیں جو ایک حکم، مسلسل غور وفکر یا شدید خواہش کی شکل میں رونما ہوسکتی ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے وہ یک لخت میں تیار ہوجاتا ہے اور پھر اس حکم، مسلسل سوچ یا خواہش کی تکمیل کسی ایسے اچھوتے انداز سے ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر ہر کوئی حیران رہ جاتا ہے۔

فرض کیجیے آپ کی شدید خواہش ہے کہ آپ کو زندگی میں ایک بے حد پرخلوص اور سچا دوست مل جائے، آپ ایک مثالی تاجر بن جائیں یا آپ کے قدموں میں بے پناہ دولت ڈھیر ہوجائے تو آپ اپنے تحت الشعور سے رجوع کریں۔ آپ ان خواہشات کے بارے میں گہرائی اور خلوص کے ساتھ غور کریں تو آپ کا تحت الشعور متحرک ہوکر ایسے حالات پیدا کردے گا کہ آپ کے یہ تمام مطالبات خوشگوار انداز سے پورے ہوجائیں گے۔

اگر آپ چاہیں تو اپنے تحت الشعور کو متحرک کرکے اپنی ہر بیماری سے چھٹکارہ حاصل کرسکتے ہیں۔ جدید سائنسی تحقیقات کے بموجب ہماری تمام بیماریوں کا تعلق ہمارے دماغ سے ہوتا ہے اور اسی سے اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ جب کبھی آپ کسی بیماری کا شکار ہوں خواہ چھوٹی ہو یا بڑی مگر اس سے صحت یابی کے بارے میں ہمیشہ پُرامید رہیں اور اپنے تحت الشعور کو متحرک کرکے اپنی بیماری کے خاتمے اور صحت مندی کی خواہش کریں۔ ہردم یہ محسوس کریں کہ آپ کی بیماری ختم ہورہی ہے اور آپ صحت یاب ہورہے ہیں۔ آپ کی یہ سوچ آپ کے مدافعتی نظام کو مضبوطی دے کر جسمانی نظاموں کو صحت مند بنائے گی اور آپ کو آپ کی بیماری سے نجات دلا کر صحت سے ہمکنار کردے گی۔

اس ضمن میں نماز، مراقبہ اور یوگا بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ حکیم محمد طارق محمود چغتائی اپنی کتاب سنت نبوی اور جدید سائنس میں نماز کو ہر مرض کا علاج بتاتے ہیں بشرطیکہ اسے خشوع وخضوع سے ادا کیا جائے یعنی نماز کے دوران آپ ہر طرف سے بے نیاز ہوکر صرف خدا سے لو لگائیں اور اسی سے اپنی حاجتیں طلب کریں تاکہ وہ ارحم الراحمین آپ کے تحت الشعور کو حکم دے یا اس کے حکم سے ایسی تمنا اور خواہش بیدار ہو جو آپ کی حاجتوں کو پورا کرسکے۔

نماز میں دعا خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ جب آپ پوری خلوص نیت کے ساتھ پرامید ہوکر اپنی حاجتیں اپنے پروردگار کے حضور پیش کرتے ہیں تب وہ ضرور پوری ہوتی رہیں۔ ماہرنفسیات کے مطابق دنیا کا بہترین ٹانک صرف ایک مثبت سوچ ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک فقیر کی کہانی بہت مشہور ہے۔ وہ کسی گاؤں میں ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر پچھلے چالیس برسوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو گاؤں والوں نے سوچا اسے اسی جگہ دفن کردیا جائے جہاں وہ بھیک مانگا کرتا تھا۔ وہ جگہ جب تھوڑی سی کھودی گئی تو وہاں سے سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔ عام طور پر لوگوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ تمام زندگی اپنی

بدقسمتی کا رونا روتے ہیں مگر کبھی بھی اپنے اندر موجود اپنے تحت الشعور سے رجوع نہیں کرتے۔

دنیا کے امیر ترین آدمی ہنری فورڈ کا کہنا تھا کہ اپنی سوچوں کو ہمیشہ پرامید رکھیں کیونکہ اس نے اپنی ساری زندگی میں ایک بھی یاسیت پسند شخص ایسا نہیں دیکھا تھا جو دولت مند ہو۔ ناامیدی اور یاسیت لوگوں کو زندہ درگور کردیتی ہے۔ وہ ساری زندگی اپنی محرومیوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ بہتر ہے ایسے لوگوں سے بچا جائے کیونکہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کردیتے ہیں۔ ہمیشہ پرامید رہنے والوں کو اپنا ساتھی بنائیے۔ مثبت سوچ رکھنے والے غیرشعوری طور پر اپنے تحت الشعور سے رابطہ بنالیتے ہیں اور زندگی میں جو چاہتے ہیں حاصل کرلیتے ہیں۔

آپ جب بھی اپنے تحت الشعور سے کچھ طلب کریں وہ مبہم اور غیرواضح نہ ہو بلکہ آپ کی حاجت پوری طرح واضح ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو ایک گھر درکار ہے تو اس گھر کی ایک واضح شکل آپ کے ذہن میں ہونا چاہیے۔ جیسے گھر کیسا اور کتنا بڑا ہو، کس علاقے میں ہو، کتنی جگہ کھلی ہو، اس کی کھڑکیاں، دروازے کیسے ہوں وغیرہ۔ یقین مانیے جب آپ کا تحت الشعور اس کے حالات استوار کرے گا وہ ان سب باتوں کا خیال رکھے گا تاکہ آپ کی حاجت عین آپ کی خواہش کے مطابق پوری ہوسکے۔

آپ کے تحت الشعور کو نکھارنے، سنوارنے یا پھر برباد کرنے میں آپ کا اپنا دخل سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کے خیالات، عادات و اطوار، دوست احباب، اچھے برے ساتھی، ماحول غرض زندگی کا ہر ہر پہلو آپ کے تحت الشعور پر اپنا ایک عکس چھوڑتا ہے اور پھر کبھی اچانک ہی ان سب کے مثبت یا منفی نتائج آپ کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ خیال رکھیے کہ آپ کی سوچ اور ماحول کیسا ہے۔ ہر یاسیت بھرا، مایوس کن خیال، شک وشبہ یا پھر منفی احساس چاہے کتنی قلیل مدت ہی کے لیے کیوں نہ پیدا ہو وہ آپ کے تحت الشعور پر ایک چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ آپ جب بھی کچھ سوچیں اس میں ناامیدی کا شائبہ بھی نہ ہو، ہمیشہ پرامید اور پراعتماد رہیں کہ آپ کی ہر خواہش آپ کی مرضی کے مطابق پوری ہوگی۔ یہی دراصل کامیابی کا راز ہے اور یہ کامیابی آپ کو اپنے تحت الشعور کے راستے ہی حاصل ہوتی ہے۔

■

Shamsul Islam Farooqui
90-B, Ahata Talib
Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

سائنس

عصرِ حاضر میں شمسی توانائی کا بہترین مصرف

محمد مجتہد انصاری

شمسی توانائی سے برقی توانائی پیدا کرنا دنیا میں دوسرے طریقوں، مثلاً بھاپ کی توانائی، پانی کی توانائی بالقوئی اور تابکاری عناصر کی بہ نسبت سب سے سستا، آسان اور محفوظ طریقہ ہے۔ شمسی توانائی قابل تجدید توانائی کی سب سے زیادہ قابل عمل اور صاف ترین شکل ہے۔ اس طرح سے پیدا ہونے والی توانائی نہایت صاف یعنی اس عمل میں کسی فضائی، پانی اور ماحولیاتی آلودگی نہیں ہوتی۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا بھی اخراج نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے نباتات وحیوانات پر اس کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں دھوپ زیادہ وقت تک رہتی ہے جیسے ہمارے ملک اور پڑوسی ملکوں میں تو شمسی توانائی بہت سود مند ہے۔ ہمارے ملک کے بیشتر حصوں میں تقریباً 300 دن دھوپ رہتی ہے اس لیے شمسی توانائی سے برقی توانائی پیدا کرنا ملک کی ترقی میں معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی حکومت کی طرف سے اسے فروغ حاصل ہے۔ جب مطلع صاف ہو تو زمین پر پڑنے والی شمسی توانائی 800 سے 1000 واٹ فی مربع میٹر (watt/sq.m) ہوتی ہے جبکہ ابر آلود موسم میں 300 واٹ فی مربع میٹر رہ جاتی ہے۔ اس توانائی کو سولر ارریڈینس کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں موسم گرما میں سورج اوپر اور زیادہ دیر تک رہتا ہے جبکہ برسات اور سردیوں کے موسم میں سورج نسبتاً جنوب کی جانب سے سفر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس لیے کم وقت کے لیے رہتا ہے۔ شمسی توانائی سے برقی توانائی پیدا کرنے کا عمل شمسی برقی خانہ 'سولر سیل' یا 'سولر فوٹو وولٹک (پی وی سیل)' سے شروع ہوتا ہے۔

شمسی برقی خانہ 'سولر سیل' یا 'سولر فوٹو وولٹک (پی وی سیل)' دو مختلف نیم موصل عناصر کی پتلی تہہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ دو نیم موصل عناصر، پی ٹائپ اور این ٹائپ سے تیار کیا جاتا ہے۔ جب سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو این ٹائپ نیم موصل عنصر الیکٹران کا اخراج کرتا ہے جبکہ پی ٹائپ نیم موصل عنصر ان الیکٹرون کو جذب کرتا ہے۔ اگر برقی دور مکمل ہو تو برقی رو پیدا ہوتی ہیں۔

شکل نمبر 1

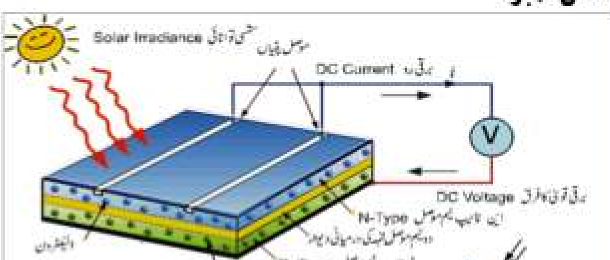

ایک شمسی خلیہ، سولر سیل تقریباً 0.58 وولٹ کا برقی قوئی کا فرق پیدا کرتا ہے جو غیر متغیر ہوتا ہے۔ عام برقی خانے برقی توانائی کو محفوظ کرتے ہیں جبکہ شمسی توانائی سے پیدا شدہ توانائی شمسی برقی خانہ میں محفوظ نہیں رہتی ہے۔ اگر اس طرح کے بہت سے شمسی خلیوں کو تسلسل اور متوازی شکل میں مربوط کر دیا جائے تو مطلوبہ برقی قوئی اور برقی رو حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان شمسی برقی خانوں کے مجموعے کو شمسی تختی یا سولر پینل کہا جاتا ہے۔ آج کل جو بازار میں سولر پینل دستیاب ہیں وہ 300 واٹ، 315 واٹ اور 325 واٹ کی استعداد ہوتے ہیں جبکہ ان سولر پینل کی طبعی پیائش یکساں ہوتی ہے۔ شمسی خلیہ، سولر سیل پر مرکوز ہونے والی شمسی توانائی مکمل طور پر برقی توانائی میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ صرف شمسی توانائی کا 17 سے 22 فی صد حصہ ہی برقی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ شمسی توانائی کا برقی توانائی میں تبدیل ہونے کا انحصار دو عوامل پر ہے، اوّل سولر پینل کا رخ اور رخ زاویہ دوّم ماحول کا درجہ حرارت۔ اس سے پہلے بتایا گیا ہے کہ موسم گرما میں سورج اوپر اور زیادہ دیر تک رہتا ہے جبکہ برسات اور سردیوں کے موسم میں سورج نسبتاً جنوب کی جانب سے سفر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس لیے کم وقت کے لیے رہتا ہے۔ اس وجہ سے سولر پینل کا رخ جنوب کی جانب ہونا چاہیے جبکہ رخ زاویہ مقام کے لحاظ سے کم و زیادہ ہوتا ہے مثلاً شمال کی جانب کے مقامات پر رخ زاویہ زیادہ اور جنوب کی جانب کے مقامات پر رخ زاویہ کم رہے گا۔ سولر پینل کی شمسی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت ماحول کے درجۂ حرارت کے معکوس تناسب میں ہوتی ہے یعنی اگر درجہ حرارت 35 ڈگری سے متجاوز ہو تو سولر پینل کی شمسی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس لیے شمسی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سولر پینل کا رخ، رخ زاویہ اور درجہ حرارت کا خاص خیال رکھا جائے خاص طور پر جب ان پینلس کو لوہے کی چھت پر نصب کرنا ہو۔

گھروں، دکانوں اور کارخانوں میں استعمال ہونے والے تمام برقی آلات متغیر برقی رو پر کام کرتے ہیں جبکہ شمسی توانائی سے برقی توانائی میں تبدیل ہونے والی برقی رو غیر متغیر ہوتی ہے اس لیے لازم ہے کہ اس تبدیل شدہ برقی رو کو متغیر برقی رو میں تبدیل کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جو برقی آلہ کا استعمال ہوتا ہے اس کو سولر انورٹر کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ شمسی توانائی سے پیدا شدہ توانائی شمسی برقی خانہ میں محفوظ نہیں رہتی اس لیے شمسی توانائی سے پیدا شدہ توانائی کو دو طریقوں سے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اوّل شمسی توانائی سے پیدا شدہ توانائی کو برقی خانوں میں محفوظ کرلیں اور حسب ضرورت استعمال کیا جائے دوّم شمسی توانائی سے پیدا شدہ توانائی کو براہ راست سولر انورٹر کے ذریعے استعمال کیا جائے۔ اس مناسبت سے تین طریقوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

(1) برقی خانہ سے منسلک شمسی نظام:

ایک چھوٹے پیمانے پر شمسی نظام جس میں شمسی تختیاں، سولر انورٹر اور ایک یا ایک سے زائد برقی خانہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح کے نظام کو تنہا شمسی نظام کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظام پاور گریڈ کے نظام سے پوری طرح جدا ہوتا ہے۔ تنہا شمسی نظام سے پیدا ہونے والی توانائی اپنے صارفین کو دن اور رات میں مہیا ہوتی ہے۔ اگر اس نظام سے برقی خانہ نہ ہو تو توانائی تو پیدا ہوتی ہے مگر صرف دن کے اوقات میں ہی استعمال میں لائی جاسکتی ہے۔ جیسے سولر پمپ جس کا استعمال زرعی میدان میں بہت مفید ہے اور حکومت کی طرف سے فروغ حاصل ہے۔ اس نظام میں صرف شمسی تختیاں ہی ہوتی ہیں اس لیے اس کی قیمت کم ہوتی ہے۔ اس نظام میں برقی خانہ استعمال کیا جائے تو اس کا استعمال بہت بڑھ جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود اس میں برقی خانہ ہونے سے تین سے چار سالوں میں ان کو تبدیل کرنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ زیادہ مہنگا ہوتا ہے، اور سسٹم کی مجموعی کارکردگی کو کم کرتا ہے۔ اس نظام کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں پاور گریڈ نہ ہو جیسے بہت اونچے پہاڑی مقامات، جنگلات میں پانی کے پمپ اور ملک کی سرحد۔

(2) پاور گریڈ اور برقی خانہ سے منسلک شمسی نظام:

مندجہ بالا شمسی نظام کی خامیاں کچھ حد تک اس نظام یعنی پاور گریڈ اور برقی خانہ سے منسلک نظام سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام میں شمسی تختیاں، سولر انورٹر اور ایک یا ایک سے زائد برقی خانہ گریڈ سے منسلک کیا جاتا ہے۔ سولر پینل پر جب سورج کی روشنی پڑتی ہے تو روشنی میں موجود فوٹون سولر سیل برقی قوئی اور برقی رو پیدا کرتے ہیں۔ شمسی تختی 'سولر پی وی پینل' سے پیدا ہونے والی برقی رو غیر متغیر ہوتی ہے اس لیے یہ سولر انورٹر اس برقی رو کو متغیر برقی رو میں تبدیل کرتا ہے۔ دوسرا اہم کام سولر انورٹر کا یہ ہے کہ تبدیل شدہ برقی قوئی اور تواتر کو پاور گریڈ کی برقی قوئی اور تواتر کے مطابق باہم زمانی مطابقت یا باہم مربوط کرتا ہے۔ کیونکہ اس نظام میں پاور گریڈ اور برقی خانہ دونوں ہوتے ہیں اس لیے پاور گریڈ کے نہ ہونے پر بھی صارفین کو توانائی مہیا ہوتی رہتی ہے۔ اس نظام میں بھی برقی خانہ استعمال کیا جاتا ہے اس لیے برقی خانہ تین سے چار سالوں میں تبدیل کرنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ زیادہ مہنگا ہوتا ہے، اور سسٹم کی مجموعی کارکردگی کو کم کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا استعمال بہت بڑے پیمانہ پر کیا جاتا ہے۔ شکل نمبر 2 کے مطالعے سے صاف ظاہر ہے کہ پاور گریڈ نہ ہونے پر برقی رو مکمل ملتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ دو طرح کے برقی آلات یعنی جو غیر متغیر برقی رو اور متغیر برقی رو پر کام کرنے والے بیک وقت استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔ دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ ہر وقت توانائی میسر ہوتی ہے جس کی وجہ سے مخصوص استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کا بہترین مصرف دواخانے، بینک، محکمہ نشریات، رصدگاہیں اور کالج ہیں۔ اس نظام میں دونوں برقی توانائی، گریڈ اور شمسی دونوں علیحدہ علیحدہ استعمال ہوتے ہیں اس لیے شمسی توانائی کا مکمل استعمال نہیں ہو پاتا۔ اس لیے یہ نظام اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ ساتھ مہنگا بھی پڑتا ہے۔ پہلے دو طریقوں کے مقابلے تیسرا طریقہ زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے اس لیے تیسرے طریقے پر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

(3) شمسی توانائی کے نظام کو پاور گریڈ کے نظام سے مربوط کرنا:

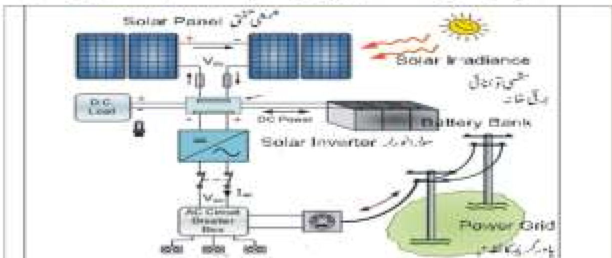

شمسی توانائی صرف دن کے وقت ہی توانائی پیدا کر سکتی ہے جبکہ برقی توانائی کی ضرورت رات اور دن میں ہوتی ہے۔ شمسی توانائی دن میں صرف 6 سے 8 گھنٹوں میں دستیاب ہوتی ہے جو کہ سورج کی روشنی کے مطابق صبح اور شام میں کم ہو جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود شمسی توانائی دوسری تمام توانائی کی بہ نسبت کم خرچ میں مہیا کی جا سکتی ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت اور بجلی کی تمام نجی، نیم سرکاری اور سرکاری اداروں نے اپنے بجلی کے نظام سے شمسی توانائی کے نظام کو مربوط کرنے کی اجازت دی ہے۔ بجلی کے اس پھیلے ہوئے نظام کو پاور گریڈ کہتے ہیں۔ شمسی توانائی کے نظام کو پاور گریڈ کے نظام سے مربوط کرنے سے شمسی توانائی اور برقی توانائی بیک وقت استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔ اگر سولر پینل کی استعداد زیادہ ہو تو دن میں پیدا ہونے والی شمسی توانائی مکمل طور پر صارف کی ضرورت کے لیے کافی ہوتی ہے اور رات میں پاور گریڈ کے نظام سے حاصل کی جاتی ہے۔ شمسی توانائی کے نظام کو پاور گریڈ کے نظام سے مربوط کرنے میں سولر انورٹر اہم رول ادا کرتا ہے۔ شکل نمبر 3 میں اس کا خاکہ بتایا گیا ہے۔

شکل نمبر 3

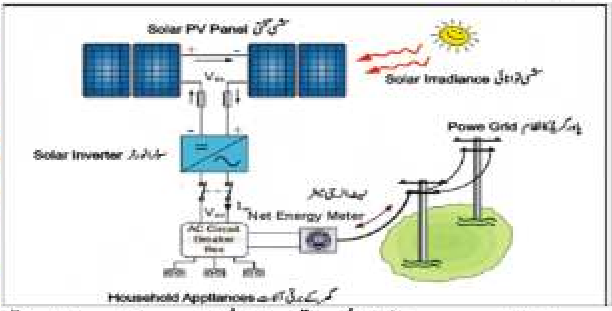

سولر پینل پر جب سورج کی روشنی پڑتی ہے تو روشنی میں موجود فوٹون سولر سیل برقی قوئی اور برقی رو پیدا کرتے ہیں۔ شمسی تختی 'سولر پی وی پینل' سے پیدا ہونے والی برقی رو غیر متغیر ہوتی ہے اس لیے یہ سولر انورٹر اس برقی رو کو متغیر برقی رو میں تبدیل کرتا ہے۔ دوسرا اہم کام سولر انورٹر کا یہ ہے کہ تبدیل شدہ برقی قوئی اور تواتر کو پاور گریڈ کی برقی قوئی اور تواتر کے مطابق باہم زمانی مطابقت یا باہم مربوط کرتا ہے۔ اس عمل سے شمسی توانائی کا نظام اور پاور گریڈ کا نظام صارف کو توانائی کے مہیا کرنے کے لیے برابر کے حصے دار ہو جاتے ہیں۔ جب شمسی توانائی کا نظام پاور گریڈ کے نظام سے مربوط ہو جاتا ہے تو شمسی توانائی کے نظام کی برقی قوئی کو تھوڑی سی مقدار میں بڑھا دینے سے شمسی توانائی پہلے صارف کے استعمال میں آتی ہے اور شمسی توانائی کی مقدار کم ہونے پر ہی پاور گریڈ کی توانائی استعمال ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شمسی توانائی کے نظام کی پوری استعداد و صلاحیت استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ صارف کی ضرورت سے زیادہ شمسی توانائی کا کیا کیا جائے؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ اضافی شمسی توانائی پاور گریڈ کے نظام کے ذریعے دوسرے صارفین کو مہیا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی سہولت کے لیے توانائی کا پیمائشی آلہ نئی تکنیک کا ہوتا ہے جسے نیٹ انرجی میٹر کہا جاتا ہے۔

اس نیٹ انرجی میٹر سے پاور گریڈ سے درآمد اور شمسی توانائی کے نظام سے برآمد توانائی کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ہر ماہ کے اخیر میں معلوم کیا جاتا ہے کہ صارف نے شمسی توانائی کا استعمال زیادہ کیا ہے یا پاور گریڈ کی توانائی کا۔ اگر شمسی توانائی کا استعمال زیادہ ہوا ہو تو صارف کو بجلی بل بہت کم یا بالکل نہیں ہوگا۔ اضافی توانائی گریڈ میں داخل ہو کر دیگر صارفین کے لیے مہیا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اضافی توانائی جمع ہوگئی۔ جب موسم ابر آلود ہو یا توانائی کا استعمال زیادہ ہو تو جمع شدہ اضافی توانائی واپس لے کر استعمال کی جاتی ہے۔ شمسی توانائی اور گریڈ کے مربوط نظام میں نیٹ انرجی میٹر توانائی کا بینک کا کردار ادا کرتا ہے۔

سولر پینل کو مکان کی چھت پر لگانے سے نہ صرف چھت کا استعمال ہوتا ہے بلکہ اس سے مکان کے اندر کے درجہ حرارت میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ حکومت کی جانب سے ایسے گھر کی چھت پر لگائے گئے شمسی توانائی کے نظام کے لیے بہت سی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس نظام کو نصب کرنے لیے زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ رقم محض 4 سے 5 سال میں وصول ہو جاتی ہے جبکہ اس نظام کی عمر تقریباً 22 سے 25 سال ہوتی ہے۔ اختتام اس بات پر کرتے ہیں کہ عصر حاضر میں شمسی توانائی کا بہترین مصرف شمسی توانائی کے نظام کو پاور گریڈ کے نظام سے مربوط کرنا ہے۔

■

M. Mujtahid Ansari
Plot No. 58, Block F-2,Salar Nagar, Jalgaon, Jalgaon (MS)
425001 ,Mob.: 9422864760,Email: mujtahidansari@gmail.com

صحت

کورونا وائرس

محمد رفیق اے ایس

کورونا وائرس، وائرسوں کا ایک گروپ ہے جو پستانوں اور پرندوں میں بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ انسانوں میں یہ وائرس سانس کی بیماریوں کے لگنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ عام طور پر ہلکے ہوتے ہیں لیکن سارس (SARS) اور میرس (MERS) جیسے نایاب اقسام کے وائرس مہلک ہیں۔ گائے میں وہ اسہال اور مرغیوں میں اوپری سانس کی بیماری کا سبب بنتے ہیں۔

کورونا وائرس ایک مثبت احساس والے ابھرے آراین اے جی نوم اور مرغولہ نما نیوکلیو کیسڈ کے ساتھ ملفوظ وائرس ہیں۔ زیادہ تر کورونا وائرس سردی پیدا کرنے والے وائرس کی طرح پھیلتے ہیں۔ یہ متاثرہ افراد سے کھانسی اور چھینکنے کے ذریعے ہوا میں منتشر ہوتے ہیں یا بعض اوقات کسی متاثرہ شخص کے ہاتھ یا چہرے کو چھونے سے یا ایسے بیماروں کو چھونے سے جنھیں متاثرہ لوگوں نے چھوا ہو۔

2003 کے بعد کم از کم 5 نئے انسانی کورونا وائرس کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں 'شدید تر مجموعی تنفسی علامات کو ظاہر کرنے والے مرض' (SARS) کا کورونا وائرس بھی شامل ہے۔ انتہائی مہلک اور جان لیوا ہے اس وائرس سے اب تک کئی اموات واقع ہو چکی ہیں۔ نشاندہی کیے گئے وائرسوں میں NL63، نئے شناخت گروپ I کورونا وائرس کی نمائندگی کرتا ہے جس میں NL اور انسانی کورونا وائرس شامل ہیں۔ اس کی شناخت دنیا بھر میں کی گئی ہے۔ یہ وائرس اوپری اور نچلی سانس کی نلی کی بیماری سے وابستہ ہے اور ممکنہ طور پر عام انسانی وسیلۂ مرض ہے۔ ایک اور نئے شناخت شدہ گروپ II کا وائرس جسے HQ1 کہتے ہیں۔ اس وائرس کی ابھی عالمی تقسیم قائم نہیں ہوئی ہے لیکن سارس (SARS) کی وبا نے جانوروں کے کورونا وائرس کو نمایاں کردیا ہے۔ کورونا وائرس جانوروں میں شروع ہوتے ہیں جیسے اونٹ، چمگادڑ وغیرہ یہ عام طور پر انسانوں میں منتقل نہیں ہوتے لیکن جانوروں سے انسانوں اور انسانوں سے انسان میں منتقل ہوسکتے ہیں جیسا کہ 2000 کی دہائی کے اوائل میں سارس (SARS) وبا کی صورتِ حال تھی، سارس کا مکمل نام Severe Acute Respiratory Syndrome لکھا جاتا ہے۔ اس کا مخفف SARS ہے۔ عموماً ہم اسے 'شدید تر مجموعی تنفسی علامات کو ظاہر کرنے والا مرض' کہتے ہیں۔

مرس کورونا وائرس (CoV-MERS) مشرق وسطی میں سب سے پہلے سعودی عرب میں 2012 میں رپورٹ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے دوسرے کئی ممالک کے لوگوں میں بیماری کا سبب بنا ہے۔ آج تک کے تمام معاملات جزیرہ نما عرب یا اس کے آس پاس کے ممالک سے منسلک ہیں۔ سی ڈی سی (CDC) عالمی سطح پر مرس کورونا وائرس پر کڑی نگرانی رکھتا ہے اور اس وائرس کے خطرات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے شراکت داروں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ یہ بہت سارے ممالک میں مختلف بیماریوں کا سبب بن چکے ہیں لیکن انسانوں میں یہ ہلکے اوپری سانس کے انفیکشن کا سبب بنتے ہیں۔ یعنی عام سردی۔ غیر معمولی مواقع پر یہ بچوں میں اسہال کے پھیلنے سے وابستہ ہوتے ہیں۔

کورونا وائرس کو ان کی سطح پر تاج کی طرح کے سپائکس کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ کورونا وائرس کی چار اہم ذیلی جماعتیں ہیں۔ جنھیں الفا، بیٹا، گاما اور ڈیلٹا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 1960 کی دہائی کے وسط میں پہلی بار انسانی کورونا وائرس کی نشاندہی ہوئی۔ سات کورونا وائرس جو لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ وہ ہیں:

1. مشترکہ انسانی کورونا وائرس
2. 229E (الفا کورونا وائرس)
3. NL63 (الفا کورونا وائرس)
4. OC43 (بیٹا کورونا وائرس)
5. HKU1 (بیٹا کورونا وائرس)
6. CoV-MERS
7. CoV-SARS

دنیا بھر میں لوگ عام طور پر انسانی کورونا وائرس OC43,NL63,229E اور HKU1 سے متاثر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کورونا وائرس جو جانوروں میں رہ کر جانوروں کو متاثر کرتے ہیں اگر یہ ترقی یافتہ ہو جائیں تو

پھر انسانوں کو بھی بیمار کر سکتے ہیں اور ایک نیا 'انسانی کورونا وائرس' بن سکتے ہیں۔ اس کی تین حالیہ مثالیں CoV-2019، CoV-SARS اور CoV-MERS ہیں۔ (CoV بمعنی کورونا وائرس)۔

چین کے نیشنل ہیلتھ کمیشن نے تصدیق کی ہے کہ یہ وائرس انسان سے انسان میں زیادہ پھیل سکتا ہے۔ لیکن بعض وائرس نہیں پھیلتے ہیں۔ دسمبر 2019 میں پہلے معاملے کا چینی شہر ووہان میں جانوروں کی ایک منڈی میں پتہ چلا تھا اور ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا تعلق زندہ جانوروں سے ہے جو کورونا وائرس سے متاثر تھے۔ اس کے بعد بازار بند ہے۔ ووہان رسد اور نقل وحمل کا اہم مرکز ہے۔ 11 ملین افراد پر مشتمل یہ شہر شنگھائی سے تقریباً 500 میل مغرب میں واقع ہے۔ چینی محکمہ صحت کے حکام ابھی بھی اس وائرس کی اصلیت کا تعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ووہان کے ایک سمندری غذائی بازار سے آیا ہے جہاں جنگلی جانوروں کا غیر قانونی طور پر کاروبار ہوتا تھا۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کسی جانور کے ذریعے پھیلنے کا زیادہ امکان ہے۔

ان وائرسوں نے عالمی سطح پر وبائی صورت میں جو تباہی مچائی ہے اس کی وجہ سے لازم ہے کہ ہم اس کے پس منظر اور تاریخ کا جائزہ لیں۔ MRCA جو کورونا وائرس کے عام اور مشترکہ آبا و اجداد کا تخمینہ لگاتا ہے اس نے کورونا وائرس کے حالیہ عام اجداد کو 8000 قبل مسیح میں رکھا ہے۔ مشترکہ آبا و اجداد کا تخمینہ 8100 قبل مسیح کے ارد گرد رکھتا ہے۔ الفا کورونا وائرس 2400 قبل مسیح، بیٹا کورونا وائرس 3300 قبل مسیح، گاما کورونا وائرس 2800 قبل مسیح اور ڈیلٹا کورونا وائرس 3000 قبل مسیح رکھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چمگادڑ اور گرم خون والے پرندے کورونا وائرس کے ارتقا کا بنیادی سبب ہیں۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کورونا وائرس اپنے عام آبا و اجداد اور مشترکہ آبا و اجداد سے الگ ہوتے چلے گئے اور اپنی انفرادی شناخت کو قائم رکھ کر صدیوں میں سفر کرتے رہے۔ 19 ویں صدی میں تحقیقات کی رفتار اور سمت میں جوں جوں ترقی ہوئی، تو عالمی سطح پر ان کی شناخت بھی ہوتی چلی گئی۔

انسانی کورونا وائرس کی تاریخ کا آغاز 1960 میں ہوا۔ B814 نامی منتقل ہونے والا یہ وائرس مریض کی سانس کی نالی میں پایا گیا تھا۔ اس وائرس نے بین الاقوامی انسانی رضا کاروں میں ایک متعدی ایجنٹ کی موجودگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی دوران چند میڈیکل طلبا کے حاصل کردہ نمونوں سے ٹشو کلچر میں غیر معمولی خصوصیات والے حمری کا وائرس 229E پایا گیا۔ دونوں وائرس حساسیت کے حامل تھے۔ اس دوران B814 سے متاثرہ عضو میں ایسے ذرات ملے جو مرغیوں کے متعدی برونکائٹس وائرس سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ وائرس چربی کی جھلی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ 1960 کی دہائی کے اواخر میں، ٹائرریل اپنے تحقیقی وائرسولوجسٹوں کے ایک گروپ کی رہنمائی کر رہا تھا جو انسانوں اور جانوروں میں پائے جانے والے وائرسوں پر کام کر رہا تھا۔ انھوں نے تحقیق کے دوران پایا کہ وائرس کی اوپری سطح برونکائٹس وائرس، ہیپاٹائٹس وائرس اور سوائن وائرس کے درمیان یکسانیت ہے۔ لہٰذا بعد میں باضابطہ طور پر وائرسوں کی ایک نئی صنف کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔

سیرولوجک تکنیکوں کا استعمال کرتے ہوئے جاری تحقیق کے نتیجے میں انسانی سانس کے کورونا وائرس کے وبائی امراض کے بارے میں کافی حد تک معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ معتدل آب و ہوا میں، سانس کے کورونا وائرس کے انفکشن موسم سرما اور بہار میں گرمیوں اور موسم خزاں کے مقابلے میں زیادہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ڈیٹا سے انکشاف ہوا ہے کہ وبائی صورت میں کورونا وائرس کے انفکشن کا زیادہ سے زیادہ 35 فی صد حصہ ہے۔ اس دریافت کے بعد تین دہائیوں میں خصوصی طور سے OC43 اور 229E پر مطالعہ کیا گیا اور تحقیق کے دوران یہ پایا گیا کہ یہ وقفے وقفے سے اپنے وجود کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہر 2 سے 3 سال کے وقفوں کے بعد بڑے وبائی امراض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ 229E پورے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وبا کا ذمہ دار تھا۔ جیسا کہ 1960 میں انسانی کورونا وائرس کی دریافت کر لی گئی تھی۔ ابتدائی دریافت میں یہ پایا گیا تھا کہ مرغیوں میں متعدی برونکائٹس کا وائرس تھا، جو عام سردی میں متاثر انسانی مریضوں میں پایا گیا اس کے بعد اس خاندان کے دوسرے افراد کی نشاندہی کی گئی 2003 میں CoV-SARS، 2004 میں CoV-NL63، 2005 میں HK11، 2012 میں CoV-MERS اور 2019 میں NCoV کا انکشاف ہوا۔ حالیہ دنوں کے چین کے ووہان شہر میں یہی NCoV نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اب اس وائرس کا نام NCoV-2019 رکھا گیا ہے۔

'کورونا وائرس' کا نام لاطینی کورونا اور یونانی (کورین، مالا، چادر) سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے تاج یا ہالہ۔ کورونا وائرس کے کروی سطح پر اسپائکس نصب ہیں جو تاج نما نظر آتے ہیں۔ یا ہالہ کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں جس میں سطح کے بڑے کروی بلب نما پروٹین کا ایک تناسب ہے۔ یہ پروٹین وائرس کی سطح کو آباد کرتے ہیں اور میزبان ٹراپزم کا تعین کرتے ہیں۔ پروٹین جو تمام کورونا وائرس کی مجموعی ساخت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، وہ در اصل اسپائک، غلاف، جھلی اور نیوکلیوکسیڈ ہیں۔ بعض کورونا وائرس میں ہائے گوگلوٹین نامی ایک چھوٹا سا اسپائک (تیری) نما پروٹین بھی ہوتا ہے۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کورونا وائرس انفکشن سائکل کیا ہے۔ یہ وائرس معتدل یا سرد ہوا میں زیادہ اثر کرتا ہے۔ سانس کے ذریعے یہ

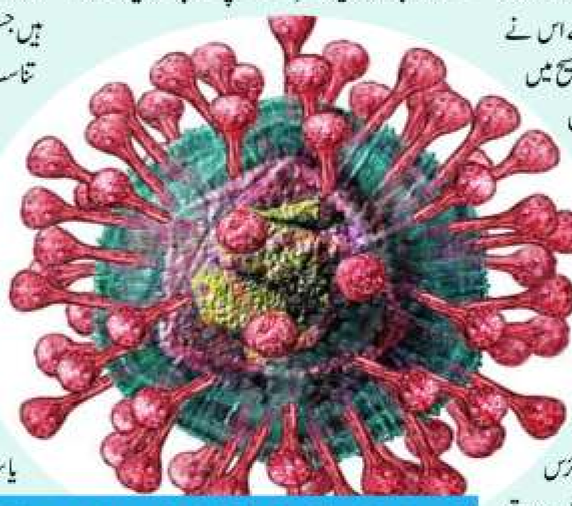

'کورونا وائرس' کا نام لاطینی کورونا او ریونانی (کورین، مالا، چادر) سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے تاج یا ہالہ۔ کورونا وائرس کے کروی سطح پر اسپائکس نصب ہیں جو تاج نما نظر آتے ہیں۔ یا ہالہ کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں جس میں سطح کے بڑے کروی بلب نما پروٹین کا ایک تناسب ہے۔ یہ پروٹین وائرس کی سطح کو آباد کرتے ہیں اور میزبان ٹراپزم کا تعین کرتے ہیں۔ پروٹین جو تمام کورونا وائرس کی مجموعی ساخت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، وہ در اصل اسپائک، غلاف، جھلی اور نیو کلیوکسیڈ ہیں۔ بعض کورونا وائرس میں ہائے گوگلوتین نامی ایک چھوٹا سا اسپائک (تیری) نما پروٹین بھی ہوتا ہے۔

ناک میں موجود نمی سے چپک جاتا ہے۔ سانس کی نالی میں بھی نمی میں پرورش پاتا ہے۔ خلیہ میں داخل ہونے کے بعد، وائرس کا ذرہ غیر محلول ہوتا ہے لہٰذا یہ آر این اے جی نوم کو سائٹو پلازم (خلیہ مائیہ) میں جمع کیا جاتا ہے۔ کورونا وائرس آر این اے جی نوم میں 5 'میتھیلی ٹیڈ' اور 3 'پولی ایڈنل ٹیڈ' ہے یہ آر این اے کو مبدل کرکے ریبوسومس سے منسلک کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ کورونا وائرس میں ایک پروٹین بھی موجود ہے جس کو ایک جزو میں انکوڈ کردہ نقل کے طور پر جانا جاتا ہے جس سے آر این اے وائرل جی نوم کو میزبان کے خلیہ کے اجزا کا استعمال کرتے ہوئے نئی آر این اے کاپیوں میں نقل کیا جاتا ہے۔ ایک بار جین کو انکوڈنگ والے نقل کا مبدل ہوجانے کے بعد، اسٹاپ کوڈنگ کے ذریعے مبدل بند ہو جاتا ہے۔ جب ایم آر این اے ٹرانسکرپٹ صرف ایک جین کو کوڈ کرتا ہے ایک کورونا وائرس غیر ساختی پروٹین نقل کو اضافی سہولت فراہم کرتا ہے کیونکہ اس میں پروف فنکشن ہوتا ہے جس میں صرف آر این اے پولی مریج خامرے کا فقدان ہے۔ آر این اے جی نوم کی نقل تیار کرکے ایک لمبی پو پروٹین تشکیل دی گئی ہے جہاں تمام پروٹین منسلک ہیں۔ کورونا وائرس میں غیر ساختی پروٹین ہوتا ہے ایک پروٹیز جو سلسلے میں پروٹین کو الگ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ وائرس کے لیے جینیاتی معیشت کی ایک شکل ہے۔ متاثرین میں ہونے والے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کورونا وائرس تیز تنفس خلیوں میں ہی بڑھتے ہیں۔ متاثرہ خلیے خالی ہوکر خراب ہو جاتے ہیں اور سنسنی پیدا کرتے ہیں۔ خلیوں کے نقصان سوزش ثالثوں کی پیداوار کو متحرک کرتا ہے جو ناک کی رطوبت کو بڑھاتا ہے اور مقامی سوزش اور سوجن کا سبب بنتا ہے۔ اسی کے ردعمل کی صورت میں چھینک کو متحرک کرتے ہیں۔ سانس لینے میں دشواری پیدا کرتے ہیں اور غشائے مخاطی (Mucosae) کے درجۂ حرارت میں اضافہ کرتے ہیں۔

زیادہ تر کورونا وائرس کی علامات کسی دوسرے اوپری سانس کے انفکشن سے ملتی جلتی ہیں، جس میں ناک بہنا، کھانسی، سردرد، گلے کی سوزش اور کبھی کبھی بخار شامل ہے۔ زیادہ تر معاملات میں، آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ آپ کو کورونا وائرس ہے یا سردی پیدا کرنے والا کوئی دوسرا وائرس، جیسے رائنو وائرس۔ انسانی کورونا وائرس بعض اوقات کم تنفس کی بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے، جیسے نمونیہ یا برونکائٹس، قلبی بیماری والے لوگ، کمزور مدافعتی نظام والے افراد، نوزائیدہ بچوں اور بوڑھے بالغوں میں یہ زیادہ عام ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق سنگین نوعیت کی علامات میں نمونیہ گردے کی خرابی اور یہاں تک کہ موت بھی شامل ہے۔ ادارے نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کورونا وائرس بخار کے ساتھ سانس کی علامات کا بھی سبب بنتا ہے جیسے خشک کھانسی اور سانس لینے میں دشواری۔ اس سے اسہال اور جسمانی تکلیف بھی ہوسکتی ہے۔

کورونا وائرس انسانی بالغوں اور بچوں میں عام نزلہ

کی نمایاں فی صد کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ کورونا وائرس بڑی علامات کی وجہ سے نزلہ زکام کا سبب بنتا ہے جیسے بخار، گلے میں سوجن، ایڈنوئڈز، بنیادی طور پر موسم سرما اور بہار کے موسموں میں کورونا وائرس نمونیہ کا سبب بن سکتا ہے یا تو وہ براہ راست وائرل نمونیہ یا ثانوی بیکٹریل نمونیہ کا سبب بن سکتا ہے۔ مرس اور سارس کی وجہ سے شدید تر مجموعی تنفسی علامات کا سبب بنتا ہے۔ یہ وسیلۂ مرض انوکھا ہوتا ہے کیونکہ اس سے اوپری اور نچلے حصے میں سانس کی نالی کے انفکشن دونوں ہوتے ہیں۔ چین کے شہر ووہان میں حالیہ وبا کے متاثرین میں پایا گیا کہ تمام مریضوں کو نمونیہ ہوا تھا، زیادہ تر بخار میں مبتلا تھے۔ ان میں سے تین چوتھائی کو کھانسی تھی اور آدھے سے زیادہ کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ معروف مصنف بن لاؤ نے مزید کہا کہ بہتی ناک کی کمی، چھینکنے یا گلے کی سوزش میں کچھ اہم اختلافات ہیں۔

کورونا وائرس ناک کے ذریعے سانس کی نالی پر تقریباً 3 دن کے عرصۂ خواب کے بعد حملہ کرتے ہیں اور عام سردی کی علامات کا سبب بنتے ہیں جس میں ناک کی رکاوٹ، چھینکنے، ناک بہنا اور کبھی کبھار کھانسی شامل ہے۔ یہ بیماری کچھ ہی دنوں میں حل ہوجاتی ہے، اس دوران وائرس ناک سے خارج ہوتا ہے، کچھ ایسے شواہد موجود ہیں کہ سانس کا کورونا وائرس نچلی ہوائی راستوں کی بیماری کا سبب بن سکتا ہے لیکن اس کا امکان نہیں ہے کہ یہ براہ راست حملے کی وجہ سے ہوا ہے۔ بیماری کے دیگر انکشافات کا واضح ثبوت نہیں ہے۔

صحت کے حکام اور سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ احتیاطی تدابیر کے طور پر اپنے ہاتھ کو بار بار دھوئیں، کھانسی کے دوران منھ پر رومال یا کپڑا رکھیں، اپنے چہرے کو ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کریں۔ وبا پھیلی ہوئی جگہ سے دور رہیں۔

اس مرض کی تشخیص مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ انسانی کورونا وائرس کا پتہ لگانے کے لیے سانس کے نمونوں اور سیرم (آپ کے خون کی قلیل مقدار) پر لیبارٹری ٹسٹ کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ مذکورہ علامات کا سامنا کررہے ہیں تو ڈاکٹر کو اپنی صحت کی تفصیل بتانی چاہیے۔ کسی حالیہ سفر یا جانوروں سے رابطہ کے بارے میں بھی بتانا چاہیے۔ جزیرہ نما عرب کے ممالک سے زیادہ تر 'مرس' انفکشن کی اطلاعات ملی ہیں لہٰذا 'مرس' کی تشخیص کرنے کی کوشش کرتے وقت سفری تاریخ یا اونٹ یا اونٹ کے سامان سے رابطے کی اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ لیبارٹری تشخیص کا سب سے مفید طریقہ یہ ہے کہ جوڑی والی سیرا (شدید بیماری اور تعلقی مراحل سے) اکٹھا کیا جائے۔ اینٹی باڈیوں میں اضافے کے لیے ایلیسا (ELISA) کے ذریعے جانچ کی جائے۔ وائرل نیوکلیک ایسڈ کے لیے براہ راست ہائبرڈائزیشن اور پولیمریز چین ردعمل کے ٹیسٹ تیار کیے گئے ہیں اور خاص طور پر مؤخر الذکر کے ساتھ، وائرس کا پتہ لگانے کے لیے فی الحال انتہائی حساس آسس دستیاب ہیں۔

اگرچہ اینٹی وریل تھراپی کی کوشش کی گئی ہے لیکن کورونا وائرس نزلہ کا علاج علامتی ہے۔ صحت مند اقدامات پر عمل کرکے اس کے پھیلنے کے امکانات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ ویکسین فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔

■

Dr.Mohammad Rafique A.S.
Baitul Ameen, Naya Bazar,
Badi Masjid, Kamptee-441001
Dist:Nagpur (M.S.)
Mobile: 9822225038
E-mail: rafique.as24@gmail.com

ناظر انور

ظفر گورکھپوری کے فلمی گیت

ظفر گورکھپوری (1935-2017) کی پوری زندگی ممبئی جیسے بڑے شہر میں گزری۔ حالانکہ ان کی پیدائش گورکھپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں بیدولی بابو میں ہوئی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنا قلمی نام ظفر گورکھپوری رکھ لیا۔ بچپن کے ابتدائی ایام گاؤں کے پرسکون ماحول میں گزرے۔ 9 سال کی عمر میں ممبئی کا رخ کرنے کے بعد وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ 1962 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'تیشہ' منظر عام پر آیا۔ ادبی حلقے میں اس مجموعے کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد غزلوں، نظموں، گیت اور دوہوں پر مشتمل ان کے 11 مجموعے شائع ہوئے، جن کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی۔

ظفر گورکھپوری نے جہاں غزل کے میدان میں فکری اور فنی سطح پر اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا اظہار کیا ہے، وہیں ان کی نظموں کا موضوعاتی تنوع اور شعری جوہر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ گیت اور دوہوں میں بھی انھوں نے ان کے بنیادی تقاضوں کو برتتے ہوئے فنکارانہ مہارت کا اظہار کیا ہے۔ بچوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے، اور بچوں کے لیے خوب ساری نظمیں اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ غزل گائیکی کے میدان میں بڑے بڑے سنگروں نے ان کی غزلوں کو اپنی آواز دی ہے۔ فلموں میں گانے لکھ کر اپنے آپ کو فلمی دنیا میں متعارف بھی کرایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فلمی دنیا کی چمک دمک اور مصنوعی زندگی کبھی بھی ظفر گورکھپوری کو اپنی طرف مائل نہ کرسکی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی بھی فلموں میں گانے لکھنے کو ترجیح نہیں دی۔ ان کی زندگی کا اصل مقصد ادب اور درس و تدریس سے وابستگی اور اس کی آبیاری تھی، لیکن جب بھی کسی ڈائریکٹر، پرڈیوسر یا موسیقار نے ان کو خود فلمی نغمہ لکھنے کے لیے مدعو کیا تو انکار بھی نہیں کرسکے۔

ظفر گورکھپوری نے فلموں کے علاوہ سیریلوں میں بھی بہت سے گیت لکھے۔ جن میں 'سب کا مالک ایک' اور 'عورت' جیسے سیریل قابل ذکر ہیں۔ فلموں میں گانے لکھنے کی شروعات 1969 میں ہوئی۔ جب پہلی بار پروڈیوسر ایس پال نے اپنی فلم 'آتش' کا ایک گانا لکھنے کے لیے خط لکھ کر ظفر گورکھپوری کو مدعو کیا۔ ان کی فرمائش پر ظفر گورکھپوری نے ایک گانا لکھا، جس کی دھن موسیقار جے دیو نے بنائی۔ اور محمد رفیع نے اپنی مترنم آواز میں اس کو سامعین تک پہنچایا۔

یہ شعلے بھڑکے ہیں کیسے دنیا کو سمجھائے کون
چتا کی آگ تو بجھ جائے گی دل کی آگ بجھائے کون

اگلے ہی سال 1970 میں فلم 'کھنس' کے لیے ظفر گورکھپوری کی ایک مشہور غزل محمد رفیع کی آواز میں ریکارڈ ہوئی۔ اس موسیقی کی دھن بھی موسیقار جے دیو نے تیار کی۔ گانا تو سامعین تک پہونچ گیا لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر یہ فلم ریلیز نہیں ہوسکی۔

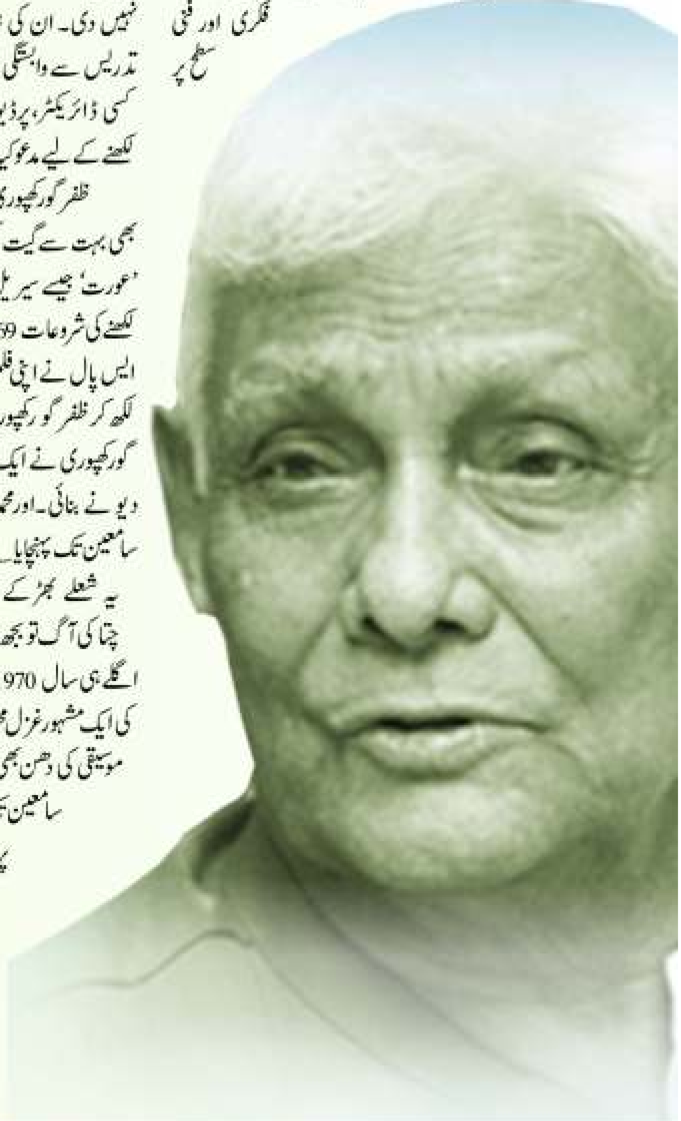

عشق میں کیا کیا میرے جنوں کی، کی نہ برائی لوگوں نے
کچھ تم نے بدنام کیا کچھ آگ لگائی لوگوں نے
میرے لہو کے رنگ سے چمکی کتنی مہندی ہاتھوں پہ
شہر میں جس دن قتل ہوا میں عید منائی لوگوں نے

1972 میں ڈائریکٹر اشوک رائے کی مشہور فلم 'چتلی بائی' ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں ظفر گورکھپوری کی ایک قوالی کو شامل کیا گیا۔ جس کو اس دور کے دو مشہور قوال راشدہ خاتون اور یوسف آزاد نے گایا تھا۔

ایسے بے شرم عاشق ہیں یہ آج کے
ان کو اپنا بنانا غضب ہو گیا

اسی طرح فلم 1976 میں ریلیز ہوئی ایک فلم 'نور الٰہی' میں بھی ظفر گورکھپوری نے ایک قوالی لکھی، جو کہ بہت مشہور ہوئی۔ اس قوالی کو بھی راشدہ خاتون اور یوسف آزاد نے ہی گایا تھا۔

جو ممی کی آنکھوں کے تارے تھے ہم تم
تو ڈیڈی کے دل کے سہارے تھے ہم تم
بڑا لطف تھا جب کنوارے تھے ہم تم

1976 میں ایک فلم 'زمانے سے پوچھو' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کا ایک گانا 'بولے حضور' ظفر گورکھپوری نے لکھا جس کو امریش کباڈیا، کیدار خان اور مراد نے اپنی آواز میں لوگوں تک پہنچایا۔ گانے کے بول یہ ہیں۔

آپ کے قریب آپ ہی کے پاس
رات بھی جواں ہم بھی ہیں یہاں
بولیے حضور آپ ہیں کہاں؟

1979 میں نانو بھائی وکیل کی خواہش پر ظفر گورکھپوری نے فلم 'شان اللہ' کے سارے گیت لکھے۔ اس فلم میں ایک قوالی خواجہ اجمیری کی شان میں بھی ہے لیکن بدقسمتی سے فلم مکمل ہونے سے پہلے ہی نانو بھائی وکیل کا انتقال ہوگیا۔ اور یہ فلم ادھوری رہ گئی۔ اسی سال پروڈیوسر مجید خان نے ظفر گورکھپوری کے مجموعے میں شامل ایک غزل کو اپنی فلم 'زمانے سے پوچھو' کے لیے ریکارڈ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ غزل شاردا کی آواز میں ریکارڈ ہوئی۔

ہم بھنور میں کنارے بنایا کریں، تم کناروں سے طوفاں اٹھاتے رہو
ہم چراغوں کو خوں دے کے روشن کریں تم اندھیروں کی ہمت بڑھاتے رہو

اس کے بعد مجید خان نے اس فلم کے دوسرے گانے بھی ظفر گورکھپوری سے ہی لکھوائے۔ جو محمد رفیع اور کشور کمار کی آواز میں ریکارڈ ہوئے۔

1980 میں فلم 'شمع' کے گانے کے لیے فلم ساز قادر خان نے ظفر گورکھپوری کو اپنے گھر بلایا اور اس فلم میں گانے لکھنے کے لیے درخواست کی۔ اس فلم کے اکثر گانے ظفر گورکھپوری نے ہی لکھے۔ ان گانوں میں لتا منگیشکر کا گایا ہوا ٹائٹل سانگ بہت مشہور ہوا۔

چاند اپنا سفر ختم کرتا رہا
شمع جلتی رہی رات ڈھلتی رہی
دل میں یادوں سے نشتر ٹوٹا کیے
ایک تمنا کلیجہ مسلتی رہی

اس کے علاوہ آشا بھونسلے نے اس فلم میں ظفر گورکھپوری کے لکھے ہوئے دو گانوں کو اپنی آواز دی۔

ایک بار صرف ایک بار تو جو مسکرا دے
ایک بار مسکرا دے رونے سے کیا ملے گا
او ماں مجھے بتا دے

خوشبو بن تو ہرے آنگن میں مہکوں
توہری چوکھٹ پے بیتے عمریا
اونچی اٹریا ریشمی چنریا
چاہوں نہ کچھ بھی سنوریا

1993 میں ظفر گورکھپوری کا تعارف میوزک ڈائریکٹر انو ملک سے بذریعہ فون ہوا۔ انھوں نے ظفر گورکھپوری کو عباس مستان کی ڈائریکٹیڈ مشہور فلم 'بازی گر' کے لیے گانے لکھنے کی دعوت دی۔ ظفر گورکھپوری نے اس فلم میں ایک گانا لکھا، جس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی، اس گانے کو ونود راٹھور اور آشا بھونسلے کی آواز میں سامعین نے بہت سراہا۔

کتابیں بہت سی پڑھی ہوں گی تم نے
مگر کوئی چہرہ بھی تم نے پڑھا ہے

اس ہٹ گانے کے بعد ظفر گورکھپوری کی قربت انو ملک سے بڑھتی گئی، جس کے نتیجے میں ظفر گورکھپوری نے کئی فلموں کے لیے گانے لکھے۔ ان فلموں میں غنڈہ راج، ہلچل، کھلونا، خوددار اور ظالم وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1994 میں فلم 'ظالم' کے لیے ایک گانا لکھا۔ جس کو کمار سانو اور الکا یاگنک نے اپنی آواز دی۔ اور انو ملک اس گانے کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔

مبارک ہو مبارک ہو محبت گنگناتی ہے
تمھارا دل دھڑکتا ہے مجھے آواز آتی ہے

1995 میں فلم 'غنڈہ راج' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کا ایک گانا بہت مشہور ہوا، جس کو ظفر گورکھپوری نے لکھا تھا۔ اس گانے کے میوزک ڈائریکٹر انو ملک تھے، جبکہ علیشا چینوئی اور کمار سانو نے اس کو گایا تھا۔

نہ جانے ایک نگاہ میں کیا لے گیا کوئی
میری تو زندگی چرا لے گیا کوئی

1995 میں فلم 'ہلچل' کے لیے ظفر گورکھپوری نے ایک گانا لکھا۔ جس کے میوزک ڈائریکٹر انو ملک تھے۔ علیشا چینوئی اور ونود راٹھور نے اس گانے کو اپنی خوبصورت آواز میں سامعین تک پہونچایا تھا:

I am sixteen, going on seventeen
دل کیوں نہ دھک دھک کرے

1996 میں مشہور فلم 'کھلونا' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے ایک گانے کو سامعین نے بہت پسند کیا، جس کو الکا یاگنک اور ونود راٹھور نے گایا تھا۔ اس گانے کے میوزک ڈائریکٹر نریش شرما تھے، جس کو ظفر گورکھپوری نے لکھا تھا۔

ہم جانتے ہیں تم ہمیں ناشاد کروگے
توڑوگے میرا دل مجھے برباد کروگے
دل پھر بھی تمھیں دیتے ہیں کیا یاد کروگے

ظفر گورکھپوری بھوجپوری زبان بھی جانتے تھے۔ انھوں نے 1984 میں ایک بھوجپوری فلم 'گنگا کی بیٹی' کے لیے ایک گانا لکھا جو بھوجپوری علاقوں میں خاصا مقبول بھی ہوا۔ اس گانے کے بول تھے۔

دھیان چھوڑے پنڈت ایمان چھوڑے ملاّ
ہم نہ ہیبر راجا تک بلاّ

اس کے علاوہ ظفر گورکھپوری نے کئی بھوجپوری فلموں کے لیے گانے لکھے۔ جن کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ بے حد مقبول اور مشہور فلمی گانے لکھنے کے باوجود بھی ظفر گورکھپوری نے بحیثیت فلمی نغمہ نگار کبھی اپنی پہچان بنانے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی اس کو ذریعہ معاش بنانے کا خیال ان کے دل میں آیا کیونکہ فلمی دنیا کی بھاگ دوڑ اور جی حضوری ان کی مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اپنا وقت وہ فلمی دنیا کے گلیاروں میں چکر کاٹتے ہوئے گزارنا نہیں چاہتے تھے۔ فلمی دنیا کے شور اور گہما گہمی میں اپنے سکون اور چین کا سودا کرنا ان کو پسند نہیں آیا۔ ظفر گورکھپوری کا ذریعہ معاش درس وتدریس تھا۔ اور اسی پیشے میں وہ پرسکون اور مطمئن بھی تھے۔ اس سلسلے میں صاحب حسن کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں کہ:

''میں نے فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے کبھی اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی اپنے اوپر فلمی گیت کار کا لیبل لگانا پسند کیا۔ بعض حلقوں کے اصرار پر کہ فلم ایک بڑا میڈیم ہے اسے نظر انداز کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں نے کچھ فلموں کے گیت لکھے۔ وہ بھی کب؟ جب مجھے کسی موسیقار یا پروڈیوسر نے خود بلایا۔ میں نے اپنے طور پر کبھی کسی موسیقار یا پروڈیوسر کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ فلم 'شمع' اور 'بازی گر' کے ہٹ ہو جانے پر کچھ دوستوں نے یہ اصرار کیا کہ اب معلّمی چھوڑ دو اور فلم کے ہو جاؤ، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، ادب اور تعلیم میرے لیے اوڑھنا بچھونا تھے۔ میری معاش کا ذریعہ بھی یہی تھے۔ میں ان سے مطمئن رہا اور اپنا کام کرتا رہا۔''

(ظفر گورکھپوری: سر آئینہ (خود نوشت)، سہ ماہی شناخت، ممبئی، مارچ- مئی 2013، ص 33)

فلمی دنیا سے دوری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ظفر گورکھپوری کا مزاج کبھی کاروباری نہیں رہا۔ ایک زمانے تک فلموں میں گانے لکھنے کے لیے شعرا کو پوری تخلیقی آزادی ہوتی تھی، اور وہ پوری آزادی سے ادبی ومعیاری اور سطحیت سے پاک گیت لکھتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بیشتر فلمی گانے کی دھن (Tune) پر لکھے جانے لگے اور ایسے گانوں کو مقبولیت ملی جس میں تہذیب، شائستگی، اخلاقیات اور اعلیٰ ظرفی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ گانوں میں فحش الفاظ اور فحش مناظر کے بے جا استعمال نے ظفر گورکھپوری کو فلمی دنیا نے بد دل کر دیا اور اسی وجہ سے انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھوں نے کئی ایسے گانوں کے آفر کو اسی بنا پر ٹھکرا بھی دیا۔ شجاع الدین شاہد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ظفر گورکھپوری کہتے ہیں کہ:

''میرا ذریعۂ معاش درس وتدریس تھا اور میں اسی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ شاعری میرا شوق ہی نہیں میرا مشن بھی تھی۔ میں اپنا مشن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے ادبی اور تعلیمی کاموں میں ہی سکون تھا۔ یوں بھی فلم، اس کی دنیا کا گلیمر، اس کی چکا چوند اور کاروباری کلچر میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا''

(ظفر گورکھپوری: شجاع الدین شاہد، ظفر گورکھپوری سے گفتگو (انٹرویو)، شعروحکمت، حیدرآباد، مئی 2011، ص 185)

فلمی دنیا کے اس مختصر سفر کے دوران جن سنگروں نے ظفر گورکھپوری کے نغموں کو آواز دی، ان میں محمد رفیع، آشا بھونسلے، لتا منگیشکر، طلعت عزیز، کشور کمار، کمار سانو، الکا یاگنک، علیشا چینوئی اور ونود ٹھاکر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

■

Nazir Anwar
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:7417463821

ایم ایس-ایکسل کیا ہے؟

(What is MS-Excel?)

پچھلے حصے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایم ایس- ایکسل ایک اسپریڈشیٹ (Spreadsheet) پروگرام ہے۔ اسے اختصار میں ایکسل (Excel) بھی کہا جاتا ہے۔ ایم ایس- ایکسل کا نیا ورژن (ایکسل 2007) نئے ٹیب اور آپشنز سے مزین ہے۔ جو لوگ ایکسل کے پچھلے ورژنوں پر کام کر چکے ہیں، ان کے لیے ایم ایس- ایکسل 2007 پر کام کرنا بہت ہی آسان ہے۔ جن لوگوں کے لیے اسپریڈشیٹ بالکل نئی چیز ہے، وہ بھی اسے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور کام کر سکتے ہیں۔

کوئی اسپریڈشیٹ، جسے ورک شیٹ (Work Sheet) بھی کہتے ہیں، بہت سے خانوں یا سیلز (Cells) کا ایک گروہ ہوتا ہے، جنھیں قطاروں (Rows) اور کالموں (Columns) میں مرتب کیا جاتا ہے۔ قطاریں بائیں سے دائیں، یعنی افقی (Horizontal) ہوتی ہیں، جب کہ کالم اوپر سے نیچے، یعنی عمودی (Vertical) ہوتے ہیں۔ قطاروں اور کالموں کے تقاطع (Intersection) سے خانے یا سیل بنتے ہیں۔ ہر ایک سیل میں ہم کوئی ایک عدد (Number)، لیبل (Label)، تاریخ (Date)، وقت (Time) وغیرہ بھر سکتے ہیں یا ٹائپ کر سکتے ہیں۔ ایکسل میں قطاروں کو نمبر شمار سے پہچانا جاتا ہے، جیسے ...1,2,3 وغیرہ، جب کہ کالموں کو حروف (Letters) سے پہچانتے ہیں، جیسے ...A,B,C وغیرہ۔ کسی سیل کا پتہ (Address) اس کی قطار اور کالم کے ناموں کا مجموعہ (Combination) ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیل C8 کا مطلب ہے C کالم (بائیں طرف سے تیسرا کالم) کا اوپر سے آٹھواں سیل، یعنی آٹھویں قطار میں بائیں طرف سے تیسرا سیل۔ ورک شیٹ میں ہر ایک قطار کے بائیں اور ہر ایک کالم کے اوپر ان کا نام (Label) لکھا ہوتا ہے، جس سے سیل کو پہچاننے میں آسانی رہتی ہے۔

سیلوں میں ہم فارمولے (Formulas) بھی بھر سکتے ہیں۔ ہر ایک فارمولہ کسی شمار کے لیے بھرا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم سیل B1 سے B7 تک سات سیلوں میں سات عدد بھر سکتے ہیں اور ان کا جمع دکھانے کے لیے سیل B8 میں فارمولہ بھر سکتے ہیں۔ ایکسل میں کی- بورڈ اور ماؤس کی مدد سے فارمولہ بنانا بہت آسان ہے۔ اتنا ہی نہیں، ایکسل میں آپ مختلف ٹیب کے ٹولس، آپشنز اور افعال (Functions) کا استعمال کر کے مشکل سے مشکل فارمولے بنا سکتے ہیں اور پیچیدہ حسابی کام کر سکتے ہیں۔

ایکسل میں فارمیٹ کرنے کی بے شمار سہولیات موجود ہیں، جن کے ذریعے آپ اپنی ورک شیٹ یا اس کے کسی حصہ کو خوبصورتی کے ساتھ پرنٹ کر سکتے ہیں۔ ایکسل کے Insert ٹیب کا استعمال کر کے آپ ورک شیٹ میں بھرے ہوئے اعداد یا ناموں (Labels) کو مختلف قسم کے گرافوں، جیسے پائی چارٹ، لائن گراف، بار چارٹ، سہ ابعادی (Three Dimensional) چارٹ وغیرہ کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ایم ایس- ایکسل کو ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس لیے اس میں اور ایم ایس- آفس کے ونڈوز پر مبنی دوسرے پروگراموں میں زبردست یکسانیت ہے۔ اس میں عبارت کو ایڈٹ کرنے اور فارمیٹ کرنے کی انھیں تکنیکوں کا استعمال کیا جاتا ہے، جن کے بارے میں آپ ایم ایس- ورڈ والے حصہ (حصہ 3) میں پڑھ چکے ہیں۔ ایکسل کی بہت سی ہدایتوں یا کمانڈ اور ٹیب میں ان کی جگہ ایم ایس- ورڈ کی ہدایتوں کی طرح ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایم ایس- ایکسل ونڈوز پر مبنی دوسرے پروگراموں کے ساتھ گہرائی سے جڑا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر، آپ دوسرے پروگراموں کے ذریعے تیار کی گئی تصویروں کو ایکسل کی ورک شیٹ میں لا سکتے ہیں اور ایکسل کی ورک شیٹ سے ڈاٹا اور چارٹوں کو ایم ایس- ورڈ دستاویزوں اور پاور پوائنٹ کی سلائڈوں میں بھیج سکتے ہیں۔

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

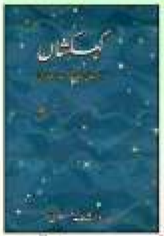

مصنف: وارث علوی

صفحات: 527، قیمت: 240 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی ، S-2/5A، تیسری منزل، فاطمہ اپارٹمنٹ جوگابائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو کی ادبی تنقید میں وارث علوی ایک اہم نام ہے۔ان کی تنقید میں مشرقی اور مغربی دونوں نقادوں کی تنقید کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔ان کی کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اپنا معیار نقد ہے جس کی کسوٹی پر وہ تخلیق کاروں کی تخلیقات کو پرکھتے ہیں اور ان کے محاسن ومعائب کی نشان دہی کرتے ہیں۔انھوں نے بیشتر مشرقی نقادوں کی تنقید پر اپنی کتاب 'فکشن کی تنقید کا المیہ' میں اپنے شگفتہ تنقیدی اسلوب میں کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ان کی تنقیدی بصیرت اور عام تنقیدی رجحانات سے انحراف ان کی تحریروں میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی حالیہ کتاب 'کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری) کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔یہ کتاب ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے آپ وارث علوی کی تنقیدی جہات اور ان کی متنوع شخصیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔اس کتاب میں کل 23 مضامین شامل ہیں جن میں مختلف شاعروں کی شعری تخلیقات کی روشنی میں ان کے حسن وقبح کو بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی دوسرے ناقدین کی تنقیدات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا مدلل اور واضح نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔

کتاب میں شامل پہلا، دوسرا اور تیسرا مضمون اقبال کی شعری تخلیقات کے نشیب وفراز اور ان ناقدین کی تنقید پر طنز کے حوالے سے ہے جو اقبال کو شاعر کم فلسفی زیادہ سمجھتے ہیں۔ماہرین اقبال اور ناقدین اقبال نے جتنا فلسفہ اپنی تنقید میں بگھارا ہے اتنا اقبال کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔وارث علوی نے بالکل درست بات کہی ہے کہ 'اقبال کے نقاد بنیادی طور پر ادبی نقاد نہیں تھے۔وہ ان کے افکار کی تفسیر وتاویل کرتے رہے لیکن ادبی تجربات اور جمالیاتی اقدار پر مبنی تنقیدی اصولوں کی روشنی میں ان کے کلام کی پرکھ نہیں کی۔اقبال کا شاعرانہ نظام چونکہ پیچیدہ نہیں ہے اس لیے ان کا نظام افکار اسکالرشپ کے گھوڑے دوڑانے کی جولان گاہ بنا'۔کلام اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ اقبال کے بعض افکار وخیالات آج اپنی معنویت کھونے لگے ہیں اور بعض فرسودہ ہو چکے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ ان کے کلام میں فکر وفلسفے کی گہرائی یا فلسفیانہ خیالات کی کمی ہے، یہ سب تو اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن ہر نظم میں افکار کی بلندی اور فلسفیانہ خیالات کی تلاش بے معنی ہے۔ناقدین اقبال نے اقبال کے کلام کو جتنا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے یا اس کی جتنی توضیح وتشریح کی ہے اور فکر وفلسفے کو کھنگھالنے کی کوشش کی ہے، وارث علوی نے کلام اقبال کی روشنی میں ان ناقدین کے خیالات کو رد کیا ہے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں فکر وفلسفے کی گیرائی کی کمی ہے۔اقبال کے حوالے سے مذکورہ مضامین کی قرأت کرتے ہوئے آپ ضروری نہیں کہ وارث علوی کے خیالات سے اتفاق رکھیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ جن تنقیدی اصولوں اور متن کی روشنی میں کلامِ اقبال کو پرکھنے کی کوشش کی ہے آپ ان سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔شگفتہ تنقیدی اور طنزیہ اسلوب کی مثالیں اگر دیکھنی ہو تو وارث علوی کی تحریریں ضرور پڑھیں آپ لطف اندوز بھی ہوںگے اور تنقیدی بصیرت سے مالا مال بھی۔

کتاب میں شامل تیسرا، چوتھا اور پانچواں مضمون جوش ملیح آبادی کی نظمیہ شاعری سے متعلق ہے۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جوش کو شاعر انقلاب، شاعر شباب اور شاعر فطرت وغیرہ کہا جاتا ہے لیکن شاعر فطرت ہونے میں وہ اقبال، فیض اور فراق سے کم نظر آتے ہیں۔البتہ کچھ نظمیں ہیں جن میں مناظر فطرت کا بیان بہت ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے لیکن وہاں بھی خرابی یہ آگئی ہے کہ لفظوں کا بے جا استعمال بہت ہوا ہے۔ان نظموں میں خاموش تفکر، شیرینی تکلم اور نشاط وغم میں ڈوبا ہوا وہ تاثر بہت کم نظر آتا ہے جو فطرت کی شاعری کو رومانیت، سریت اور حسن آفرینی سے آشنا کرتی ہے۔وارث علوی کی اس بات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ اپنی شاعری میں جوش فطرت کے پرستار کم اور پجاری زیادہ نظر آتے ہیں۔'البیلی صبح' مناظر فطرت پر مبنی نظموں میں سے ایک ہے۔یہ نظم جوش کی بہترین نظم کہی جا سکتی ہے لیکن بقول وارث علوی 'اس میں عروس فطرت کا اتنا تام جھام ہے ''ہیرے کی کیل، گلابی شلوکا، سرخ اوڑھنی، پلو افشاں، رسیلی جھپکتی آنکھیں، نگار مہتاب، نشیلی نگاہ، نغمۂ طرب، حسین رنگ وبو، غزل خوانی، گنگناہٹ، جبین زلفیں، سہیلی، جھولا کا ایسا بیان ہے کہ صبح کی صباحت اور اس کا فطری حسن عروس فطرت کی اس آرائش میں کہیں چھپ گیا ہے۔'' اس طرح جہاں جوش کی نظموں میں یہ بات پائی جاتی ہے وہیں کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جو جوش کو اقبال کے ہم پلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔مثلاً خطابت، بلند آہنگی، شوکت الفاظ اور قدرت بیان یہ ایسے عناصر ہیں جو اقبال اور جوش میں قدرے مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ جوش کی شاعری اور شخصیت دونوں میں تضاد کا عنصر پایا جاتا ہے اس لیے بعض نقادوں نے انھیں تضادات کا شاعر بھی گردانا ہے۔ان کی نظمیہ شاعری کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی جوش کی شاعری میں تضاد کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ان کی شاعری میں تضاد کا پہلو دیکھنے کے لیے ان کے شعری مجموعہ 'فکر ونشاط' میں شامل دو نظموں 'خاتون مشرق' اور 'خاتون مغرب' کو دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ جوش کی شعری کائنات کے مزید پہلوؤں کا اندازہ آپ وارث علوی کے ان مضامین کو پڑھتے ہوئے کر سکتے ہیں۔

کتاب میں شامل ساتواں مضمون 'فراق گورکھپوری' ہے جس میں وارث علوی نے فراق کی نظمیہ شاعری کو اقبال، فیض اور جوش کی شاعری سے تقابل اور موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے اندر جو مماثلتیں ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے فراق کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ فراق کی نظمیہ شاعری کے نئے زاویوں کی تفہیم کے لیے اہم مضمون ہے۔ آٹھواں مضمون 'مختار صدیقی' کے عنوان سے ہے۔ اس میں یہ بیان کیا ہے کہ اردو کی نظمیہ شاعری میں مختار صدیقی کا کیا مقام ہے اور ان کی شاعری کس نوعیت کی ہے وہ کون سے عناصر ہیں جو اہم شاعر بنانے میں بڑا رول ادا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تنوع کا اندازہ ان کی متعدد نظموں مثلاً خیال درباری، رات کی بات، رسوائی، ایک تمثیل، قریۂ ویران، ایک نظم، اور 'برف باری کی ایک رات' وغیرہ کی قرأت سے لگایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ شاعروں کے علاوہ جن دیگر شاعروں کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ وارث علوی نے پیش کیا ہے ان میں مجید امجد، میراجی، ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، اختر الایمان، مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، محمد علوی، منیر نیازی، ندا فاضلی اور شہریار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپ اس کتاب کی ورق گردانی کرکے جہاں مذکورہ شعرا کی شعری کائنات سے واقفیت حاصل کریں گے وہیں وارث علوی کے تنقیدی افکار ونظریات سے بھی واقفیت حاصل کریں گے۔ اس تبصرے میں تمام شعرا کا تفصیلی احاطہ ممکن نہیں اس لیے صرف ان کے نام کا ذکر کیا گیا تاکہ آپ ان تک رسائی حاصل کرسکیں اور ان کے کلام کا براہ راست مطالعہ کرکے مذکورہ مضامین سے استفادہ کرسکیں۔ کتاب ہر اعتبار سے دیدہ زیب ہے، قیمت بھی مناسب ہے۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

تفہیمات و ترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237، قیمت: 130 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی

معاصر تنقیدی منظرنامے پر جو چند نام بہت اہم ہیں ان میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد بھی شامل ہیں۔ انھوں نے کسی خاص مکتب فکر یا ادبی گروہ سے وابستگی کے بجائے اپنی انتقادی صلاحیت اور اہم ادبی مباحث وموضوعات پر تنقیدی مطالعات کے حوالے سے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ ادب اسطور آفاق، اردو غزل کا عبوری دور، ادب اور جمالیات، مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس، فن تضمین نگاری ان کی اہم تنقیدی کتابیں ہیں۔ 'تفہیمات و ترجیحات' ان کے تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ ہے جس میں تقریباً 17 مضامین ہیں: حمد وثنا کی تقدیسی معنویت، قدیم ہندوستانی فلسفہ اور کالی داس کی تخلیقات میں ماحولیاتی اشارے، علامہ اقبال کی شاعری میں فطرت کی منظرکشی، بیسویں صدی میں خاکہ نگاری کی سمت ورفتار، عالمی بحران اور فیض احمد فیض کی معنویت، منٹو کے افسانوں میں جنس کی جمالیات، ہم عصر تنقیدی رویے، محمد حسن کا تنقیدی وژن، شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی بوطیقا، منٹو کے افسانوی اسلوب کا جمالیاتی پہلو، فلسفیانہ بصیرت اور عصری احساس کا شاعر: فرید پربتی، سیدہ جعفر اور فلسفیانہ تنقید، نور مجرو کا شاعر: فرید پربتی، عنبری رحمٰن کے افسانوں میں تانیثی حسیت، نثری نظم، فراغ روہوی بحیثیت دوہا نگار، شموئل احمد کا افسانہ 'ملوس کا گناہ' ایک تجزیہ — ان مضامین سے شیخ عقیل احمد کے مرتکز مطالعے اور گہرے تنقیدی شعور وادراک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان تنقیدی تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں نئے زاویوں کی جستجو کی گئی ہے اور تنوع کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ وہ موضوعات ان کے تنقیدی مطالعات کا محور بنے ہیں جو عصر حاضر میں بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ تفہیم وتجزیے میں بھی منطقی اور معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین سے جہاں فکر ونظر کے نئے دریچے کھلتے ہیں، وہیں تفہیم وتعبیر کے نئے در بھی وا ہوتے ہیں۔

شیخ عقیل احمد کی تنقید کی خاص بات یہ ہے کہ یہ کلیشے سے آزاد ہے۔ تکرار اور یکسانیت سے بھی گریز ہے۔ بوجھل، ثقیل، فلسفیانہ اصطلاحات کے استعمال سے بھی اجتناب برتا گیا ہے۔ مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاصر ادبی تحریکات اور رجحانات کے علاوہ عالمی ادبیات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ منٹو کے حوالے سے دونوں مضامین 'منٹو کے افسانوں میں جنس کی جمالیات' اور 'منٹو کے افسانوی اسلوب کا جمالیاتی پہلو' منٹو تنقید کے باب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ 'کالی داس کی تخلیقات میں ماحولیاتی اشارے' بھی اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے کہ آج کل ادب اور ماحولیات کے حوالے سے تنقیدی گفتگو کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ویدوں کے حوالے سے ماحولیاتی تحفظ پر روشنی ڈالی ہے اور کالی داس کے متن میں ماحولیات کے عناصر کو تلاش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ رامائن کے زمانے سے ہی ماحولیاتی شعور موجود تھا اور مہابھارت میں بھی ماحولیات کے اشارے ملتے ہیں۔ کالی داس کے یہاں بھی ماحولیات کے تئیں ایک حساس نظریہ ملتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ''اگر سنسکرت کے عظیم شاعر کالیداس کے بیان کردہ انسان اور فطرت کے مابین رشتے پر غور کیا جائے تو ماحولیاتی خطرات اور چیلنجز کم ہوسکتے ہیں۔'' آج کے عہد میں جب ماحولیاتی آلودگی اور کثافت ایک خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی ہے تو ادب کے حوالے سے اس طرح کے مضامین کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے 'اقبال کی شاعری میں فطرت کی منظرکشی' پر بھی گفتگو کی ہے اور ان کی کئی نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے بہت اہم بات لکھی ہے کہ ''مناظر فطرت کی منظرکشی کی اہمیت آج کے دور میں اور بھی بڑھتی جارہی ہے کیونکہ انسان کش ایٹمی ایجادات واختراعات کی وجہ سے ماحولیاتی توازن بگڑتا جارہا ہے جس سے کائنات کی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔'' تفہیمات و ترجیحات میں اساطیر، جمالیات اور اسالیب کے تعلق سے کئی اہم تحریریں ہیں جن میں شیخ عقیل احمد کی اعلیٰ تنقیدی بصیرت اور مطالعاتی وسعت کا عکس نظر آتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاعری

تازہ ہوا کی تابشیں

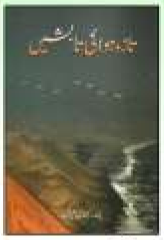

مصنف: چندر بھان خیال
صفحات:175، قیمت:114 روپے، سنہ اشاعت:2019
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر:عزیز پریہار، 15 سٹیل پارک،
پوسٹ راج گرونگر باریول روڈ، لدھیانہ۔141012 (پنجاب)

چندر بھان خیال ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کا گہرا تخلیقی شعور، شعری رموز ونکات سے عمیق آگہی، زبان وبیان پر غیر معمولی دسترس، الفاظ کا رکھ رکھاؤ، بیان کی پاکیزگی وتہہ داری، تاریخی شعور کی متانت وتنوع، تازگی وکشادگی ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ حال ہی میں شائع شدہ ان کا شعری مجموعہ 'تازہ ہوا کی تابشیں' اس کی روشن مثال ہے۔

متذکرہ مجموعے میں نظموں کی تعداد غزلوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ 17 غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ اور کھرا پن، عصری آگہی، فصاحت بہت واضح ہیں۔ فکر انگیز غزلیں/نظمیں یاد دلاتی ہیں کہ 'خیال' تخلص فراق صاحب نے تجویز فرمایا تھا جب چندر بھان نے اپنی نظم 'سمندر کا سکوت' فراق صاحب کو سنائی۔ فراق صاحب نظم سن کر کہنے لگے نظم خیال انگیز ہے، تم اپنا تخلص 'خیال' کیوں نہیں رکھ لیتے۔ یہ 1970 کی بات ہے جن دنوں چندر بھان چندر نے اپنا ادبی سفر شروع ہی کیا تھا۔ پچاس سال گزر گئے، شاعر کا ادبی سفر جاری وساری ہے۔ اپنے سفر کے دوران چندر بھان خیال نے شاعری کا سیکولر کردار، امتزاجی شعری نظام، بیانیہ قوت اور زندگی کے ہمہ گیر تصور کو سدا برقرار رکھا۔ تصورات و خیالات کی عضوی وحدت و ربط ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ وہ کبھی کسی ادبی وسماجی تحریک یا منشور سے وابستہ نہیں رہے۔ ان کا ذہن ایک کھلا ذہن ہے جس میں ذات بھی ہے، کائنات بھی۔ ان کے ذہن نے ہر نوع کے ادبی وسماجی اثر کو قبول کیا اور اپنے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔ وہ جتنے قدیم ہیں اتنے جدید بھی ہیں۔ تازہ کاری اور جدت پسندی ان کی شعری حسیت (Poetic sensibility) کا جزو لازم ہے۔

کیا بتائیں، کیا کہیں کیا رنگ ہے کیا نسل ہے   چھوڑ رہنے دو ابھی نام ونسب کی داستاں
رات آئی ہے تو وہ بھی آئے گا   بند اپنے گھر کا دروازہ نہ کر
خواب تو تعمیر کی بنیاد ہے   منتشر خوابوں کا شیرازہ نہ کر
سوچتا ہوں میں کہ سوچا جائے کیا   کیا نہ دیکھیں اور دیکھا جائے کیا
روشنی ہوتی تو کوئی بات تھی   اس اندھیرے گھر میں ڈھونڈا جائے کیا

غزل کا فن ریزہ خیالی نہیں بلکہ شعوری رو کی ایک منفرد، ارفع اور خلاقانہ مثال ہے۔ شعور ولاشعور میں کارفرما فکری عوامل وعناصر غزل میں ایک منظم اظہار کے سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

اصل معبود تو موجود ہے سب کے ہمراہ   جو نہیں ہے اسے کیوں آپ خدا کہتے ہیں
لفظ ایسا مجھے بھی دے یارب   تیرہ شب کی اذان ہو جائے
کیا ہی اچھا ہو صرف خاموشی   آدمی کی زبان ہو جائے

کتاب کے دیباچے میں حقانی القاسمی نے چندر بھان خیال کی شاعری کے تعلق سے اہم اور بلیغ اشارے کیے ہیں اور ان تصورات کی نشاندہی کی ہے جو شاعر کے جہانِ معنی میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ شاعر کا احتجاجی ومزاحمتی مزاج، شب وروز کے تجربات کا شعری اظہار، اجتماعی شعور کی عکاسی، کسی مخصوص نظریے کی وکالت سے گریز، انسانی حقوق کی پاسداری — ایسی شاعری جس میں اثبات بھی ہے نفی بھی۔

دین جینے کے لیے ہے کہ حفاظت دین کی   ڈھونڈ مت سازش گروں میں دین کا ساماں تُو
تیرا استحصال کرنا چاہتا ہے اک جہاں   کھول آنکھیں، دیکھ دُنیا اور سینہ تان تُو
(ایک غزل اپنے لیے)

جب اسی دنیا میں رہنا ہے تو پھر   جانے کیوں دنیا سے ڈر جاتے ہیں لوگ
کر رہے ہیں زمیں کو بے چہرہ   آگ، گرد و غبار اور دنیا
کیسے پائیں سکونِ قلب و نظر   رنج و غم بے شمار اور دنیا

پابند اور آزاد نظم نگاری پر شاعر کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ جدت طرازی ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس مجموعے میں شامل نظمیں اس اعتبار سے معنی خیز ہیں کہ وہ ہر طرح کی تفریق کی نفی کرتی ہیں۔ یہ غیر منشوری نظمیں انسان دوستی، پیار اور محبت کا پیغام لیے ایک نئے ذہنی وفکری انقلاب کی دعوت دیتی ہیں۔

سبھی کا خالق، سبھی کا مالک   سبھی کا معبود اک خدا ہے
الگ الگ راستے ہیں لیکن   مقام مقصود اک خدا ہے
تمام جہد و عمل کا حاصل   نئی مسافت کی ابتدا ہے
(مجبوراہو)

بازار، جنگل، چہرہ، شہر، ساحل، آسمان جیسے قوی استعارے ایک وسیع شعری کینوس تشکیل دیتے ہیں۔ استعاراتی زبان نظموں کو گہرائی اور گیرائی عطا کرتی ہے۔ ایمائیت اور تہہ داری، جذبات کی شدت، ارتقا پذیر سوچ، فنی لوازمات کا لحاظ، پختہ لہجہ، بیان کی تازہ کاری ان تخلیقات کے بہت نمایاں اوصاف ہیں۔ انسانی وجود کے تضاد (Paradox) کو شاعر نے Epic-image دیا ہے اس کی مثال عصری اردو شاعری میں بہت کم دیکھنے کو ملے گی۔

میں نے ہر انداز سے سمجھا ہے سارے شہر کو
شہر جو خوابوں کے جنگل کے سوا کچھ بھی نہیں

تصورات کی شاعری کا اپنا سنگیت ہے، اپنا سندیش ہے۔ 'تازہ ہوا کی تابشیں' کے مطالعے نے علامہ اقبال کے اس شعر کی یاد تازہ کردی۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو   جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

'لولاک' کے شاعر چندر بھان خیال زندگی اور انسانی تاریخ کا ایک روحانی، مابعد الطبیعیاتی، ارضی، آفاقی تصور پیش کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل 14 بے چہرہ نظمیں انسانی ارتقا کا ایک انوکھا دستاویز ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ واقعی آدم دور (Primitive Age) سے گزر رہا ہے۔ سب کچھ گزر جانے کے بعد انسان پر بالآخر روشن ہوا۔

پھر بھی جاری تھا رگوں میں زندہ رہنے کا جنوں
تھا شبِ تاریک پر طاری اجالوں کا فسوں!

اپنی طبیعت کا ہے الگ موسم

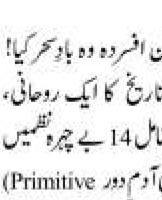

شاعر: ڈاکٹر رونق شہری
صفحات:152، قیمت:150 روپے
ناشر:ارم پبلشنگ ہاؤس دریاپور پٹنہ 4
مبصر:سعید اختر اعظمی، نزد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی)

افکار واحساسات کی اپنی الگ دنیا ہے۔ اول الذکر کے لیے کوئی حد فاصل طے

نہیں، جبکہ ثانی الذکر حقیقی و غیر حقیقی دنیا میں منقسم ہے۔ایک میں شعوری کارفرمائی ہے تو دوسرے میں تشبیہات و استعارات کے سہارے سے حسن پیدا کیا جاتا ہے۔سخنور دونوں سے کسب فیض کر کے اپنی تخلیق کی آبیاری کرتا ہے۔روایت اسے ایک سمت نو عطا کرتی ہے جس سے وہ از خود راہ بناتا چلا جاتا ہے۔ڈاکٹر رونق شہری نے طویل فنی ریاضت سے اپنے فکر و فن کے رخ انور کو غازہ بخشا ہے۔اسی لیے ان کی سخنوری اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر رونق شہری (عبدالغفار خاں) نے کالی دھرتی کی غزلیں، سبز آتش، آسمان پر دستخط اور سخن سرمایہ کے ذریعہ اپنی پہچان قائم کر لی ہے۔تازہ کار'اپنی طبیعت کا ہے الگ موسم'ان کے عمیق مشاہدے اور شعری برجستگی کا بین ثبوت ہے۔یہ اشعار دیکھیے۔

چراغ چشم حفاظت سے گھر چلا آئے　　نگاہیں بجھ گئیں ماں کی تو رستہ دیکھنے میں
طلوع چہرے کا وہ چاند جانے کب ہو جائے　　کسی کا جاگنا بھی رات بھر ضروری ہے
کسی کا دیکھنا رستہ چراغ جلنے تک　　طویل مرحلۂ انتظار ہو جانا
مجھے کشادگی رزق پہ بھروسہ ہے　　نگاہ آسماں پہ روز ڈالتا بھی ہوں
اجڑتی نیند کے آنکھوں سے بہہ گئے رشتے　　اُن ہی کو سوچ کے بیدار ہوتے رہتے ہیں

ان میں سے پہلے شعر میں'چراغ چشم کا حفاظت سے گھر آنا'کے مقابل'رستہ دیکھنے میں نگاہوں کا بجھنا'دو متضاد رخ ہیں۔اس کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔دراصل راہ دیکھتے دیکھتے یعنی انتظار کرتے کرتے آنکھوں کے دیے بجھنے لگے ہیں، وقت کے پلوں تلے کتنا پانی بہہ گیا پتہ نہیں، پھر بھی ماں کا انتظار قائم و دائم ہے۔دوسرے شعر میں'رخ روشن اور طلوع ماہتاب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔یہاں دونوں کی دید کے لیے بیداری کو شرط اولیں قرار دیا گیا ہے۔تیسرے شعر میں انتظار کی حدود و قیود کا تعین کیا گیا ہے کہ یہ چراغ کے جلنے تک ہے۔اس کے بعد یہ دیا خود ہی اس کی رہنمائی کرے گا۔چوتھے شعر میں خالق و مخلوق کا ارتباط سامنے آتا ہے۔آسمان جو اردو شاعری میں بلاؤں کا استعارہ ہے اسے رزق کے نزول کا واحد راستہ بتلایا گیا ہے۔'بارش رحمت اور فیضان ربانی یہیں سے ہوتا ہے۔پانچویں شعر میں بظاہر یکساں مگر متضاد چیزوں کو دو مصرعوں میں کامیابی سے سمویا گیا ہے۔اجڑتی نیند اور بیداری، پہلی گئی تو آنکھوں سے جڑے خواب کے رشتے کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔جب خواب نہیں تو ہر سو عالم بیداری ہے، اور یہ لاحاصل ہے کیونکہ خواب یا ہدف کے بغیر جینے کا کوئی مقصد نہیں رہا۔

اسی سلسلۂ تفہیم شعر کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے۔

پھول کھلانا ویسے بھی آسان نہیں　　گملے میں مصنوعی پودا ڈال دیا
اُگی ہے آنکھ میں خودرو مسرت　　چمکتا ہے ستارہ چاہنے سے
ہے وقت مسجد جاں میں اذان ہونے کا　　حضور آپ تو بازار سے نکل رہے ہیں
پھر لے گئیں شہزادے کو کچھ نیند کی پریاں　　پیشانی پہ رکھتے ہوئے کچھ دیر جلے ہاتھ

یہاں بیت اول میں فریب کا نیا زاویہ ہے تو بیت ثانی میں اندرون سے پھوٹنے والی خوشی کو ستارہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔بیت ثالث میں ضمیر کی بیداری اور اس سے انحراف ہے جبکہ بیت رابع میں ممتا کی مشکلات اور اولاد کی راحت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

غزل کائنات سے آگے بڑھ کر نظم کائنات میں چلیں، اس گوشے میں 51 متنوع آزاد نظمیں قاری کے روبرو ہیں۔ایک نظم'ریت کی گھڑی'ملاحظہ ہو۔

بچے بالو پر ریت گھڑی بناتے ہیں/ منٹ کا کانٹا رکتا ہے/ سیکنڈ کا کانٹا رکتا نہیں ہے
وقت ساڑھے دس پہ متعین ہے/ یہی اسکول کے بچوں کا بچپن ہے

یوں'اپنی طبیعت کا ہے الگ موسم'نئی زمین نئے موضوع کی تلاش کی جانب سفر ہے جو جاری ہے۔

منتظر کوئی ہے مضمون غزل میں اب تک　　میرے سرمایۂ املاک میں آنے کے لیے

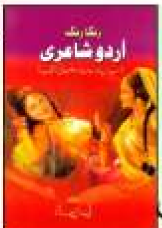

رنگارنگ اردو شاعری

مرتب: ٹی این راز
صفحات: 239، قیمت: 250 روپے، سن اشاعت: 2020
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، E-29 فرسٹ فلور، شاہین باغ، لین نمبر 6، نئی دہلی

غزل انسانی جذبات و احساسات کا ایسا خوبصورت مرقع ہے جو اردو ادب کی شان ہی نہیں بلکہ تمام اصناف سخن سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔اس کے ہر شعر کے ذریعے کسی شاعر کے تخیل، جذبہ کی تپش، اسلوب کی دلآویزی اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی فنکارانہ مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔کسی بھی زبان و ادب کا بہترین سرمایہ اس کی شاعری کو مانا گیا ہے۔

شاعری روح ادب مانی گئی　　اور غزل روح ادب کی آبرو

زیر تبصرہ کتاب'رنگارنگ اردو شاعری' ایک سدا بہار موضوعاتی انتخاب ہے۔جناب ٹی این راز نے اردو کی غزلیہ شاعری سے مختلف عنوانات کے تحت اشعار جمع کیے ہیں جو زندگی کے گوناگوں معاملات و مسائل کے ترجمان ہیں۔ تقریباً 63 موضوعات کو انھوں نے اس میں شامل کیا ہے جن میں اردو، جنت جہنم، ماں، بچے، آدمیت، زندگی، موت، شہر، گاؤں، سیاست، مفلسی، غریبی، قتل، انصاف، گواہی، عشق و محبت، ہجر و وصال، انتظار، انگڑائی، وفا، یاد، دل، نقاب، آنکھیں، زلف جیسے موضوعات بھی ہیں۔ان پر اکثر لوگوں کو اشعار کی تلاش رہتی ہے اور اس کے لیے انھیں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ٹی این راز نے شاعری کے عاشقوں کے لیے ان تمام دقتوں کو دور کر دیا ہے۔اس طرح کے انتخابات اردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں۔اس لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔کچھ موضوعات تو ایسے ہیں جن پر شاعری کے ذریعے لوگ اپنے جذبات و احساسات کا خوبصورتی سے اظہار کر سکتے ہیں۔ان موضوعات پر بھی اس انتخاب میں شاعری مل جاتی ہے۔اردو کے تعلق سے اکثر حضرات اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ راجندر ناتھ رہبر کا ایک شعر ہے۔

ابھی نہ گلشن اردو کو بے چراغ کہو　　کھلے ہوئے ہیں ابھی چند پھول شاخوں پر

فضا ابن فیضی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اسی کے دم سے ہے تہذیب کا سفر جاری　　قدم قدم پہ جو اردو زبان راہ پر ہے

دیکھیے جسٹس آنند نرائن ملا کا کتنا خوبصورت شعر ہے۔

ملا بنا دیا ہے اسے بھی محاذ جنگ　　اک صلح کا پیام تھی اردو زبان بھی

ناظم جعفری نے اردو کے تعلق سے کتنی خوبصورت بات کہی ہے۔

ہمارے عہد نے تہذیب چھین لی ہم سے　　یہ معجزہ ہے کہ اردو زبان باقی ہے

اس طرح دیگر سماجی اور سیاسی موضوعات پر بہت اچھی شاعری کا انھوں نے انتخاب کیا ہے اور یقیناً یہ اپنی طرز کا بہت عمدہ کام ہے۔

حقانی القاسمی نے'دو باتیں'کے عنوان سے اس انتخاب پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

"اردو میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھیں لوگ اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ اردو میں موضوعاتی شاعری کا کوئی جامع اور عمدہ انتخاب نہیں تھا جس کی وجہ سے اشعار کی تلاش میں لوگوں کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ادھر چند برسوں میں اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے اور موضوعاتی شاعری کے کچھ انتخاب سامنے آئے ہیں جن میں مختلف عنوانات کے تحت اشعار کا عمدہ انتخاب پیش کیا گیا ہے۔گلدستہ در گلدستہ کے عنوان سے چار جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی اور وسیم اقبال کی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں تقریباً تین سو عنوانات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس کے

علاوہ ریختہ کی سائٹ پر بھی موضوعاتی انتخاب موجود ہے، تاہم بہت سے عمدہ عنوانات جن پر اشعار ابھی بھی نہیں مل پائے ہیں۔ ٹی این راز نے اسی سمت پیش قدمی کی اور رنگارنگ اردو شاعری کے عنوان سے ایک بہت عمدہ انتخاب ہندی اور پنجابی میں پیش کیا جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہندی اور پنجابی میں یہ انتخاب بہت ہی مقبول ہوا۔''

ترلوک ناتھ کا مبوج (ٹی این راز) اردو کے سچے عاشق ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غالب کو پنجابی زبان میں متعارف کرایا۔ غالب سے انھیں جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ 'غالب جیون شاعری' ان کی اہم کتاب ہے جو ہندی اور پنجابی میں شائع ہوئی ہے۔ 'غالب اور درگت' ان کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ہندو پاک کی بہترین طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا انتخاب بھی انھوں نے ہندی- پنجابی میں شائع کیا ہے۔ احمد فراز پر، پروین شاکر، ناصر کاظمی، ساحر لدھیانوی، ندا فاضلی اور منور رانا کے منتخب کلام کو ہندی و پنجابی کا پیرہن عطا کیا ہے۔ انھوں نے اردو کی شاعری کو پنجابی حلقے میں متعارف کرانے کی جو کوشش کی ہے اس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ امید کی جاتی ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

تحقیق و تنقید

بہار کے معاصر افسانہ نگار

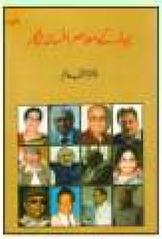

مرتب: ڈاکٹر آفتاب عالم

صفحات: 332، قیمت: 201 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر خان محمد آصف

شعبۂ اردو، گوتم بدھ یونیورسٹی، گوتم بدھ نگر، گریٹر نوئیڈا۔ 201310

'بہار کے معاصر افسانہ نگار' میں فاضل مرتب ڈاکٹر آفتاب احمد نے بہار کے تیرہ معاصر افسانہ نگاروں کے افسانے اور ان پر برصغیر کے جید ناقدین کے مضامین شامل کیے ہیں۔ موصوف نے تین سو بتیس صفحات کی کتاب پر بمشکل تین صفحے کا مقدمہ لکھا ہے۔

کتاب میں پہلا افسانہ ذکیہ مشہدی کا 'ڈے کیئر' ہے۔ یہ افسانہ کینسر جیسے موذی اور لاعلاج مرض کا اظہاریہ ہے۔ 'صدائے بازگشت' ذکیہ کے تیرہ طویل ومختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جس پر علی احمد فاطمی نے اپنے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ اپنے اندر عظمت رفتہ کی صدائیں لیے ہوئے ہے جس میں ماضی سے لے کر آج تک کا انسان سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ شفیع جاوید کا افسانہ 'بادبان کے ٹکڑے' اپنے اندر غزلیہ شاعری کا لفظی ٹچ لیے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کی تراکیب کلاسیکی غزل سے میل کھاتی محسوس ہوتی ہیں۔ افسانہ 'بادبان کے ٹکڑے' خواب اور بے خوابی کا شاہد ہے، خواب ایک لاشعوری کیفیت ہے اور اسی کیفیت میں لاشعور میں بسی ہوئی حقیقتیں آتی ہیں اور انھیں حقیقتوں سے بے خوابی کہانیاں چنتی ہے۔ ان کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون 'گئے دنوں کے چراغ: شفیع جاوید کے افسانے' شامل کیا گیا ہے۔ عبدالصمد کا افسانہ 'لمس' جنسی جبلت کا حسی انکشاف ہے جس میں راوی اپنے ٹیوٹر کے لمس سے حظ کشید کرتی ہے جس سے اس کا باکرہ بدن سہرن محسوس کرتا ہے اور راوی اس موہوم لمس کی گمشدگی پر سرور وشرمندگی کے احساس سے عاری ہے۔ ڈاکٹر صبوحی اسلم کا مضمون 'عبدالصمد کے افسانے' ان کی تخلیقیت کے سیاسی وسماجی موضوعات سے بحث کرتا ہے۔ شوکت حیات کے افسانہ 'گنبد کے کبوتر' میں تین کہانیاں ایک ساتھ چل رہی ہیں سین دا، مس ریزہ اور راوی۔ گنبد، کبوتر اور ہجرت کو افسانہ نگار نے اقلیت کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

جبکہ افسانے میں کہیں بھی مسلمان یا اقلیت کا ذکر نہیں ہے۔ حامدی کاشمیری نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کی افسانویت: ایک تجزیہ' میں لکھا ہے کہ شوکت کا کسی ازم اور واد سے کوئی تعلق نہیں۔ حسین الحق کا افسانہ 'نیو کی اینٹ' ہے جس میں ہندستان کی ہزار سالہ گنگا جمنی تہذیب کی اساس اور علامت کو اتحاد اور یکجہتی کے دشمنوں نے پل جھپکتے تاراج کر دیا۔

وہاب اشرفی مضمون 'عالمی زہراب اور حسین الحق کے افسانے' میں لکھتے ہیں کہ حسین الحق کے افسانے انسان کی حرماں نصیبی کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ جو آج کے انسان کی پیچیدہ اور متضاد سرشت کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ شموئل احمد کا افسانہ 'سنگھاردان' منٹو کے افسانے موذیل کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ موذیل کی پڑھت ہیجانی کیفیت کو انگیخت نہیں کرتی جب کہ سنگھاردان کا جنسی بیان جسم میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔ دونوں افسانے کا موضوع فساد ہے لیکن سنگھاردان کا موضوع ورثہ سے محرومی کی ٹریجڈی ہے۔ جواں سال فکشن ناقد غالب نشتر کا مضمون 'شموئل احمد کا جہان فکشن' لائق توجہ ہے انھوں نے بڑی عرق ریزی سے شموئل احمد کے افسانوں کا موضوعی تجزیہ کیا ہے۔ مشتاق احمد نوری کا افسانہ 'جن کی سواری' ہندستان کے دیہی علاقوں میں ایک عام سا واقعہ ہے۔ جسے افسانہ نگار نے اپنے تخلیقی تحیر سے فسانہ بنا دیا۔ اگر وہ چاہتے تو اس افسانے کے ذریعے دیہات کی توہم پرستی سے پردہ اٹھا سکتے تھے اور اس افسانے کو اطلاقی نفسیات میں ضم کر کے ہسٹریا اور شیزوفرینیا جیسی نو بیاہتا اور بن بیاہی لڑکیوں کی تحلیل نفسی کرتے۔ جو ایک زمانے سے بلوغت کو پہنچنے والی لڑکیوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اختتام تک آتے آتے افسانہ اپنا موضوعی ڈائمنشن بدل کر دوسری سمت چل دیتا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان بظاہر جیسا ہوتا ہے حقیقت میں اس کا الٹ ہوتا ہے۔ 'مشتاق احمد نوری ایک البیلا فنکار' میں مضمون نگار ڈاکٹر مشتاق احمد نے 'نوری' کے کتھا نگر کی یاترا بڑی خوبی سے کی ہے۔ شفیع مشہدی کا افسانہ 'بنت زلیخا' میں افسانہ نگار نے عورت کے استعارے کے طور پر بنت حوا، بنت مریم اور یشودھ کا ذکر نہیں کیا، بلکہ بنت زلیخا کو تلمیح کے طور پر استعمال کیا جس کے ڈانڈے کنواں، کنعاں اور مصر کے بازاروں سے لے کر شاہی محلات کی تعفن زدہ باڑی سے ملتے ہیں۔ ان پر احمد صغیر نے مضمون تحریر کیا ہے۔ قمر جہاں کا افسانہ 'کٹی پتنگ' بچوں کے ذہنی ونفسیاتی کرب کا عمدہ بیانیہ ہے۔ جو چھوٹی عمر میں بڑے صاحب کے زر خرید غلام بن جاتے ہیں۔ جن کی آزادی پتنگ کی طرح ہوتی ہے۔ جو نیلگوں آسمان میں آزاد تو ہوتے ہیں مگر ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ افسانے کا دوسرا پہلو سماج کی غربت اور گرسنگی کو درشاتا ہے۔ کلوا اپنے آپ کو خدا کی طرف سے دھتکارا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ماں بھکمری سے مر گئی اور باپ اسے صاحب کو بیچ کر چلا گیا جسے خون کی بو بھی نہیں تڑپاتی۔ ڈاکٹر شبنم افروز نے ''قمر جہاں کے تخلیقی جہاں'' میں ان کے افسانوی موضوعات سے بحث کی ہے جس کی روشنی میں ان کی تخلیقات کا مقام متعین کیا جا سکے۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ 'واپس لوٹتے ہوئے' سائبر سماج میں بنتے رشتوں پر ہے۔ ان پر شہزاد انجم کا مضمون 'مشرف عالم ذوقی کی افسانہ نگاری' شامل ہے۔

سید احمد قادری کے افسانہ 'ملبہ' میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حملے اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ تباہیوں کی ہلکی سی جھلک ہے۔ پروفیسر محفوظ الحسن نے ان کے افسانوں کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ احمد صغیر کا افسانہ 'گھر واپسی' کے بعد کے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال واجد کا مضمون 'احمد صغیر کی افسانہ نگاری' مضمون نگار کے مطالعہ اور ژرف بینی کا شاہد ہے۔ صغیر رحمانی کا افسانہ 'پہلا گناہ' کا موضوع طوائف ہے جس کی بنت اور کرافٹ عمدہ ہے۔ مضمون کی فرسودگی افسانہ کی روئیدگی پر بار نہیں ہے۔ پہلا گناہ کا کلائمس کچھ ایسا ہے۔ جیسے سمرسٹ ماہم اپنے بیگ سے بلا نکال رہا ہے۔ ان کے افسانوں کے

حوالے سے محمد حمید شاہد نے بہت وقیع مضمون تحریر کیا ہے۔

بہار کے معاصر افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب موضوعاتی اور ہیئتی دونوں اعتبار سے اچھا ہے۔ افسانہ نگاروں پر فاضل اور معتبر ناقدین کے تجزیاتی مضامین قابل ستائش ہیں۔

مسلمان سائنسدانوں کی خدمات

مصنف: عبدالودود انصاری

قیمت: 104 روپے

ناشر: رضی پبلی کیشنز

مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی، مولانا آزاد اکیڈمی

N-80C ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی

آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرہویں، چودھویں صدی عیسوی تک سائنسی علوم فنون کی تحقیق وتلاش کے باب میں مسلم سائنسدانوں اور اطبائے اسلام نے پوری دنیا کی قیادت وسیادت اور سائنسی وطبی رہنمائی کی ہے، جبکہ پورا یورپ 'قرون مظلمہ' میں تھا اور تاریک دور سے گزر رہا تھا۔

محمد بن زکریا رازی کی 'کتاب الحاوی' (جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے) ابوالنصر فارابی کی 'احصاء العلوم'، محمد بن خوارزمی کی 'الجبر والمقابلہ'، ابوعبداللہ محمد بن ادریس کی 'نزہت المشتاق' (جو تاریخ میں کتاب الروجر کے نام سے مشہور ہے) ابوالفتح عمر بن ابراہیم الخیام کی 'الجبر والمقابلہ' اور 'رسائل عمر خیام' ابن رشد کی 'الکلیات فی الطب' ابوالقاسم زہراوی کی 'التصریف'، جابر بن حیان کی 'الکیمیا' اور 'المیزان' ابن بیطار کی 'جامع الادویۃ والاغذیۃ' ابوریحان محمد البیرونی کی 'الجماہر فی معرفت الجواہر' اور 'الصیدلہ'، شیخ ابوعلی الحسنین سینا کی 'القانون فی الطب' اور ابوعلی الحسن بن الہیثم کی 'المناظر' امریکہ اور یورپ کی جامعات اور دانشگاہوں میں 605 سال تک پڑھائی جاتی رہی ہیں اور ان میں سے اکثر کتابیں بائبل کے درجے میں سمجھی جاتی رہی ہیں اور مذکورہ بالا مسلم سائنسدانوں اور اطبا کے مجسمے آج بھی امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں نظر آتے ہیں اور اپنی عظمت رفتہ کی کہانی سناتے ہوئے ملتے ہیں اور 'فردوس گمشدہ' 'اندلس وقرطبہ' کی یاد دلاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں عرب وعجم کے مسلم سائنسدانوں اور طبیبوں کی سائنسی وطبی تحقیقات، اکتشافات اور تجربات ومشاہدات کا جامع تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی ایجادات اور ان کے طریقہائے علاج ومعالجہ پر بھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جدید دور کی طرح قدیم دور میں بھی اعضا کی پیوندکاری کی جاتی رہی ہے۔ محمد بن زکریا رازی اس طریقۂ جراحت کے موجد وامام تھے۔ انھوں نے گردے اور مثانے کی پتھری کے علاج کا طریقہ بھی بتایا ہے اور چیچک اور خسرہ میں فرق بھی واضح کیا ہے اور ان کی علامتوں پر بھی ماہرانہ بحث کی ہے۔

اس کتاب میں نورالدین جہانگیر بادشاہ کو ایک ماہر طیور کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس کی معرکۃ الآرا کتاب 'تزک جہانگیری' میں بہت سے جانوروں کی خصوصیات پر بحث ملتی ہے۔ اس کے دربار میں امام وردی جیسا ماہر پرندہ بھی تھا، ایک دفعہ امام وردی نے ایک تیتر کو پکڑا، جس کا نر و مادہ ہونا معلوم نہ ہو سکا تھا، وردی کی معلومات کے مطابق جس تیتر کے پیروں پر بہت سارے کانٹے ہوں وہ نر ہوتا ہے۔ لیکن مادے تیتر کے پیروں پر کانٹے ہوتے ہی نہیں، اتفاق سے وردی کے ہاتھ میں جو تیتر تھا، اس کے صرف ایک پیر میں کانٹا تھا، اب امام وردی تیتر کی جنس پہچاننے میں ناکام ہو گیا۔ بادشاہ کی طرف رجوع کیا۔ بادشاہ نے مادہ ہونے کہی اور جب اس کو ذبح کیا گیا تو واقعی اس کے پیٹ سے انڈے نکلے، کسی نے بادشاہ سے پوچھا، بادشاہ سلامت نے کیسے پہچان لیا تو جہانگیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جب تھے اس کے پیروں پر ایک ہی کانٹا نظر آیا تو میں نے اس کی چونچ دیکھی، جو بہت چھوٹی تھی، جس کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مادہ ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، ڈاکٹر سالم علی اور نوبل ایوارڈ یافتہ سائنسداں عبدالسلام کی سائنسی تحقیقات اور خدمات پر بھی بہت بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف جناب عبدالودود انصاری لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بچوں کی عمر اور ان کی نفسیات وجذبات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کتاب تصنیف کی ہے جس کی زبان عام فہم اور سادہ وشگفتہ ہے۔

امید ہے کہ علمی وسائنسی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

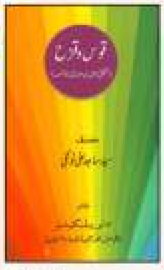

قوس وقزح

مصنف: سید ساجد علی ٹونکی

صفحات: 112، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: علی پبلی کیشنز، ٹونک، راجستھان

مبصر: حمیرا خاتون، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'قوس وقزح' راجستھان کی مشہور ادبی شخصیت سید ساجد علی ٹونکی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ساجد علی ٹونکی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ راجستھان میں اردو زبان کے حوالے سے انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

کتاب میں سولہ مضامین ہیں جن میں اردو تنقید اور تنقید کے مختلف دبستان، تجزیاتی تحقیق وتنقید، تحقیق میں ادوار کا تعین اور مخطوطہ شناسی کے علاوہ مختلف شخصیات کی علمی و ادبی خدمات پر تنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین تنقید وتحقیق کے حوالے سے اہم ودلچسپ ہیں۔ تنقید کی ابتداء اور مختلف تنقیدی دبستان کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے ایک مضمون بعنوان اردو کی جائے پیدائش کہاں؟ ایک اہم مضمون ہے جس میں تاریخی حوالوں کے ساتھ مدلل طریقے سے اردو زبان کی ابتدائی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ مختصر طور پر مصنف کا ماننا ہے کہ زبان کا ارتقاء ہوتا ہے پیدائش نہیں۔ کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے کہ زبان کبھی مرتی نہیں ہے بلکہ وقت وحالات کے ساتھ رد وبدل قبول کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ کیونکہ ارتقا مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے۔ اگلا مضمون تحقیق میں ادوار کا تعین اور مخطوطہ شناسی ہے جس میں مخطوطہ شناسی کے فن اور عمل پر بہت اہم معلومات دی گئی ہیں جن سے تحقیق نگاری میں مخطوطہ شناسی کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔ مخطوطہ شناسی تحقیق کے لیے کتنی کارآمد ہے اور تحقیق نگاروں نے کس طرح اس فن سے فائدہ اٹھا کر قابل قدر تحقیقی کام انجام دیے ہیں مصنف نے مثالوں کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تحقیق کے ضمن میں ایک اور اہم مضمون اردو کے محقق پروفیسر محمود خاں شیرانی (تحقیق وتنقید کا ایک روشن مینار) کے عنوان سے شامل ہے جس میں ان کی علمی وادبی خدمات پر بات کی گئی ہے۔ اسی طرح مولانا سید زبیر علی افریقی کی علمی وادبی خدمات پر بھی مضمون شامل کیا گیا ہے، جو یقیناً قاری کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب میں ٹونک کے مختلف قلم کار، ادیب وشاعر پر بھی مضامین قلم

بند کیے گئے ہیں۔ صائب ٹونکی ہندوستانی زبان کا علم بردار شاعر، ٹونک کی نمائندہ شاعرہ محترمہ عذرا نکہت، ٹونک کے مشہور صحافی اور طنز و مزاح نگار ڈاکٹر آزاد قاسمی، نواب میر خاں ایک عظیم رہنما اور مجاہد آزادی جیسے اہم مضامین اس لیے بھی قابل قدر ہیں کہ انھیں پڑھ کر ٹونک میں اردو زبان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، مختصراً ہی سہی مگر اردو زبان کے حوالے سے کی جا رہی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کی صورت حال اور اس کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں پر مصنف کا ایک مضمون بعنوان 'اردو کی ترقی اور اس کے فروغ میں حائل مشکلات' بھی قابل غور ہے۔ اس مضمون میں مدارس، کالج، یونیورسٹیاں، سرکاری ادارے، اردو شعبوں میں اردو زبان کے حوالے سے کی جانے والی کاوشوں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ حالات حاضرہ میں اردو زبان کی ترقی و فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہر اردو جاننے والا لگن اور محنت کے ساتھ جڑ جائے۔ یہ مضمون قاری کو اردو زبان کی خدمت کرنے کا جذبہ بھی عطا کرتا ہے۔

مصنف نے ہندوستان میں قومی تعلیمی پالیسی اور ہمہ گیر خواندگی مہم پر بھی مضامین لکھ کر اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جس میں راجستھان میں ہمہ گیر خواندگی مہم کے حوالے سے مدرسہ پیرا ٹیچر اور راجستھان مدرسہ بورڈ کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہمہ گیر خواندگی مہم کا معیار بطور رپورٹ پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے ادویاتی نباتات کے عنوان سے بھی ایک مضمون قلم بند کیا ہے، جو ان پیڑ پودوں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتا ہے، جن سے یونانی، آیورویدک اور ایلوپیتھک دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی مضمون میں قدیم یونانی، عرب اور ایرانی اطبا اور ان کی طبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے ایک مختصر کتاب میں علوم و فنون کا خزانہ پیش کر دیا ہے جس میں قاری کو دلچسپی کا سامان میسر ہو جاتا ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ و سہل ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ مصنف نے اس بات کا خوب خیال رکھا ہے کہ کتاب کی زبان اتنی سادہ ہو کہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ ساتھ ہی فنی لوازمات کا اہتمام بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نہ صرف تنقید و تحقیق میں دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے یہ کتاب بے حد اہم ہے بلکہ اردو زبان سے محبت کرنے والے ہر شخص کے لیے بھی کافی مفید ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب قاری کے علم میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ رنگ برنگے موضوعات پر سوچنے اور قلم اٹھانے کی طرف گامزن کرے گی۔

فکشن

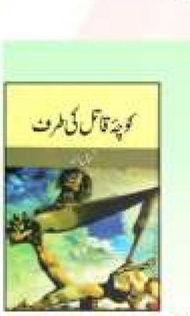

کوچۂ قاتل کی طرف

مصنف: شموئل احمد

صفحات: 184 قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: رضوان خان، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'کوچۂ قاتل کی طرف' شموئل احمد کا افسانوی مجموعہ ہے، جو 2019 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں کل بارہ کہانیاں شامل ہیں۔ شموئل احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، یہ اردو ہندی دونوں ہی زبانوں میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نثر میں بھی یہ کسی ایک صنف تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے مختلف صنفوں مثلاً ڈراما، افسانہ، ناول اور تخلیقی و تنقیدی مضامین کے ساتھ تراجم میں بھی دست آزمائی کی ہے۔

انھوں نے اپنے اس مجموعے کے تمام افسانے کو اس روانی اور ربط کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ مرکزی کردار سے لے کر ذیلی کردار تک ایک دوسرے سے مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کرداروں میں کشمکش و تصادم کی کیفیت کو بھی قائم رکھا گیا ہے تاکہ قاری تجسس کے ساتھ ہر افسانہ پڑھتا چلا جائے۔ ان افسانوں میں حقیقت پسندی پر زور دیا گیا ہے اور تمام افسانے عصر حاضر کے مسائل پر مبنی ہے۔ شموئل احمد نے ملک میں گرتی ہوئی اخلاقی، تہذیبی اور تمدنی اقدار کے ساتھ رشتوں کی اہمیت کو ان افسانوں میں درشایا ہے۔ دقیانوسی خیالات پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ قدیم زمانے میں لوگ لاعلم تھے لیکن افسوس کہ سماج کی کچھ برائیاں آج تک دیمک کی طرح ہمارے سماج کو کھوکھلا کرتی آ رہی ہیں۔

شموئل احمد کے افسانوں کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں عصر نو میں پنپنے والی وباؤں، سماج کی پیدا کردہ لعنتوں، مشینی تہذیب کی یلغار اور اس کے مضر اثرات، مغربی تمدن کی پیروی، مشرقی اقدار و روایات کا زوال، نئی پرانی تہذیب کا باہمی تصادم، مذہبی رسوم سے اشتراک و افتراق، معاشی الجھنیں غرض کہ عصری زندگی کے گوناگوں مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ ہر فنکار کسی نہ کسی مخصوص ویژن، تخلیقی صلاحیت اور شخصیت کا حامل ہوتا ہے، جو اس کی تخلیقات سے نمایاں ہوتی ہیں۔ مجموعہ 'کوچۂ قاتل کی طرف' کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شموئل احمد کے افسانے قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شہری تمدن اور اس کی میکانکیت نیز ہر آن متغیر ہوتی زندگی سانس لیتی نظر آتی ہے۔

چونکہ انسان اپنی فکر، نفسیات، اطوار، اقوال اور افعال و اعمال میں ہمہ رخ ہوتا ہے۔ انسان کی گہرائی و گیرائی یا اس کا تھرڈ ڈائمنشن اس کے لاشعور میں پنہاں ہوتا ہے، اس لیے فنکار نے اپنے کرداروں کے وسیلے سے انسان کی لاشعوری کائنات اور اس میں پوشیدہ خواہشات کی بازآوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے میں مرکزی کردار کے ان داخلی عوامل کے اظہار کے لیے فرائڈ کے نظریۂ نفسیات کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔ فرائڈی نفسیات میں تحلیل نفسی کو ایک مکتب فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے انسانی ذہن کی تین سطحیں بتائی ہیں۔ شعور، تحت شعور اور لاشعور۔

ذہن کا ایک حصہ ایسا ہے جو خارجی دنیا سے متعلق ہے، وہ انسان کا شعور ہے۔ زندگی میں انسان جن احساسات، تجربات اور واقعات و حادثات سے دوچار ہوتا ہے وہ اس کے تحت شعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ معرض التوا میں ڈالے گئے جذبات، دبی کچلی نامکمل آرزوئیں اور انسانی جبلت سب اس کے لاشعور کا حصہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ فرائڈ کے ان تینوں نکات کا مجموعی ماحصل دو بنیادی مقدمات کو سامنے لاتا ہے۔ بمطابق خورشید احمد: تمام انسانی اطوار کا محرک جنس ہے۔ دوسرا انسانی اعمال، افعال میں لاشعور کی کارفرمائی غالب ہے۔ اس مذکورہ نظریہ کے تناظر میں دیکھیں تو شموئل احمد کے چند ایک کردار کسی نہ کسی سطح پر اس کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ شموئل احمد واحد افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں علاقائی زبان، علاقائی حوالے اور نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں متعدد افسانہ نگاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن شموئل احمد کے مجموعے 'کوچۂ قاتل کی طرف' کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تاریخ، تہذیب، مشترکہ میراث، مسلم اقلیتی طبقے کے انحطاط کے آمیزے سے جو کہانیاں تراشی ہیں، وہ ایک حساس طبع اور فعال ذہن کی غمازی کرتی ہیں۔ یہی وصف ان کی کہانیوں کو تازگی اور انفرادیت عطا کرتا ہے۔

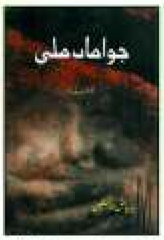

جو اماں ملی

مصنف: ریاض دانش

صفحات: 136، قیمت: 108 روپے، سن اشاعت: 2019

ناشر: دانش پبلی کیشنز، 9 مارکس اسکوائر۔ 700007

مبصر: محمد نجم الدین، مولسری تلے، مونگیر، بہار

اردو زبان و ادب کی دنیا میں جہاں ناول نگاری، سوانح نگاری، سفرنامہ نگاری کا ذکر ہوتا ہے وہاں پر افسانہ نگاری کا بھی اپنا مقام ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار مختصر وقت میں بہت ساری جہات پر روشنی ڈالتا ہے۔ سماج میں افسانے کی اہمیت ہے کیونکہ افسانہ پڑھ کر بہت ہی کم وقت میں ذہنی تناؤ اور الجھن دور ہو جاتا ہے۔ فن افسانہ نگاری میں ایک اہم نام ریاض دانش کا ہے۔ ریاض دانش نے افسانہ لکھنے کی ترغیب اپنی گھٹی میں لے کر جنم لیا تھا لیکن لکھنے کی تربیت انھوں نے اپنے خیر خواہوں سے پائی۔ ان کے افسانے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے اصول وضوابط سے بخوبی واقف ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب 'جو اماں ملی' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے 14 افسانوں پر مشتمل ہے۔ (1) جو اماں ملی (2) گھڑی (3) کافی کی پیالی (4) سڑک کا دوسرا کنارہ (5) تار عنکبوت (6) آکسیجن (7) سیراب (8) تم مر نہیں سکتے (9) نجات (10) تصورات کی پرچھائیاں (11) یاترا (12) یونہی ہوتا (13) ٹریجڈی (14) تلاش جاری ہے۔

ریاض دانش کے افسانے میں سماج کی بنیادی ماحول کی عکاسی ہے۔ ریاض دانش نے 'جو اماں ملی' میں مختلف مسائل پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ انوکھے انداز میں مافی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرے کے اندر رہنے والی بیماریوں کو اجاگر کیا، اشارے اور کنائے میں وہ باتیں کہہ ڈالیں جن کے لیے صفحات کے صفحات درکار تھے۔ آپ کے افسانے میں منظر کشی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ افسانہ 'جو اماں ملی' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے: ''دھیرے دھیرے قوال بول اٹھا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے دھوپ خانقاہ کے احاطے میں پھیل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے زندگی انگڑائی لے کر اٹھ رہی ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ زندگی کے کاروبار میں شامل ہو رہے ہیں اور یہ سب کچھ اتنی نرمی اور سست روی سے انجام پا رہا ہے کہ ان کے وقوع ہونے کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے'' ان کا یہ افسانہ 'سڑک کا دوسرا کنارہ' مطالعہ کرنے کے بعد قاری یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک جملے کا دوسرے جملے سے کس قدر ربط ہے۔ ''جب جوانی کے پودے پروان چڑھتے ہیں تو محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ جب پھول کھلتے ہیں تو بھنورے منڈلاتے ہیں، جب بھنورے منڈلاتے ہیں تو گیت کا جنم ہوتا ہے، جب گیت کا جنم ہوتا تو پپیہے کو بول ملتا ہے اور جب پپیہے کو بول ملتا ہے تو وہ اپنے پی کو پکارتا ہے اور جب وہ اپنے پی کو پکارتا ہے، تب یہ بھید کھلتا ہے کہ ایک بار پھر اس زمین پر دو روحیں ملنے کو بے چین ہیں۔'' آپ نے عمدہ اور مروجہ زبان پر خاص زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں ہندی کے الفاظ نمایاں نظر آتے ہیں۔ جیسے باپو، بٹیا، کائیاں، کوٹھوں وغیرہ۔ آپ کے کردار اسی سماج سے تعلق رکھنے والے ہیں جس میں روح ہے جو دوسروں کی بات سنتا ہے اور غم وخوشی محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی افسانہ شروع کرتا ہے تو ختم کرنے کے بعد ہی دم لیتا ہے اور قاری کو یہ احساس باقی رہتا ہے کہ اور ہوتا۔ ابتدا سے انتہا تک ایک ہی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ آپ نے ہر افسانے کا موضوع ایسا منتخب کیا ہے کہ ہر شخص افسانے کے اندرونی حصوں کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

'جو اماں ملی' ایک اہم افسانوی مجموعہ ہے جس میں سماجی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی زندگی کو بہتر بنانے کی ترغیب دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ افسانے کو افسانہ بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اخیر میں افسانہ نگار کہتے ہیں کہ ہماری نظر میں گناہ کی تلافی صرف سزا ہے۔ ریپ کرنے والے کو ریپ کی سزا ہونی چاہیے۔ یہ افسانہ فراریت پسندی کے رجحان کو نشان زد کرتا ہے اور رہبانیت کی نفی کرتا ہے۔

سوانح / شخصیات

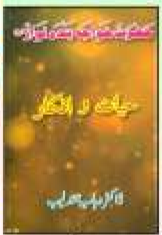

حضرت خواجہ بندہ نواز: حیات و افکار

مصنف: ڈاکٹر وہاب عندلیب

صفحات: 180، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: حامد اکمل، حنا پبلی کیشنز، ایقان ہاؤس، گلبرگہ

مبصر: سید مشہود جمال 2 مہمند جنگل، شاہجہاں پور 242001 (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب 'حضرت خواجہ بندہ نواز: حیات و افکار' کا پہلا حصہ سوانح حضرت بندہ نواز اور دوسرا حصہ خواجہ بندہ نواز کے افکار ونظریات پر مشتمل ہے جسے حضرت بندہ نواز اور گلبرگہ، اردو زبان کی ابتدا اور حضرت بندہ نواز گیسو دراز، حضرت خواجہ بندہ نواز کا دکنی کلام، دکنی شاعری میں مدح حضرت خواجہ بندہ نواز، سلسلہ بندہ نواز کے دکنی شعراء، حضرت خواجہ گیسو دراز کا مسلک عشق، حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت خواجہ بندہ نواز اور دور حاضر میں پیام بندہ نواز کی معنویت کے ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مضامین بہ عنوان 'تصوف: احوال و مقام کی اہمیت' اور 'خانقاہی نظام اور بین قومی ہم آہنگی واخوت' بھی شامل کتاب ہیں۔

مذکورہ کتاب میں 'اردو زبان کی ابتدا اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز' اور 'خواجہ بندہ نواز کا دکنی کلام' تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا ملک کے کس خطے میں اور کب ہوئی؟ اس سوال کا جواب ہنوز تحقیق طلب ہے۔ دلی، گجرات، پنجاب، ہریانہ، اور دکن وغیرہ اردو کے ابتدائی علاقے قرار دیے گئے ہیں مگر محققین میں اس بابت اتفاق رائے نہیں ہے۔ اسی طرح مورخین نے اردو نثر نگاری و شاعری میں اولیت کا سہرا مختلف شخصیتوں کے سر باندھا ہے۔ محمد حسین آزاد نے 'کربل کتھا' کو تو کچھ بزرگوں نے صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے رسائل کو اہمیت دی ہے۔ ایک عرصہ تک خواجہ بندہ نواز کی 'معراج العاشقین' اردو کی پہلی کتاب قرار دی جاتی رہی۔ بہ قول ڈاکٹر وہاب عندلیب ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، رام بابو سکسینہ، شوکت سبزواری، احسن مارہروی، گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم جیسے مستند ادیب اسے حضرت بندہ نواز سے منسوب کرتے ہیں مگر دوسرے محققین اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ اسی طرح حضرت بندہ نواز کا کچھ دکنی کلام بھی متنازعہ ہے۔ حضرت سے منسوب کچھ غزلوں اور ایک نظم 'چکی نامہ' کے متعلق شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مضامین اس معنیٰ میں اہم ہیں کہ سارے اختلافی مباحث اختصار کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔

'سلسلۂ بندہ نواز کے دکنی شعرا' میں ڈاکٹر عندلیب نے تقریباً گیارہ ایسے دکنی شعرا کا تعارف کرایا ہے جن کا تعلق حضرت بندہ نواز کے سلسلے سے منسلک ہے۔ اس سلسلے میں شاہ میراں جی شمس العشاق، حضرت برہان الدین خانم، شیخ غلام محمد شاہ داول، شیخ محمود خوش دہن، حضرت امین الدین اعلیٰ، سید میراں جی خدا نما وغیرہ نہایت اہم ہیں۔ مصنف نے مستند حوالوں سے ان کی حیات اور تخلیقات کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ ''ان صوفیا شعرا نے ہندوستانی موضوعات اور ہندوستانی عناصر سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی اس شاعری میں فضا بدیسی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوتی۔''

'حضرت بندہ نواز کا مسلک عشق' ایک اہم مضمون ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے تصوف کے تعلق سے عوام میں رائج غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے اور بزرگوں کے

اقوال سے ثابت کیا ہے کہ تصوف شریعت الٰہی اور اتباع سنت رسول کا ہی نام ہے۔ اس کی تائید میں مصنف نے حضرت غوث اعظم عبدالقادر جیلانی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت بندہ نواز کے اقوال نقل کیے ہیں۔ بندہ نواز کے سلوک کا محور عشق و محبت ہے۔

'حضرت جنید بغدادی اور حضرت خواجہ بندہ نواز' میں مصنف نے دونوں بزرگوں کے نظام ہائے فکر و عمل کا جائزہ لیا ہے۔ حضرت جنید بغدادی کا زمانہ حضرت بندہ نواز سے تقریباً پانچ سو سال قبل کا ہے۔ دونوں بزرگ اپنے دور کے ممتاز صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں اور دونوں کثیر التصانیف بھی تھے۔

'تصانیف حضرت خواجہ بندہ نواز میں مریدین و متوسلین کے لیے آداب و تلقین' اس عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے حضرت بندہ نواز کی کچھ تصانیف کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ ان میں 'آداب المریدین'، اسماء الاسرار اور رسالہ قشیریہ کا شمار اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ 'تصور وحدت الوجود، وحدت الشہود اور خواجہ بندہ نواز' عنوان کے تحت تصور باری تعالیٰ کے تعلق سے صوفیہ کے دو اہم مسالک کا تذکرہ ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود کے مطابق کائنات میں ماسوا اللہ کچھ موجود نہیں۔ ہر شے میں خدا کا ظہور ہے۔ اس مسلک کے مبلغین میں حضرت بایزید بسطامیؒ، منصور حلاجؒ اور شمس تبریزیؒ کے نام ممتاز ہیں۔ وحدت الشہود کے مطابق ہستی تو متعدد ہیں مگر سالک کو ہر چیز میں صرف خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی اس مسلک کے امام تسلیم کیے گئے ہیں۔ حضرت بندہ نواز نے دونوں مسالک کے درمیان کی راہ اختیار کی۔ وہ محبت الٰہی کو ماسوا پر غالب کرتے ہیں۔

'دور حاضر میں پیام خواجہ بندہ نواز کی معنویت' ایک اہم مضمون ہے اس میں مصنف نے دور حاضر میں انسان کی مادی ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے روحانی زوال، ذہنی انتشار اور بے سکونی کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسے میں صوفیائے کرام کے اسلامی اور روحانی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کے آخر میں دو مضامین 'تصوف: احوال و مقامات کی اہمیت' اور 'خانقاہی نظام اور بین قومی ہم آہنگی و اخوت' بھی شامل ہیں جن میں تقریباً انھیں خیالات کی تکرار ہے جو پہلے مضامین میں گزر چکے ہیں۔ تمام مضامین کے آخر میں ماخذ اور حواشی کی موجودگی تصنیف کو مستند بناتی ہے۔ امید ہے کہ صوفیائے کرام اور حضرت بندہ نواز سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

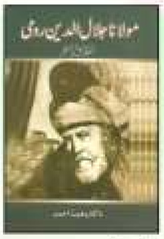

مولانا جلال الدین رومی: احوال و آثار

مؤلف: ڈاکٹر مغیث احمد

صفحات: 192، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: غزالہ بی، ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ 25

پیش نظر کتاب 'مولانا جلال الدین رومی: احوال و آثار' ڈاکٹر مغیث احمد استاد شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی کی پہلی کاوش ہے، جو 192 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب 2019 میں ایم آر پبلی کیشنز کوچہ چیلان دریا گنج، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے مذکورہ تصنیف خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

مولانا جلال الدین رومی فارسی کے معروف صوفی شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں مولانا ایک بلند پایہ ادیب، عالم دین اور مفسر قرآن بھی تھے، ان کی تصنیفات میں 'دیوان کبیر' یا 'کلیات شمس'، 'فیہ مافیہ'، 'مجالس سبعہ'، 'مکتوبات اور خصوصی طور پر 'مثنوی معنوی' خاصی شہرت کی حامل ہے، جسے ممتاز فارسی شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی نے 'ہست قرآں در زبان پہلوی' قرار دیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اور ان کے احوال و آثار کے حوالے سے ملک و بیرون ملک میں مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں معرض وجود میں آئیں اور بے شمار سمینار منعقد کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مغیث احمد کی زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موصوف شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہونہار اسکالر اور مہمان استاد رہے ہیں۔ 'مولانا جلال الدین رومی: احوال و آثار' دراصل ڈاکٹر مغیث احمد کے تحقیقی مقالے کا ایک حصہ ہے، جسے انھوں نے مولانا رومی کے احوال و آثار پر ایک پر مغز تحقیقی کتاب کی شکل میں پیش کر کے قارئین کے لیے تلاش و جستجو کے نئے در وا کرنے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی رومی کے کلام اور ان کے پیغام کو عصر حاضر کے لیے اہم اور ضروری قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر مغیث احمد مذکورہ کتاب کے صفحہ 32 پر رقمطراز ہیں:

''دور حاضر میں جو حالات درپیش ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ مولانا کے درس اخلاق کو عام کیا جائے اور اس کی خوشبو سے پورے معاشرے کو معطر کیا جائے اور اس کی اس سے اچھی اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان کے دیے ہوئے درس کا از سر نو اہتمام کریں اور ان کے پیغامات کو حتی المقدور عام کریں۔''

زیر نظر کتاب میں جہاں اردو کے مشہور محقق اور استاد الاساتذہ پروفیسر صادق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے معلوماتی مقدمہ تحریر کر کے مولانا جلال الدین رومی کے تعلق سے قارئین کی توجہ کئی اہم نکات کی طرف مبذول کرائی ہے، وہیں پروفیسر اخلاق احمد آہن استاد شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، عہد حاضر کے معروف ادیب حقانی القاسمی اور ڈاکٹر منور حسن کمال سب ایڈیٹر ایوان اردو نئی دہلی نے مختلف عنوانات کے تحت اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو مختصراً واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ فارسی کے کہنہ مشق استاد پروفیسر عراق رضا زیدی صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حسب ذیل بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''دراصل یہ کتاب دور حاضر کے تمام تنقیدی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا کی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کرنے کی کوشش ہے۔ اس کتاب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مغیث احمد نے مولانا سے متعلق تذکروں کو کھنگال کر قدیمی مبحث کے باب بند کرتے ہوئے حتمی فیصلے کی کوشش کی ہے آخر میں مولانا کی حیات جاوداں کے ضامن علمی اثاثے پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ان کے شعری شعور پر بھی ناقدانہ گفتگو کی ہے۔''

ڈاکٹر مغیث احمد نے 'مولانا جلال الدین رومی: احوال و آثار' میں مختلف عنوانات کے تحت مولانا کی زندگی کے حالات کو تفصیلی طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے تعلیم، وطن سے ہجرت، خواجہ عطار سے ملاقات، ازدواج، قونیہ میں آمد، شمس تبریزی سے ملاقات، سلسلۂ معرفت، وفات، جانشینی وغیرہ کے ساتھ ساتھ مولانا کے آثار کے بارے میں ضروری معلومات قلم بند کی ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا کے کلام کے محاسن کو بھی نہایت چابکدستی کے ساتھ عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کتاب کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی داستان کا مطالعہ کر رہے ہیں اور قاری کو کہیں بھی اکتاہٹ یا آشفتگی کا احساس نہیں ہوتا، خصوصی طور پر مؤلف نے مولانا رومی کی شمس تبریز سے ملاقات کے واقعے اور ان کے درمیان عشق کے واقعات کو مختلف تذکروں اور فارسی ابیات کی روشنی میں جس طرح مکمل طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ لاجواب ہے۔

پیش نظر کتاب میں مولانا جلال الدین رومی کی سوانح اور ان کی علمی و ادبی خدمات تحریر کرنے کے لیے جن ماخذ و مراجع کی مدد لی ہے وہ یقیناً مستند و معتبر ہیں اور موصوف کے وسیع مطالعے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ الغرض ڈاکٹر مغیث احمد کی یہ کتاب قارئین کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے، خصوصاً محققین کو مولانا روم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے روشناس کرانے میں معاون ہوگی۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

اردو کی خوشبو دنیا کے بہت سے ممالک تک پہنچ رہی ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

دبئی کے شاعر سید فرحان واسطی کی آمد پر استقبالیہ

نئی دهلی: اردو زبان کی خوشبو آج دنیا کے بہت سے ممالک تک پہنچ چکی ہے اور روز بروز اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اہم رول ہندوستان کا وہ اردو داں طبقہ ادا کر رہا ہے جو بیرونی ممالک میں مقیم ہے اور اپنے کاروبار و پیشہ ورانہ مشغولیتوں کے ساتھ ادب کی خدمت میں بھی مصروف ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے دبئی سے تشریف لائے ہوئے مہمان شاعر اور ادبی ادارہ جشن اردو کے سربراہ سید فرحان واسطی کے استقبال میں منعقدہ نشست سے

خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مہمان محترم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ فرحان واسطی بنیادی طور پر مشرقی یوپی کے ضلع بارہ بنکی سے تعلق رکھتے ہیں اور گذشتہ دس بارہ سال سے دبئی میں مقیم ہیں اور وہاں اپنی دوسری پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسے لوگ قابل قدر ہیں جو ہندوستان سے باہر رہتے ہوئے بے لوث طریقے سے اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور غیر اردو داں طبقات کے درمیان اردو زبان کو متعارف کرا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے مہمان محترم کو قومی اردو کونسل کی خدمات سے بھی متعارف کرایا اور کہا کہ کونسل نہ صرف ہندوستان میں اپنی مختلف سرگرمیوں کے ذریعے اردو زبان و ادب کی توسیع و فروغ میں مصروف ہے بلکہ اپنی خدمات کا دائرہ بیرونی ممالک تک وسیع کرنے کے لیے پرعزم ہے۔

سید فرحان واسطی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل اور ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کا شکریہ ادا کیا اور دبئی کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دبئی میں اردو زبان کے محبین کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور سال میں کم سے کم سات آٹھ بڑے اردو مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اپنے ادارہ جشن اردو کا تعارف پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کے ذریعے گذشتہ بارہ تیرہ سالوں سے اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے کام کیا جارہا ہے۔ اس کے تحت اب تک جشنِ عرفان صدیقی، جشنِ سلیمان خطیب وغیرہ منائے جاچکے ہیں اور مختلف ادبی شخصیات کو اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ 2018 میں جشنِ اردو کا انعقاد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ہوا تھا اور اس سال بھوپال وحیدرآباد میں انعقاد کا منصوبہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جشن اردو کے تحت اردو کے ساتھ ہندی کے فروغ کی کوششیں بھی کی جارہی ہیں اور ہم لوگ سنسکرت زبان کے تحفظ پر بھی کام کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد یوسف رامپوری، محمد انصر اور منیر انجم نے بھی اپنے منتخب اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نشست کے اختتام پر قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے مہمانِ مکرم کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 فروری 2020

شولاپور میں قومی اردو کونسل کی موبائل وین

شولاپور: اردو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی موبائل وین شولاپور آمد پر، شولاپور ضلع اردو ہیڈ ماسٹر ایسوسی ایشن شولاپور، اردو ایجوکیشنل آرمی سولاپور، سوشل اردو

ہائی اسکول کی جانب سے موبائل وین کے انچارج جناب وی صدیق کا استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر ایسوسی ایشن کے صدر و سوشل اردو ہائی اسکول کے صدر مدرس عبدالجبار شیخ نے زیادہ سے زیادہ کتابیں خرید کر اس سنہری موقع کا فائدہ اٹھانے کی اپیل کی۔ سوشل اردو پرائمری اسکول کے صدر مدرس آصف اقبال نے قومی اردو کونسل کی کوششوں کو سراہا۔ اس موقعے پر سید میر، شولاپور میونسپل کارپوریشن شعبہ تعلیم سوپروائزر ممتاز شیخ، عبدالکریم رنچھرے، ساجد شاہ بھائی، آصف اقبال، فاروق منگلے، عبدالجبار شیخ، وی صدیق، عرفان کیرول، سلطان اختر، سولاپور یونیورسٹی سینیٹ ممبر اعجاز عالم، واعظ سید، شفیع شطاری، سراج احمد سراج شولاپوری، حسین پٹھان، کے علاوہ دیگر باذوق حضرات شریک تھے۔

پریس ریلیز: باغبان محمد اقبال، شولاپور، مہاراشٹر، 16 فروری 2020

جمال محمد کالج ترچناپلی میں سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد

جمال محمد کالج، ترچناپلی تمل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے علاقائی سینٹر کے تحت اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ کورس، کمپیوٹر ڈپلوما کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جارہی ہے جس میں امسال 36 طلبہ وطالبات نے ڈپلوما اردو

لینگویج، 73 طلبہ وطالبات نے سرٹیفکٹ ان عربک، 34 طلبہ وطالبات نے ڈپلوما ان فنکشنل عربک اور 36 طلبہ وطالبات نے کمپیوٹر ڈپلوما اور اس کے علاوہ کورسز میں دو ہزار سے زائد طلبہ وطالبات نے بھی اسناد حاصل کیں۔ اس سلسلے میں کالج آڈیٹوریم میں دو روزہ اجلاس منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر اے کے خواجہ نظیم الدین، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، جمال محمد کالج (خودمختار)، ترچناپلی نے کی۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ پرنسپل ڈاکٹر ایس اسماعیل محی الدین نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر منی شجی تھامس، ڈائرکٹر، این آئی ٹی، ترچناپلی نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور مہمان اعزازی ڈاکٹر ایم کرشنن، وائس چانسلر، مدوروائی کامراج یونیورسٹی نے طلبا سے خطاب کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر اے کے نظیم الدین نے کی۔ آخر میں مہمانوں نے طلبہ وطالبات کو اسناد تقسیم کیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد مدثر، شعبۂ اردو، جمال محمد کالج، ترچناپلی

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے
جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ادبی وعلمی ورثہ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ قربانیوں سے عبارت ہے۔ اس ادارے کی عمارتوں میں صرف اینٹ اور پتھر نہیں ہیں بلکہ اس کی تعمیر میں تحریک آزادی کے قافلہ سالاروں اور علما و دانشوروں کا لہو بھی شامل ہے۔ اس کے بانیان و معماران نے جامعہ کے لیے اپنا قلم، زبان اور دولت و منصب سب کچھ وقف کردیا تھا۔ اگر آپ ان عمارتوں کی حفاظت نہیں کریں گے تو آپ کی تاریخ مٹ جائے گی۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ادبی وعلمی ورثہ' (26 تا 27 فروری 2020) کے افتتاحی اجلاس کے کلیدی خطبے میں معروف مورخ اور

اسکالر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے کیا۔ معروف ادیب اور ترجمہ نگار پروفیسر انیس الرحمن نے صدارتی کلمات میں کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں الگ اختصاص اور انفرادیت اس لیے حاصل ہے کہ یہ ایک تحریک، ایک نظریہ، ایک وژن، ایک مشن اور ایک تہذیب کا گہوارہ ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بحیثیت مہمان خصوصی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے مقابلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ وہ پہلی یونیورسٹی ہے جس کو صحیح معنوں میں گاندھیائی نظریات کی نرسری کہا جاسکتا ہے۔ جدید ہندوستان اور نئی تعلیم کا کوئی تصور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بغیر ناممکن ہے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ ہم نے جامعہ صدی کو بہت سنجیدگی سے اپنے اکیڈمک سرگرمیوں کا حصہ بنایا ہے۔ جامعہ صدی کے سلسلے میں شعبۂ اردو تیسرا سمینار منعقد کررہا ہے اور ہم نے اپنا سالانہ مجلّہ 'ارمغان' بھی جامعہ صدی کے لیے مختص کیا ہے، جس کا اجرا وائس چانسلر کے دست مبارک سے عمل میں آچکا ہے۔ سمینار کے کنوینر پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ مشکل اور آزمائشی حالات میں بھی علم، تعمیر اور زبان وادب کی آبیاری کے لیے برسر پیکار رہنا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شناخت رہی ہے اور آج کا یہ سمینار بھی جامعہ کی اس زریں تاریخ کا ایک روشن باب رقم کرے گا۔ اس سمینار میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اردو میڈیم میں جامعہ نے پوری ایک صدی میں مختلف علوم وفنون کی جو وراثت چھوڑی ہے اس کا ایک علمی محاسبہ کیا جاسکے تاکہ اس کی روشنی میں مستقبل کا ایک تعمیری لائحہ عمل تیار کرنے میں مدد ملے۔ اظہار تشکر کرتے ہوئے پروفیسر خالد جاوید نے کہا کہ اجتماعی فراموشی آج کا ایک قومی اور عالمی المیہ ہوگیا ہے۔ ایسے میں جامعہ کے علمی وادبی ورثے کو موضوع بحث بنانا اجتماعی یادداشت کی بازیافت کا عمل ہے۔

دو روزہ قومی سمینار 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ادبی وعلمی ورثہ' کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی

روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ارباب جامعہ کا تعلق جامعہ کے دوسرے شعبوں سے ہے ان میں سے بیش تر کی شہرت اردو سے وابستہ رہی ہے۔ جامعہ جب بھی اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرے گی تو اس کی زبان اردو ہوگی۔ میں اردو کو جامعہ کی دفتری ہی نہیں بلکہ مادری زبان بھی سمجھتا ہوں۔ دوسرے اجلاس کے صدارتی خطبے میں پروفیسر شہناز انجم نے کہا کہ جامعہ دراصل بابائے قوم مہاتما گاندھی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ گاندھی جی نے بارہا اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جامعہ کو باقی رکھنے کے لیے میں بھیک مانگنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ تیسرے اجلاس کے صدارتی کلمات میں پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شعروادب میں کسی رجحان کی قیدو بند قبول نہیں کی، بلکہ تنوع اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر احمد محفوظ اور پروفیسر مولا بخش نے بھی اظہار خیال کیا۔ سمینار کے مختلف اجلاس میں پروفیسر عراق رضا زیدی نے 'شعبۂ فارسی کی اردو خدمات'، پروفیسر رضوان قیصر نے 'شعبۂ تاریخ کی اردو خدمات'، پروفیسر محمد اسحاق نے 'شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی اردو خدمات'، پروفیسر مولا بخش نے 'شعبۂ اردو کی تنقیدی خدمات'، ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے 'جامعہ اور اردو ڈراما نگاری'، ڈاکٹر محمد کاظم نے 'جامعہ اور مطالعۂ ٹیگور'، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب نے 'جامعہ کا نایاب گوہر محمد علی جوہر'، ڈاکٹر شاہ عالم نے 'اکابرین جامعہ کی نثری خدمات'، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی نے 'شعبۂ عربی کی اردو تحریریں' ڈاکٹر معید الرحمٰن نے 'جامعہ اور مطالعۂ اقبال'، ڈاکٹر خالد مبشر نے 'شعبۂ اردو کی شعری خدمات' اور ڈاکٹر انوارالحق نے 'جامعہ میں ترجمہ نگاری کی روایت' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر شکیل اختر، ڈاکٹر جاوید حسن اور ڈاکٹر ثاقب عمران نے مختلف اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز: خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 4 مارچ 2020

ایک سو پچاس سال میں غالب تحقیق وتنقید

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام غالب کے 151 ویں یوم وفات کی مناسبت سے یہاں منعقدہ یک روزہ سمینار میں ملک بھر سے تشریف لائے ادیبوں، ناقدوں اور ریسرچ اسکالروں نے کہا کہ غالب ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام کی تفہیم کا علمی اور تحقیقی سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے جس سے غالب کی شاعری کی بے پناہ عظمت و بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب پر جتنی تحقیق وجستجو ہوئی ہے اور ہو رہی ہے وہ کسی اور زبان کے شاعر کے حصہ میں نہیں آئی۔ اسی لیے غالب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر سمینار کا تعارف غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کرایا۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی ہر سال غالب کے یوم وفات پر مختلف تقریبات کا اہتمام کرتی ہے جس میں سمینار بھی ایک اہم کڑی ہوتا ہے۔ اس مرتبہ جو عنوان منتخب کیا گیا ہے وہ خاصا وقیع اور جامع ہے اور اس پر اظہار خیال کرنے کے لیے اکادمی نے ملک کے ممتاز ناقدوں اور ادیبوں کو دعوت دی ہے۔ اس سمینار سے غالب شناسی کے کئی نئے گوشوں پر روشنی پڑے گی۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے عالمانہ مقالہ بعنوان تفہیم غالب/شمس الرحمٰن فاروقی میں غالب شناسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے کلام کی تفہیم کا عمل خود غالب کی زندگی سے شروع ہوگیا تھا جو آج تک جاری ہے۔ غالب 'ترقی پسندوں کی نظر میں' کے عنوان سے اپنے مقالہ میں پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ اردو شاعروں میں غالب کا امتیاز یہ ہے کہ اس کا شعری متن اپنی وضع میں اتنا پیچیدہ ہے کہ نظریاتی سرحدیں اس کے احاطے سے قاصر ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرساد کے عنوان سے اپنے مضمون میں مہیش پرساد کی غالب شناسی کا جائزہ پیش کیا۔ غالب تنقید/سید احتشام حسین کے عنوان سے پروفیسر شہناز نبی (کولکاتا) نے کہا کہ غالب ایک ایسا شاعر ہے جس کی تفہیم آج بھی مشکل ہے اور جتنا کام ان کی شاعری کی تحقیق پر ہوا ہے وہ مختصر ہے اس پر زیادہ سے زیادہ کام ہونا چاہیے۔ معروف ادیب انجم عثمانی نے غالب اور مالک رام کے عنوان سے اپنے مقالے میں اس نکتہ کو اجاگر کیا کہ غالب ایک ایسے شاعر ہیں کہ دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی ان کی شہرت ومقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب کی طرح غالبیات کے ماہر مالک رام کی تحریریں بھی فکر انگیز ہیں اور غالب کی مناسبت سے انھیں بھی یاد رکھا جائے گا۔ محاسن کلام غالب کے موضوع پر اپنے مقالے میں ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ غالب نے جہاں تک ہوا ایک لفظ کو دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح انھوں نے کسی مضمون کا بھی اعادہ نہیں کیا۔ پروفیسر علیم اشرف خان شعبۂ فارسی نے غالب اکادمی کا یادگار غالب ایڈیشن: چند معروضات کے عنوان سے اپنے مضمون میں کہا کہ غالب کی سوانح کی پہلی کتاب مولانا الطاف حسین حالی کی یادگار غالب ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب اکادمی نے جو ایڈیشن 2011 میں شائع کیا ہے اس میں فارسی متون اور اشعار کا آسان اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی غالب فہمی کے عنوان پر اپنا مضمون پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ شکیل الرحمٰن نے غالب کی جمالیات کا احاطہ کیا ہے جس میں انھوں نے غالب کو اردو نثر میں نئی داستانیت کا موجد قرار دیا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر انور پاشا نے غالب ماضی، حال، مستقبل پروفیسر محمد حسن کے عنوان سے اپنے مقالے میں بتایا کہ غالب نے اردو شاعری میں نئی داخلیت کا تصور پیش کیا۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے غالب ابتدائی دور میں/خورشید اسلام کے عنوان سے ایک وقیع مقالہ پیش کیا اور ان کے عہد کے سیاسی اقتصادی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی۔ دہلی یونیورسٹی کی نجمہ رحمانی نے یادگار غالب/حالی کے عنوان سے اپنے مقالے میں حالی اور سرسید کے افکار وخیالات کا موازنہ کیا۔ ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے کہا کہ حالی غالب کے شاگرد ہونے کے علاوہ ان کے نقاد بھی تھے۔ حالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے غالب پر کوئی باضابطہ کتاب لکھی۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے یادگار غالب کے سدابہار پہلو کے موضوع پر اپنے مقالے میں کہا کہ یہ کتاب غالب شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا۔ شاداب شمیم نے دیگر اسکالروں نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ غالب اکادمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غالب کو ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ ہندی کے ادیب شمشیر بہادر سنگھ نے اپنے مضمون میں غالب کی عالمی حیثیت کو اجاگر کیا۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر افضال حسین اور نظامت عبدالباری صدیقی اور دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر نصیر احمد خاں اور نظامت ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے انجام دی۔ یہ سمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 فروری 2020

اکیسویں صدی میں اردو ناول کا بدلتا منظرنامہ

نئی دھلی: انسانوں سے جتنا رشتہ ناول کا ہے اتنا کسی اور صنف کا نہیں، حقیقت کا ادراک فلسفہ وسائنس سمیت تمام علوم وفنون میں ہوتا ہے لیکن وہاں یہ عمل جزوی ہوتا

ہے۔ حقیقت کا کلی عرفان صرف ناول میں ہی ممکن ہے۔ سیاسی شعور کے بغیر ناول کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا جاسکتا۔ ناول کو داستان کا ارتقا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ داستان زندگی کا جشن ہے جب کہ اس کے برعکس ناول ایک ایسی موت کا بیانیہ ہے، جس کا خالق تنہائی کا ڈسا ہوا فرد ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار عہد حاضر کے ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی اردو اکادمی اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے مظہر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'اکیسویں صدی میں اردو ناول کا بدلتا منظر نامہ' (27 تا 28 فروری 2020) کے افتتاحی اجلاس میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کیا۔ کلیدی خطبے میں پروفیسر مولا بخش نے کہا کہ اکیسویں صدی کے اردو ناول کثیر الآہنگ اسالیب کے ذریعہ انسانیت کی شناخت کی تلاش پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ناول سے تاریخیں بھی بدلی ہیں اور حالات بھی بدلے ہیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی صحیح معنوں میں ناول کی صدی ہے۔ اس عہد کا جو بھی آشوب ہوسکتا ہے ان سب کو ناول نے اپنے قالب میں جذب کرلیا ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر شہزاد انجم نے اکیسویں صدی کے اہم ناولوں کے حوالے سے کہا کہ ان ناولوں سے زبان و اسلوب اور موضوعات و مسائل کے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یہ تمام ناول اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی دستاویز ہیں۔ معروف نقاد اور مظہر فاؤنڈیشن انڈیا کے صدر پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی صحیح عکاسی تمام تر بد قماشیوں، خوشیوں اور دکھوں کے ساتھ ناول میں ہی ممکن ہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض سمینار کے کنوینر ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوت اور اختتام عرفان احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔

سمینار کے دوسرے دن تین تکنیکی اجلاس ہوئے جن کی صدارت انجم عثمانی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر محمد علیم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ابوبکر عباد اور ہمایوں اشرف نے کی۔ تکنیکی سیشن میں پروفیسر ندیم احمد نے ناول 'اگر تم لوٹ آتے' ڈاکٹر ابوبکر عباد نے 'چمراسُر' حقانی القاسمی نے 'پلیتہ' ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے 'تخم خوں' ڈاکٹر محمد کاظم نے 'لیمی عیڈ گرل' ڈاکٹر معید الرحمٰن نے 'نعمت خانہ' ڈاکٹر ناظمہ جبیں نے 'اجالوں کی سیاہی' ڈاکٹر خالد مبشر نے 'اماوس میں خواب' ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے 'آسماں سے آگے' ڈاکٹر عادل حیات نے 'روحزن' ڈاکٹر نوشاد منظر نے 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' ڈاکٹر راحت افزا نے 'راجدیو کی امرائی' ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی نے 'مرگ انبوہ' ڈاکٹر سلمان فیصل نے 'برف آشنا پرندے' خان رضوان نے 'عزازیل' ڈاکٹر نورین علی حق نے 'آخری سواریاں' امیر حمزہ نے 'مانجھی' شاہنواز قمر نے 'اندھیرا پگ' محمد ریحان نے 'میرے ناولوں کی گمشدہ آواز' پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر نوشاد منظر، قرۃ العین اور ڈاکٹر ثاقب عمران نے مختلف اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کی جمالیات اور تنقید نگاری

پٹنہ: اردو تنقید نگاروں میں شکیل الرحمٰن کا صحیح طور پر تعین نہیں ہوسکا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ مقام انھیں نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل بھی ان کے اسلوب سے ناواقف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے وژن میں مشرقی ادبیات کی پاسداری بھی ہے اور مغربی علوم وفنون کے اثرات بھی۔ یہ باتیں پروفیسر علیم اللہ حالی نے بحیثیت مہمان خصوصی بہار اردو اکادمی پٹنہ میں منعقدہ یک روزہ قومی سمینار 'امن فاؤنڈیشن جھاجھا' کے زیر اہتمام بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی بہ عنوان 'بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن کی ادبی خدمات' کے موقعے پر کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن

نے ترقی پسندی سے فائدہ اٹھایا لیکن اس میں محصور نہیں رہے۔ انھوں نے نفسیات اور جمالیات کی خوبیوں سے بھی دامن تنقید کو مالا مال کیا۔ اس پروگرام کی صدارت مشتاق احمد نوری نے کی۔

اس سے قبل امن فاؤنڈیشن کے سکریٹری جناب ایڈوکیٹ مقبول احمد نے تمام مہمانان کا پھولوں سے استقبال کرتے ہوئے ادارے کی غرض و غایت بیان کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شاہد اختر کی نئی کتاب 'ہندوستان کا تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ' کا اجرا بدست مہمانان عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن بسیار نویس تنقید نگار تھے۔ انھوں نے جمالیات کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کو جمالیات سے انھوں نے ہی متعارف کرایا۔ کلاسیکی شاعری اور جدید شاعری پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، جناب خورشید حیات، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر طلحہ ندوی، ڈاکٹر ثوبان سعید، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر تسلیم عارف کے نام قابل ذکر ہیں۔

صدارتی کلمات میں بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے اپنی پرمغز تقریر میں اس بات کا اظہار کیا کہ شکیل الرحمٰن ایک مشکل نقاد تھے اس لیے ان کو سمجھنے اور ان کی بات تک بلاواسطہ پہنچنے میں معاصرین ادب کو دیر لگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عہد ساز ناقد اور جمالیاتی تنقید کے اسم با مسمیٰ کہے جانے والے ناقد کو عدم مقبولیت اور گمنامی کی اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ریحان حسن نے بہ حسن وخوبی ادا کی جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر شاہد اختر نے ادا کیا۔

رپورٹ: ناہید تبسم، امن فاؤنڈیشن جھاجھا، 24 فروری 2020

ہندوستان میں اردو زبان کی بقا اور فروغ میں ہماری مشترکہ ذمے داری

نگینہ: اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے میل ملاپ سے وجود میں آئی ہے۔ اردو کو

فراموش کرنے کا مطلب ہندوستان کی صدہا سالہ تہذیب سے اپنی نسل کو محروم رکھنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور ادیب و شاعر شکیل احمد خاں شکیل نے کیا۔ وہ ہندوستان میں اردو زبان کی بقا اور فروغ میں ہماری مشترکہ ذمے داری کے عنوان پر منعقد قومی سمینار میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ الخدمت سوسائٹی بجنور کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار کو خطاب کرتے ہوئے شکیل بجنوری نے کہا کہ لسانی اعتبار سے اردو زبانوں کا تاج محل ہے اور جس طرح تاج محل کی تعمیر میں ہزاروں ہاتھ اینٹ پتھر دینے میں شامل رہے عین اسی کی مانند اردو کی آبیاری میں ہندوستان کی تمام قوموں نے مشترکہ حصہ لیا۔ انھوں نے مذہبی فرائض کے مانند ہی اردو اور مادری زبانوں کی تعلیم پر توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر زیبا ناز نے کہا کہ اردو کے فروغ اور اس کی بقا کے لیے سرکاری کوششوں کے ساتھ گھریلو ماحول بھی اردو کے موافق بنانا ضروری ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ بی نے کہا کہ اردو کے اخبارات کی اشاعت میں تکلیف دہ حد تک کمی آئی ہے جس کے لیے قارئین کی تعداد میں گراوٹ اور اخبارات کو اشتہارات کا نہ ملنا بڑی وجہ ہے۔ انھوں نے اردو اخبارات کو زیادہ سے زیادہ اشتہارات دینے پر زور دیا۔ ڈاکٹر عظمیٰ خان نے اردو میڈیم اداروں کے قیام کا مطالبہ کیا اور کہا کہ جب اداروں کا قیام ہوگا تو یقینی طور پر اردو کو دوام حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر محمد اسلم نے اردو اور ہندی کو قومی وراثت بتایا اور کہا کہ کسی ایک زبان کو نقصان پہنچنے کا مطلب دونوں زبانوں کی روح زخمی ہونا ہے۔ چاندنی عباس نے مقامی طور پر چھوٹی چھوٹی لائبریری کھولنے کی بات کی اور بچوں کے لیے آسان زبان میں پرچے، رسالے شائع کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر سوریہ منی رگھوونشی نے کہا کہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک مخصوص ذہنیت نے اردو کو محض مسلموں کی زبان بنا کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے والد آنجہانی بابو سنگھ چوہان بہترین اردو بولتے تھے۔ انھوں نے بجنور ضلع سے اردو کا پہلا اخبار نکالا تھا۔ انھوں نے لسانیاتی گروہ بندی سے زبانوں کو آزاد کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر معروف سیاسی لیڈر شمشاد انصاری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقد سمینار کے مقالہ نگاروں کو توصیفی سند اور مومنٹو سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں طلبا اور محبان اردو نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 فروری 2020

اردو لوک ادب کی روایت

چنئی: لوک ادب ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ اس میں اردو زبان کی جڑیں پیوستہ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار، مدراس یونیورسٹی شعبۂ اردو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد ہونے والے دو روزہ کل ہند سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول نے کیا۔ انھوں نے اردو میں لوک ادب کی روایت پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ابتدا ہی لوک ادب سے ہوئی۔ امیر خسرو سے لے کر آج تک اردو کے لوک گیت اور کہانیاں عوام میں مقبول ہیں لیکن ناقدین نے اس کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی، اس لیے کہ اس موضوع پر کام کرنے والا ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کام نہیں کر سکتا ہے، اسے عوام کے بیچ جانا ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کہا کہ تمل ناڈو میں اردو کے لوک گیتوں پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں کے اردو لوک گیتوں پر تمل اثرات موجود ہیں۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی حبیب احمد نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے لوک ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر ایم سمپت کمار نے کی اور مہمان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر ایم لتا کماری شریک ہوئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2020

اردو ادب میں ہندوستانی اساطیر

نئی دهلی: ریور ویو ہوٹل ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر میں ایکشن فار ڈیولپمنٹ اینڈ ویلفیئر آف سوسائٹی اینڈ انوائرنمنٹ (ایفڈ اس) نئی دہلی کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں ہندوستانی اساطیر' کا انعقاد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت سابق وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی اور سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی پروفیسر خالد محمود نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اساطیر ایک وسیع اصطلاح ہے اور اردو ادب سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو نے فارسی اور عربی سے مختلف سطحوں پر استفادہ کیا ہے اس لیے کچھ لوگوں کو بجا طور پر لگتا ہے کہ اس میں ہندوستانیت کے اثرات کم ہیں، لیکن یہ جزوی صداقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہمیں کافی تعداد میں ہندوستانی اساطیر کا پتہ ملتا ہے۔ انھوں نے سمینار کے لیے ایسے اچھوتے موضوع کے انتخاب پر ایفڈ اس کے عہدیداران کو مبارکباد پیش کی۔ افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی مفتی رحیم اللہ خان قاسمی، بھوپال نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انل کمار اور ڈاکٹر رحمان مصور نے مشترکہ طور پر کی۔ اس اجلاس میں جن لوگوں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں مہر فاطمہ، ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی، جناب قرۃ العین، ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر انل کمار نے اپنے صدارتی خطبے میں سمینار میں پڑھے گئے مقالات کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے طلبا کو مزید محنت کی صلاح دی۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خان رضوان نے انجام دیے۔ آخر میں ایفڈ اس کے جنرل سکریٹری محمد جان کے شکریے کے ساتھ سمینار کے اختتام کا اعلان ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 فروری 2020

ہندوستان میں نعت گوئی کی روایت آزادی کے بعد

لکھنؤ: نعت گوئی جذبۂ عقیدت اور وارفتگیِ رسول کا حسین اظہار ہے۔ وسیع تناظر میں نعت کہنا ذکر رسول ہے، جو عبادت کی قبیل سے ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا علاء الدین ندوی نے احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام 'ہندوستان میں نعت گوئی کی روایت آزادی کے بعد' کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں کلیدی خطبے کے دوران کیا۔ سمینار کا اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے یہاں لکھنؤ کے اکادمی آف ماس کمیونی کیشن میں کیا گیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر سید محمد شفیق اشرفی نے نعتیہ شاعری کو فروغ دینے اور نئی نسل تک اس کو حسن و خوبی کے ساتھ پہنچانے پر زور دیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ملک زادہ نے سمینار کو ایک عمدہ کوشش سے تعبیر کیا اور کہا کہ لکھنؤ نعتیہ ادب کے حوالے سے بھی بہت محترم رہا ہے۔ ڈاکٹر مخمور کاکوروی نے درد کاکوروی کی نعتیہ شاعری کو موضوع بنایا اور کہا کہ دبستان لکھنؤ کے نعتیہ ادب میں جن شاعروں کا نام اور ان کا فنی کمال شامل رہے گا

ان میں وررد کا کوروی بھی ہیں۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے کہا کہ شارق لاہرپوری کی نعتیہ شاعری موضوع اور فن دونوں کا خوبصورت احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے عصر حاضر کی نمائندہ نعت گو شاعرات کے حوالے سے مقالہ پیش کرتے ہوئے نعتیہ شاعری پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے عصر حاضر کے نعتیہ شاعروں کے حوالے سے مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر سرفراز احمد خاں نے نعتیہ ادب کے حوالے سے اردو کے شعری ذخیرے کو بہت ممتاز قرار دیا۔ ڈاکٹر یاسر جمال نے ہندوستان کی جدید نعتیہ شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر حمیرہ عالیہ نے ابوالمجاہد زاہد کی نعت گوئی پر مقالہ پڑھا۔ مانو کے ریسرچ اسکالر شاہد حبیب نے فضا ابن فیضی اور واحد نظیر کی نعت گوئی پر مقالہ پیش کیا۔ سیمنار میں ڈاکٹر شاہ محمد فائز، راشد خاں ندوی، عطیہ بی، اطہر حسین، محمد سعید اختر، محمد ارشد نے بھی نعت گوئی کے حوالے سے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 فروری 2020

ہندوستان اوراس کی ثقافت: عربی زبان وادب کے حوالے سے

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں جامعہ ٹیچرز ایسوسی ایشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک و تعاون سے شعبۂ عربی کے زیراہتمام کثیر جہتی بین الاقوامی کانفرنس کی دو نشستیں پروفیسر عبدالحلیم ندوی لائبریری میں 'ہندوستان اوراس کی ثقافت: عربی زبان وادب کے حوالے سے' کے مرکزی موضوع پر منعقد ہوئیں۔ پروفیسر حبیب اللہ خاں اور پروفیسر رضوان الرحمٰن نے پہلی نشست کی مشترکہ صدارت کی۔ اس نشست میں حسین ہیکل کی تحریروں میں ہندوستانی ثقافت کی خصوصیات، ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ہندوستانی ثقافت، شیخ علی طنطاوی کی تصنیفات میں ہندوستان اور اس کی ثقافت، عربی ادب میں ہندوستانی سماج وثقافت کی جھلکیاں جیسے موضوعات پر بالترتیب ڈاکٹر مجیب اختر (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر محمد اکرام (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور ڈاکٹر محمد سلیم (اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی) نے مقالے پیش کیے۔ جبکہ پروفیسر محمد ایوب ندوی اور پروفیسر عبدالماجد قاضی نے دوسری نشست کی مشترکہ صدارت کی۔ اس نشست میں شوقی کی شاعری میں ہندوستانی شخصیات، عرب کے قدیم سفرناموں میں ہندوستان کا تذکرہ، نوال سعداوی کے سفرنامہ میں ہندوستانی خواتین کی عکاسی، جبرا ابراہیم جبرا کی تحریروں میں ہندوستانی ثقافت کی ترجمانی، محمد بن ناصر عبودی کے سفرنامے ہندوستان کے بارے میں، جیسے موضوعات پر بالترتیب ڈاکٹر نسیم اختر (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر حسنین اختر (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر زرنگار (جے این یو)، ڈاکٹر عظمت اللہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور ڈاکٹر فوزان احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد صدر جلسہ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے اپنے صدارتی خطاب میں مقالہ نگاروں کی عرق ریزی کو سراہا۔ تمام مقالہ نگاروں کو سند شرکت برائے مقالہ نویسی سے نوازا گیا۔ پروگرام کے اخیر میں شعبہ عربی کی اسکالر ارم زہرا رضوی نے تمام حاضرین اور منتظمین خاص طور پر جامعہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری پروفیسر ماجد جمیل اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 فروری 2020

جامعہ صدی کانفرنس

نئی دهلی: ہندوستان کی تہذیب وثقافت کی تعمیر وتشکیل میں خانقاہی نظام کا اہم کردار رہا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی تہذیب کی جدید خانقاہ ہے اور اس خانقاہ کو استحکام بخشنے میں حکیم اجمل خاں، مختار احمد انصاری، ذاکر حسین، محمد مجیب اور عابد حسین جیسے جدید صوفیا

نے جاہ و دولت سے بے نیاز ہوکر قربانیاں پیش کی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے زیراہتمام شعبۂ اردو اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے جامعہ صدی تقریبات کے سلسلے میں منعقدہ 2 روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے صدارتی کلمات میں پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے کیا۔

صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدی تقریبات کے سلسلے میں جامعہ ٹیچرز ایسوسی ایشن نے دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا ہے جس کے تحت 28 شعبوں کے مختلف اجلاس میں 18 ممالک کے مندوبین کی شرکت ہوئی ہے جس میں شعبۂ اردو کی جانب سے منعقدہ اجلاس میں 11 مقالوں کی پیش کش عمل میں آئی۔ سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر خالد محمود نے مشترکہ تہذیب کو ایک ایسا مربع قرار دیا جس کے چار اضلاع ہندوستان، جامعہ، جدید تعلیم اور اردو زبان وادب ہیں اور ان چاروں کے بغیر جامعہ صدی تقریبات کا کوئی بامعنی تصور قائم نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے فروغ میں مختلف زبانوں اوراس کے ادب کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ اپنی صدی کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ یہ موقع اپنے اس طویل سفر کے جائزہ واحتساب کا بھی ہے اور روشن مستقبل کا ایک وژن متعین کرنے کا بھی ہے۔ اس سیمنار کے دونوں اجلاس میں پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر انور پاشا، ڈاکٹر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر ثاقب، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی نے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 فروری 2020

امیر خسرو ہندوستانی تہذیب کے علمبردار

مراد آباد: نہرو یووا میلا کمیٹی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'حضرت امیر خسرو ہندوستانی تہذیب کے علمبردار' کے موضوع پر ایک قومی سیمنار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر شفیع ایوب نے کہا کہ ہندوستان میں حضرت امیر خسرو نے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی موسیقی کی آمیزش سے قوالی ایجاد کی، یہ جو آج قوالی ہے، ہندوستان میں امیر خسرو کے ذریعے ہی رواج پائی۔ انھوں نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے ہندوستان میں طبلہ اور ستار ایجاد کیا تھا۔ جموں یونیورسٹی کے ڈاکٹر لیاقت علی نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے اردو (ہندوی) میں پہلی غزل موزوں کی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے تمام مذاہب کے تہواروں پر بھی اشعار تحریر کیے۔ جموں پونچھ کے ڈاکٹر مسعود احمد، ہریانہ میوات سے ڈاکٹر ریاض احمد، مشرف انجم، تمیم احمد نسیمی اور سید آصف حسن نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر فرید احمد نے حضرت امیر خسرو کے نظریات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 فروری 2020

اردو شعر وادب کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ

لکھنؤ: ماضی میں بھی مسلمان مورخین نے ہندو شعرا و ادبا کے کمالات کو بلند آہنگی اور کشادہ دلی کے ساتھ سراہا ہے اور ان کے جواہر پاروں کی قدر وعزت کی ہے۔ کیا اردو کے داستانی ادب میں کوئی پنڈت رتن ناتھ سرشار کی معرکہ آرا تصنیف 'فسانۂ آزاد' کو بھول

سکتا ہے؟ کیا کوئی پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' سے صرف نظر کر سکتا ہے؟ کیا اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں منشی نول کشور کی خدمات کو فراموش کیا جا سکتا ہے؟ کیا مالک رام کا کوئی بدل ہو سکتا ہے؟ اردو شاعری ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق، طنز ومزاح ہو یا تقدیسی ادب، ہر شعبہ ادب میں غیر مسلم قلمکار، اردو کے ہر محاذ پر شامل رہے ہیں۔ کسی زبان کے پھلنے پھولنے کی اولین شرط بھی یہی ہوتی ہے کہ اسے قبولیتِ عام حاصل ہو۔ اردو کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی، اس کی وجہ محض یہی تھی کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان کے طور پر وجود میں نہیں آئی۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر آصفہ زمانی چیئر پرسن اتر پردیش اردو اکادمی نے اسٹار رائزنگ ویلفیئر فاؤنڈیشن، لکھنؤ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد سمینار 'اردو شعر وادب کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ' کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر شاداب عالم نے کہا کہ بیسویں صدی سے قبل دو تین سو برس کے عرصے پر محیط عہد میں مسلم شعرا و ادیبوں کے ساتھ ساتھ سیکڑوں غیر مسلم شعرا و ادیب بھی اردو زبان وادب کی آبیاری میں مصروف تھے۔ مہمان اعزازی عبدالسلام صدیقی نے کہا کہ اردو شعرا و ادبا کی ایک نسل ایسی بھی گزری جو آزادی سے قبل بھی فعال تھی اور آزادی کے حصول کے بعد بھی فعال رہی۔ اسی نسل کے شعرا و ادبا میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ہیں جن کے سیکڑوں اشعار زبان زدِ عام ہیں۔ مقالہ نگار ضیاء اللہ صدیقی ندوی، غفران نسیم، شکیل گیاوی اور ڈاکٹر سیما صدیقی نے اپنے قیمتی مقالوں میں کہا کہ اردو ادب میں چاہے وہ کوئی بھی صنفِ سخن ہو۔ غزل، افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، نظم ہر ایک میدان میں غیر مسلم شعرا اور ادبا نے اپنی حصہ داری رکھی اور نہایت ذمے داری کے ساتھ اردو ادب کو اپنی صلاحیتوں اور فن کو بخوبی بلندی پر پہنچایا۔ مقالہ نگار ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی و ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے کہا کہ اردو زبان کی خدمت مسلمانوں کے بعد سب سے زیادہ ہندوؤں نے کی۔ اردو شعر وادب کی ترقی کی تاریخ ہندوؤں کی خدمات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر سیما صدیقی نے بحسن وخوبی انجام دی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 فروری 2020

صحافت میں اردو کا کردار اور موجودہ چیلنجز

غازی آباد: اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب اور کلچر ہے، اردو محبت کی زبان ہے، اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے انٹرنیشنل جرنلزم سینٹر، ماروا

اسٹوڈیوز، فلم سٹی اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے 'صحافت میں اردو کی کارکردگی اور موجودہ چیلنجز' کے عنوان سے منعقدہ سمینار میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے صحافت کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ جس زبان میں بھی صحافت کی تعلیم حاصل کر رہے ہوں، لیکن اگر آپ ساتھ ہی اردو زبان بھی سیکھ لیں تو عملی میدان میں آپ کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے اور کہیں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی۔ انھوں نے کہا کہ صحافت سے وابستہ افراد کے لیے سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ الفاظ کے درست اور برمحل استعمال کی لیاقت رکھتے ہوں اور اردو زبان آپ کے اندر الفاظ کے درست استعمال پر قادر ہونے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اس موقع پر ایک بڑا اعلان کرتے ہوئے مارروا اسٹوڈیوز کے ذمے داروں سے کہا کہ اگر وہ اپنے طلبہ وطالبات کو اردو زبان کی تعلیم دلوانا چاہیں تو کونسل کی جانب سے اردو ڈپلوما کورس شروع کیا جا سکتا ہے، جس کا مکمل خرچ کونسل برداشت کرے گی۔

قبل ازیں اردو وہندی کے سینئر صحافی اقبال رضوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو اور ہندی پر جب بھی بات ہوتی ہے تو سیاست کا ذکر ضرور آجاتا ہے اور اسی وجہ سے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد گرچہ اسکولوں سے اردو کو نکالنے کی کوشش کی گئی مگر اس کے باوجود عوامی بول چال کی سطح پر اردو زبان باقی رہی اور آج خاص کر الیکٹرانک میڈیا اور سنیما میں اردو کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اردو زبان کی پہنچ روبروز بڑھ رہی ہے اور اسے سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ سہارا ٹی وی اردو کے ایڈیٹر لئیق رضوی نے کہا کہ اردو صحافت کی دو سو سال کی مضبوط روایت ہے۔ اردو صحافت نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر مولوی باقر پہلے صحافی تھے جنھیں انگریزوں نے شہید کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آج کی ہندی صحافت بھی اردو الفاظ کے بغیر نہیں کی جا سکتی، بلکہ اردو کو الگ کر کے کوئی اچھی اسکرپٹ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانی زبان ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اس زبان کے نمایاں اہل قلم اور صحافیوں میں مسلمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ہندوستان میں اردو صحافت بہتر حالت میں ہے اور اس وقت اردو ہندوستان کی تیسری ایسی بڑی زبان ہے جس میں پانچ ہزار اخبار نکل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دسیوں نیوز پورٹلز ہیں اور اردو چینلز بھی کامیابی سے چل رہے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کے بڑے اخبار غیر اردو گھرانے نکال رہے ہیں۔ قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ کے پولیٹیکل ایڈیٹر سید خرم رضا نے اپنے خطاب میں موجودہ وقت میں صحافت کو درپیش چیلنجز کی نشان دہی کرتے ہوئے، بالخصوص کر اردو زبان کے تعلق سے کہا کہ کسی بھی زبان کو اگر روزگار سے جوڑا جائے تو اس کا دائرۂ مقبولیت بڑھتا جاتا ہے، مگر چونکہ اردو زبان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، اس لیے ایک زمانے تک اس زبان کا دائرہ محدود رہا اور اس زبان کو مختلف سطحوں پر مسائل

کا سامنا رہا مگر اکیسویں صدی میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے ان مسائل کو کم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور نئی نسل بڑی تیزی سے اردو زبان کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے تمام دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

اس موقعے پر مشہور ریڈیو جاکی نوید نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان میں مہارت الگ بات ہے، مگر عام بول چال یا گفتگو کے دوران ہماری زبان آسان ہونی چاہیے اور بات کرنے کا انداز اچھا ہونا چاہیے۔ انھوں نے ریڈیو اور صحافت میں اپنے تجربات سامعین سے شیئر کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ اپنی گفتگو کا انداز بہتر بنانا چاہتے ہیں تو اردو زبان ضرور سیکھیے۔ اردو بہت شیریں اور میٹھی زبان ہے۔ سیمینار کی نظامت کا فریضہ مارواا سٹوڈیوز کے ڈائرکٹر آف براڈ کاسٹنگ سشیل بھارتی نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ سیمینار کے اختتام پر ادارے کی جانب سے تمام مہمانوں کو مومنٹو پیش کرکے ان کا اعزاز کیا گیا۔ روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 15 فروری 2020

اردو افسانوی ادب کے فروغ میں روہیلکھنڈ کا حصہ

رام پور: مرکز علم وفن سرزمین رام پور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رام پور کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام 'اردو افسانوی ادب کے فروغ میں روہیلکھنڈ کا حصہ' موضوع پر قومی سیمینار کا صدر شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی پروفیسر عراق رضا زیدی اور ڈائرکٹر رضا لائبریری ڈاکٹر حسن عباس نے شمع افروزی سے باضابطہ افتتاح کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد پروفیسر فاطمہ بیگم پروین نے کہا کہ رام پور اور روہیلکھنڈ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ماضی کا قیمتی سرمایہ یہاں کا علم و ادب، تہذیب وتمدن، اخلاق وعادات اور رہن سہن میں اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ مہمان خصوصی عراق رضا زیدی نے کہا ہے کہ شاعر، ادیب مستقبل کی بات کرتا ہے۔ صدر محفل ڈاکٹر حسن عباس نے کہا کہ ابتدائی دور میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بھی ناول لکھا ہے۔ افسانوی ادب میں آج بھی خدمات انجام دی جارہی ہیں جو ادیب، شاعر حساس ہوتے ہیں وہ اپنے افکار کو پیش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رضیہ پروین نے کہا کہ اردو ادب کے لیے رام پور اور روہیلکھنڈ میں بہت کام کیا گیا ہے۔ جس کا احسان مند ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ پرنسپل ڈاکٹر پی کے واشنی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید ارشد رضوی نے انجام دیے۔

روز نامہ 'بھاگیہ نگر ٹائمز'، 10 فروری 2020

ہندوستانی فارسی ادب میں صوفیائے کرام کی خدمات

نئی دهلی: انجمن فارسی ذاکر حسین دہلی کالج اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 2 روزہ قومی سیمینار بعنوان 'ہندوستانی فارسی ادب میں صوفیائے کرام کی خدمات' کا انعقاد کیا گیا۔ ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل پروفیسر مسرور احمد بیگ نے استقبالیہ کلمات کے ساتھ مہمانان گرامی کا استقبال کیا۔ اس دو روزہ قومی اجلاس کی صدارت پروفیسر راجندر کمار شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر نے کی۔ مہمان خصوصی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے سیمینار کے موضوع کے متعلق اپنا پیغام بھیجا جسے ڈاکٹر جمیل الرحمٰن نے پیغام پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر علیم اشرف خان شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے صوفیائے کرام اور صوفی سلسلے کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ سیمینار کے ڈائرکٹر جمیل الرحمٰن نے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں سیمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر علی رضا قزوہ نائب رایزن محترم فرہنگی جمہوری اسلامی ایران و ڈاکٹر احسان اللہ شکر اللہی مدیر محترم مرکز تحقیقات فارسی جمہوری اسلامی ایران نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت ڈاکٹر ملک سلیم جاوید نے انجام دی، جبکہ ڈاکٹر فرح ادیبہ نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ پہلی نشست کی صدارت پروفیسر علیم اشرف خان، ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر شہناز آرا بیگم نے کی۔ اس علمی جلسے میں چار مقالے پڑھے گئے جس میں ڈاکٹر غلام نبی، ڈاکٹر مہتاب جہاں، محمد ابراہیم وانی، شاہباز کے نام شامل ہیں۔ اس سیمینار میں کثیر تعداد میں مختلف شعبوں کے اساتذہ وطلبا نے شرکت کی۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 فروری 2020

اردو زبان میں ڈیجیٹل صحافت کے عصری تقاضے

کشن گنج: موجودہ دور میں ڈیجیٹل اردو صحافت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دی وائر اردو کے سابق ایڈیٹر اور آزاد صحافی مہتاب عالم نے کہا کہ اردو ڈیجیٹل صحافت کو زبان کے معاملے میں لبرل ہونا چاہیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی اشتراک اور نصیریہ فاؤنڈیشن، پناسی، اسلام پور (مغربی بنگال) کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سیمینار 'اردو زبان میں ڈیجیٹل صحافت کے عصری تقاضے' کے عنوان پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈیجیٹل صحافت ٹیکنالوجی پر منحصر ہے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی بالخصوص انٹرنیٹ پر مکمل دسترس اور ملٹی میڈیا کا صحیح استعمال ڈیجیٹل صحافت کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ معروف آر ٹی آئی ایکٹیوسٹ، نوجوان صحافی اور آن لائن نیوز پورٹل بیونڈ ہیڈ لائنز کے ایڈیٹر ان چیف افروز عالم ساحل نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈیجیٹل صحافت کے چار اجزائے ترکیبی ہیں۔ انفارمیشن یعنی مواد، پیکجنگ یعنی پیشکش، ٹیکنالوجی اور ریوینیو یعنی آمدنی، انھوں نے مزید کہا کہ آج کل جو خبریں ہم تک پہنچتی ہیں وہ دراصل سرکاری ایجنسیوں کے PR Products ہوتے ہیں۔ ایک صحافی کا بنیادی کام یہ ہے کہ اصل خبروں کو باہر نکال کر عوام تک پہنچائے۔ اس کام میں رائٹ ٹو انفارمیشن (معلومات کا حق) سب سے موثر ہتھیار ہے۔ معروف دانشور اور سماجی اور سیاسی رہنما اختر الایمان نے اپنے خطاب میں کہا کہ خبر انسان کی فطری ضرورت ہے۔ خبروں کے تعلق سے فکرمندی زندگی کی علامت ہے اور لاتعلقی موت ہے۔ سیمینار کے مہمان خصوصی کشن گنج کے ایس پی جناب کمار آشیش نے کہا کہ فری ڈیٹا کے اس دور میں جو باتیں خبروں کی شکل میں لوگوں تک پہنچائی جارہی ہیں وہ انتہائی قابل تشویش ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ڈیٹا فری ہو سکتا ہے لیکن ہماری مشترکہ تہذیب اور ثقافت فری نہیں ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ سوشل میڈیا کا غیر ذمہ دارانہ استعمال سماج کے لیے انتہائی مضر ہے اور یہ لاقانونیت پھیلاتا ہے لہٰذا خبروں کی ترسیل سے پہلے اپنی ذمہ داری اور اپنی حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 28 فروری 2020

نئی نسل میں اردو کی مقبولیت

مظفر نگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک روزہ سیمینار جن جاگرتی ایجوکیشن فاؤنڈیشن دہرادون کے زیر اہتمام نئی نسل میں اردو کی مقبولیت کے عنوان پر نیو دون ویلی پبلک اسکول کے سیمینار ہال میں منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی اتراکھنڈ مدرسہ بورڈ کے نائب رجسٹرار اخلاق احمد انصاری نے بولتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو اردو سے روبرو کرانے کی بہت ہی اہم ضرورت ہے۔ اردو زبان اپنے بے شمار الفاظ سے جانی جاتی ہے۔ اردو ہندوستان کی عام بول چال کی زبان ہے اترانچل اردو اکیڈمی کے چیئرمین انعام رمزی نے کہا کہ اردو ہندوستان کی عام زبان

ہے۔ سیمنار میں پروفیسر فیض عام ڈگری کالج میرٹھ، ڈاکٹر اسلم نے کہا کہ اردو زبان کو فروغ دینا ہماری ذمے داری ہے۔ سیمنار میں اردو صدائے حذیفہ کے چیف ایڈیٹر آصف حسین نے کہا کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے بعد آج روزگار حاصل کرنے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔ سیمنار میں اردو اسکالرز نور الٰہی، رہنما، ذاکر حسین، گولڈن ٹائمز اردو کے ایڈیٹر عارف نیازی، ملی ٹائمز اردو بیورو چیف تمنا خان اور نگم پارشد محترمہ تیزینہ وغیرہ نے نئی نسل میں اردو کی مقبولیت کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمنار کے آخر میں سوسائٹی کے صدر وسیم احمد، سکریٹری اشرف ہاشمی نے پروگرام میں شرکت کرنے والے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ اخبار مشرق دہلی، 28 فروری 2020

اردو شعر وادب کی ترقی میں غیر مسلم عاشقانِ اردو کا حصہ

برھانپور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے سیوا سدن کالج برہانپور کے شعبہ اردو فارسی کے زیر اہتمام 10,11 فروری 2020 بروز پیر منگل کو دو

روزہ قومی سیمینار بعنوان 'اردو شعر وادب کی ترقی میں غیر مسلم عاشقان اردو کا حصہ' پر سیمینار کا انعقاد سیوا سدن ایجوکیشن سوسائٹی کی صدر محترمہ تاریکا ورِیند سنگھ ٹھاکر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مہتاب عالم بھوپال، ڈاکٹر شاہ حسین احمد بہار، ڈاکٹر عارف ایوبی لکھنؤ، سکریٹری ہنس مکھ زری والا اور پرنسپل ڈاکٹر انیل کاپڑیا نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر یاسین گنائی کشمیر کی ضخیم تحقیقی تصنیف 'جامعہ کشمیر کی اردو خدمات' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اردو ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر، صدر شعبہ اردو فارسی ڈاکٹر ایس ایم ایس شکیل نے سبھی مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کالج، شعبۂ اردو فارسی، اردو تحقیقی مرکز اور سیمینار پر تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ اس سیمینار میں ہندوستان کی لگ بھگ سات ریاستوں سے 30 مقالہ نگاران نے چار ادبی اجلاس میں اپنے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر مہمانان نے اردو زبان کی ترقی میں غیر مسلم ادبا و شعرا کی خدمات پر مختلف حوالوں سے تفصیلی گفتگو کی۔ محترمہ تاریکا ورِیند سنگھ ٹھاکر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کسی مذہب، فرقے یا قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی زبان ہے جو یہیں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ معروف صحافی ڈاکٹر مہتاب عالم نے اپنے خطاب میں غیر مسلم صحافی اور یورپین شعرا پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عارف ایوبی (صدر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ) نے کہا کہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کتابی شکل میں میں شائع کرے گی۔ نظامت ڈاکٹر ایس ایم شکیل اور اظہار تشکر پروفیسر الطاف انصاری نے ادا کیا۔ دوسرے دن سہ پہر اختتامی اجلاس کا آغاز معروف شاعر وادیب ڈاکٹر شرف الدین صاحب ناگپور اور ڈاکٹر منگل مشرا کی موجودگی اور محترمہ تاریکا ورِیند سنگھ کی صدارت میں ہوا جس میں ڈاکٹر انیل کاپڑیا نے استقبالیہ کلمات ادا کیے۔ ڈاکٹر ایس ایم شکیل نے دوروزہ سیمینار کی روداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان شاء اللہ ہم آئندہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کریں گے۔ اپنی تقریر میں ڈاکٹر منگل مشرا نے اردو زبان کی مشترکہ تہذیب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان مقرر ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنے خطاب میں کہا کہ جس طرح اردو کے فروغ میں غیر مسلموں کا حصہ رہا ہے ویسے ہی مسلمانوں نے بھی ہندی کے فروغ میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ تاریکا ورِیند سنگھ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کی شیرینی اور مٹھاس ہمیں اتحاد کا پیغام دیتی ہے۔

تنویر رضا برکاتی، سکریٹری دارالسرور ایجوکیشن سوسائٹی برہانپور، 21 فروری 2020

ہندوستان میں ترجمہ نگاری: فن وروایت

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں 'ہندوستان میں ترجمہ نگاری: فن وروایت' کے موضوع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک و تعاون سے شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سمینار میں مجموعی طور پر تیس تحقیقی مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر عبدالحلیم ندوی لائبریری میں منعقدہ نشست اوّل کی صدارت پروفیسر اقبال حسین (حیدرآباد) نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب نے انجام دیے۔ اس نشست میں ڈاکٹر سبحان عالم خاں، ڈاکٹر محمد طارق، ڈاکٹر ثمامہ فیصل، ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے بالترتیب سید محمد حسنی بحیثیت مقالہ نگار، روائع اقبال کا اردو ترجمہ، سفرنامہ حج کا ترجمہ، نقوش اقبال، پروفیسر فاروق اور ان کی عربی اردو ترجمہ نگاری اور مولانا داؤد راز بحیثیت شارح بخاری شریف کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ جبکہ چائے کے وقفہ کے بعد نشست دوم کی صدارت پروفیسر محمد ایوب ندوی (سابق صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے انجام دیے۔ اس نشست میں ڈاکٹر عبدالملک، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر محمد اجمل، ڈاکٹر زرنگار، ڈاکٹر محمد طارق، ڈاکٹر منیر الاسلام، اور ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب نے بالترتیب ترجمہ نگاری میں دہلی کالج کی خدمات، عمانی شاعری کے ادبی ترجمے، شبلی نعمانی کی تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا عربی ترجمہ، منقسم وغیر منقسم ہندوستان میں سفرنامۂ ابن بطوطہ کے اردو ترجمے، ابن سینا کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، صفی الرحمٰن مبارکپوری کی الرحیق المختوم کا اردو ترجمہ اور سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کا اردو ترجمہ کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس میں پروفیسر اقبال حسین نے شعبۂ عربی کو اس سمینار کے لیے اہم موضوع کو منتخب کرنے پر مبارکباد دی۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی کے اساتذہ پروفیسر خالد حامدی، پروفیسر حبیب اللہ خان، ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر فوزان احمد، ڈاکٹر ہیفا، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، ڈاکٹر صہیب عالم، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن اور ڈاکٹر عظمت اللہ نے اپنے طویل تدریسی تجربات کی روشنی میں ترجمہ نگاری کے دوران پیش آنے والی مشکلات کے حل سے سامعین کو روشناس کرایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2020

ہندوستان میں عربی صحافت

نئی دھلی: عرب تعلقات بہت قدیم ہیں، دونوں ممالک کے تعلقات کے استحکام میں عربی صحافت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ کوئی بھی عربی زبان وادب اور صحافت کا مورخ ہندوستانی کی عربی صحافت کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ ان خیالات کا اظہار انڈیا عرب کلچرل سینٹر کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی نے کیا، وہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شعبۂ عربی ڈی یو میں منعقدہ دوروزہ قومی سمینار کی افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبہ پیش کررہے

تھے۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی، نظامت شعبہ عربی ڈی یو کے استاد اور سمینار کے کنوینر ڈاکٹر مجیب اختر نے کی۔ موضوع کا تعارف پروفیسر محمد نعمان خان صدر شعبۂ عربی ڈی یو نے کرایا، کلمات تشکر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے ادا کیے۔ افتتاحی تقریب کے بعد پہلی اکادمی نشست میں پروفیسر مجیب الرحمٰن، جے این یو، پروفیسر محمد اقبال حسین ندوی، ڈاکٹر محمد سلیم، ڈاکٹر محمد آفتاب، ڈاکٹر محمود عبدالرب مرزا اور ڈاکٹر محمد طارق نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2020

پروفیسر خورشید احمد فارق لیکچر سیریز کا تیرہواں یادگاری خطبہ

نئی دھلی: بہار ہر دور میں علم و ادب سے منور اور اہل فضل و کمال سے معمور رہا ہے، یہاں کی مقتدر شخصیات نے نہ صرف سلوک و تصوف بلکہ زبان و ادب کے فروغ میں بھی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ علم حدیث کے فروغ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی سے لے کر علامہ ظہیر احسن شوق نیموی تک اور عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں علامہ سید سلیمان ندوی سے لے کر مولانا مسعود عالم ندوی تک ایک زریں سلسلہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار عالمی رابطہ ادب اسلامی بہار شاخ اور مرکز تحقیقات اسلامی پٹنہ کے صدر ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن نے کیا۔ وہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقدہ پروفیسر خورشید احمد فارق لیکچر سیریز کا تیرہواں یادگاری خطبہ پیش کر رہے تھے۔ قبل ازیں توسیعی خطبے کا تعارف پروفیسر محمد نعمان خان صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر محمد اکرم نے پروگرام کی نظامت انجام دی۔ توسیعی خطبے کی صدارت پروفیسر محمد اقبال حسین سابق ڈین اسکول آف عرب اینڈ ایشین اسٹڈیز، انگلش اینڈ فارن لینگویج یونیورسٹی، حیدرآباد نے تشکر شعبہ کے استاد ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2020

جدید انفارمیشن ٹکنالوجی میں اردو کا استعمال

میرٹھ: جدید دنیا میں انٹرنیٹ کا جال پوری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس میں پوری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ یہ الفاظ پروفیسر جی، آر سید (شعبۂ ماس کمیونیکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کے تھے جو شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے پریم چند سمینار ہال میں خادم العوام ووکیشنل ایجوکیشن سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے باہمی اشتراک سے منعقد سمینار میں ادا کر رہے تھے۔ واضح ہو کہ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سمینار ہال میں خادم العوام ووکیشنل ایجوکیشن سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے باہمی اشتراک سے دو روزہ قومی سمینار 3 تا 4 مارچ بعنوان 'جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال: صورت حال اور امکانات' منعقد ہوا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر ابوارشد، حاجی وضاحت علی، محترم بھارت بھوشن شرما نے انجام دیے جبکہ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کیے۔ اس اجلاس کے تین ٹیکنیکل سیشن ہوئے جس میں نوید خاں، فرمان چودھری اور نوازش مہدی، شوبی زہرا نقوی، ڈاکٹر محمد کاظم اور ڈاکٹر یامین انصاری، اشتیاق سید نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور اظہار تشکر کے کلمات محترم محمد آصف نے ادا کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر جمال احمد صدیقی اور پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ خصوصی مقرر پروفیسر جی آر سید، مہمانِ ذی وقار محترم سید معراج الدین شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2020

فارسی کے فروغ میں خواتین کا نمایاں رول

حیدر آباد: فارسی کے فروغ میں خواتین کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مردوں کا۔ عہد وسطیٰ میں ہمیں بڑے پیمانے پر ایسی خواتین نظر آتی ہیں جنھوں نے ادب و ثقافت کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام مغل حکمراں ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا ہے جس نے ہمایوں نامہ لکھا۔ اس طرح انھیں ہندوستان میں پہلی تاریخ نویس خاتون قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز اسکالر پروفیسر آذرمی دخت صفوی، مشیر، پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبہ فارسی کے زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ اس کانفرنس کا عنوان فارسی زبان، ادب، سائنس، فن، تہذیب اور ثقافت کے فروغ میں خواتین کا حصہ تھا۔ اسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ پروفیسر ایوب خان، وائس چانسلر انچارج نے صدارت کی۔ پروفیسر ایوب خان وائس چانسلر انچارج نے موضوع کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں اس طرح کے موضوعات کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کسی بھی دیے گئے کام میں اکثر مردوں سے بہتر ثابت ہوتی ہیں۔ مولانا رحیم الدین انصاری، صدر نشین تلنگانہ اردو اکادمی نے کہا کہ خواتین پر سمینار یقیناً ضروری ہے۔ پروفیسر عزیز الدین، سابق ڈائرکٹر، رضا لائبریری، رام پور نے کہا کہ جاگیردارانہ نظام کے باعث خواتین کو تعلیم سے دور کر دیا گیا۔ ڈاکٹر علی رضا قزوہ، نائب ثقافتی قونصل، ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی نے کہا کہ انقلاب ایران کے بعد ایران میں خواتین کا رول بڑھ گیا ہے۔ پروفیسر احمد جان فرانکوف، تاشقند، ازبکستان نے بھی خطاب کیا۔ پروفیسر عزیز بانو، ڈائرکٹر سمینار نے خطبہ استقبالیہ میں کہا کہ فارسی کے فروغ میں خواتین کا اہم رول ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 مارچ 2020

طریقۂ تحقیق میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال

حیدر آباد: 11,12 فروری 2020 کو دو روزہ قومی سمینار بہ عنوان 'طریقۂ تحقیق میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال' قومی اردو کونسل کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر بیگ احساس نے کہا ''محقق کا کام ہوتا ہے کہ تحقیق کے ذریعہ حقیقت کی بازیابی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی تلاش کرنے کا حکم دیا ہے''۔ اپنی صدارتی تقریر میں عابدہ انعامدار نے کہا کہ ''غور و فکر، تفکر کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود دیا ہے۔ اسی غور و فکر نے نت نئی ٹکنالوجی کو ایجاد کیا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ اس کا صحیح استعمال کریں۔ مقالہ نگاروں نے بھی مختلف موضوعات کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ جدید ٹکنالوجی کا استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے۔'' اجلاس کی صدارت پروفیسر فضل اللہ مکرم صدر شعبۂ اردو سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد اور قمر صدیقی ایسوی ایٹ پروفیسر، ممبئی یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے صدارتی کلمات میں ریسرچ اسکالرس اور مقالہ نگاروں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ڈاکٹر لطیف انصاری، رفیق جعفر، ڈاکٹر دانش غنی، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر محمد سمیع الدین اور ڈاکٹر عظمت دلالا نے اپنے پر مغز مقالے پیش کیے۔ ابتدا میں ڈاکٹر نسیم مظفر نے سمینار کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ نائب صدر شاہدہ سید نے استقبالیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عظمت دلالا نے نظامت کی اور عظمیٰ تسنیم صدر شعبۂ اردو کے شکریے پر سمینار اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: عظمیٰ تسنیم، صدر شعبۂ اردو، حیدرآباد، 14 فروری 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

شش روزہ ساہتیہ اکادمی اُتسو 2020

نئی دھلی: ساہتیہ اُتسو 2020 کا آغاز سال 2019 کی اکادمی سرگرمیوں کی نمائش سے ہوا جس کا افتتاح ہندی کی معروف ادیبہ منو بھنڈاری نے کیا۔ افتتاح سے قبل اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے ان کا خیر مقدم کیا اور اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے خیر مقدمی کلمات سے نوازا۔ ڈاکٹر راؤ نے بتایا کہ ساہتیہ اکادمی نے سال 2019 میں 24 ہندستانی زبانوں میں 484 کتابیں شائع کیں جن میں 239 نئی کتابیں اور 245 کتابوں کے نئے ایڈیشن شامل ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پچھلے سال کل 715 ادبی پروگراموں کا انعقاد عمل میں آیا جن میں صدی تقریبات، سمینار، سمپوزیم، ورکشاپ وغیرہ شامل ہیں۔ افتتاح کے بعد شمالی ہند میوزیکل انسٹرومنٹ کی مترنم آوازوں کے درمیان شمع روشن کی گئی۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کی 24 زبانوں کے کنوینز اور دیگر ممبران کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادیب موجود تھے۔ دوپہر ڈھائی بجے سہ روزہ آل انڈیا آدیواسی ادیب کانفرنس کا آغاز ہوا جس کا افتتاح معروف ادیبہ انویتا ابّی نے کیا۔ اپنے خیر مقدمی کلمات میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے کہا کہ آدیواسی ادب میں روایتی علم کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے اس علمی ذخائر کو محفوظ رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے تاکہ یہ لمبے وقت تک زندہ رہ سکیں۔ اپنی افتتاحی تقریر میں پروفیسر انویتا ابّی نے کہا کہ آدیواسی زبانی ادب، لوک ادب کی روایت کی ہی ایک کڑی ہے، جس میں ہماری روزمرہ کی زندگی ندی کے دھارا کی طرح رواں ہوتا ہے۔ زبانی ادب کو کبھی مرنے نہیں دینا چاہیے۔ اسے اسکول کے نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔ کانفرنس کے دوسرے سیشن 'شعری نشست' کی صدارت چندر کانت مراری سنگھ نے کی جن میں چ. سوتے آئی مول، ملکیشور کینپر ائی، مرتھنارک کے. مارن، روپ لال لمبو اور نگورانگ رینا نے آئی مول، دیماسا، گارو اور لمبو زبانوں کی نمائندگی کی۔

جشن ادب 2020 کے دوسرے دن شام کو کمانی آڈیٹوریم میں ساہتیہ اکادمی کا پروقار ادبی ایوارڈ تقسیم کیا گیا۔ اس سال اردو کا انعام شافع قدوائی کو ان کی کتاب 'سوانح سرسید : ایک بازدید' کے لیے دیا گیا۔ انعام یافتگان میں جے شری گوسوامی مہنت (آسامی)، چھنے گوہا (بنگالی)، پھوکن چ بسوماتاری (بوڈو)، آنجہانی اوم شرما (ڈوگری)، ششی تھرور (انگریزی)، رتی لال بوری ساگر (گجراتی)، نند کشور آچاریہ (ہندی)، وجیا (کنڑ)، عبدالاحد حاجنی (کشمیری)، نلبا اے کھانڈیکر (کونکنی)، کمار منیش اروند (میتھلی)، وی مدھوسودن نائر (ملیالم)، بیرل تھانگا (منی پوری)، انورادھا پاٹل (مراٹھی)، سلون کارتھک (نیپالی)، ترون کانتی مشر (اڑیہ)، کرپال کزاک (پنجابی)، رام سوروپ کسان (راجستھانی)، پینا مدھوسودن (سنسکرت)، کالی چرن ہیمبرم (سنتالی)، ایشور مورجانی (سندھی)، چ دھرمن (تامل)، بانڈی نارائن سوامی (تیلگو)۔ مہمان خصوصی ممتاز نغمہ نگار اور فلم ڈائریکٹر گلزار نے اپنی جامع تقریر میں ہندستانی زبانوں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ یہ زبانیں ایک علاقے یا ایک کمیونٹی کی نمائندگی نہیں کرتیں بلکہ ان سے ایک کلچر بندھا ہوا ہے۔ آخر میں اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر مادھو کوشک نے سبھی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سبھی زبانوں کے ادیبوں کا سماجی سروکار ایک ہی ہے۔ ادیبوں کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے۔ آل انڈیا آدیواسی ادیب کانفرنس کے دوسرے دن میں اوونڈ سی کریپا، منگلہ گروال اور انوج موہن پردھان نے الگ الگ سیشن کی صدارت کی۔ جبکہ مقالہ نگاروں میں چوکی بھوٹیا، گنگا سہائے مینا، شری کرشن جی کاکڑے، ایس ناگ ملیشور راؤ، انجلی بیلاگل، رام گوپال رام لال بھلاویکر، واہون مون ای کھرسنٹیو، سارگم کواسی، املتا ملی، سریش حسین راؤ بلاڈے، سائی مون رونگلو، شفالی دیو ورما، اونیشا پاٹھاو، ایل سولومن ڈاڑسوا اور شنوئی موزلیس تراؤ کا نام شامل ہے۔ پروتری پروگرام کا افتتاح معروف منی پوری شاعرہ ارمبم میم چوبی نے کیا جبکہ افتتاحی اجلاس کی صدارت اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے کی اور سکریٹری ساہتیہ اکادمی ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے خیر مقدمی کلمات سے نوازا۔ اس پروگرام کے تین اجلاس ہوئے جن میں مختلف زبانوں کے ادیبوں نے اپنی کہانیاں اور شاعری پیش کی۔ اردو کی نمائندگی شارق کیفی نے کی جبکہ کرن کمار، انامیکا اور کرپی ڈیکا ہزاریکا نے الگ الگ اجلاسوں کی صدارت کی۔

جشن ادب 2020 کے تیسرے دن انعام یافتہ ادیبوں سے ملاقات پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا جس میں 24 ہندستانی زبانوں کے اکادمی انعام یافتہ ادیبوں نے اپنے تخلیقی سفر پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام کی صدارت اکادمی کے نائب صدر مادھو کوشک نے کی۔ 'ڈرامہ نگاری کی موجودہ صورتِ حال' پر پینل گفتگو پروگرام کا افتتاح معروف راجستھانی ادیب اور نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے موجودہ چیئرمین ارجن دیو چارن نے کیا۔ انھوں نے ہندستانی نسائی روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی روایت کا پابند ہونا کسی بوجھ کو ڈھونا نہیں ہے بلکہ کوئی روایت اپنے آپ کو حال میں ڈھالنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ اس پروگرام کے دوسرے سیشن کے صدارت کرشن منولی نے کی جبکہ اتھوکم کھولچند رسنگھ (منی پوری)، سپن جیوتی ٹھاکر (آسامی)، شفاعت خاں (مراٹھی) اور سمن کمار نے ہندی ڈرامہ نگاری کی موجودہ صورت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

جشن ادب 2020 کے چوتھے دن سہ روزہ قومی سمینار بعنوان 'علاقائیت، ماحولیات اور ادب'، ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ منتخب ادیبوں سے بات چیت اور LGBTQ شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ قومی سمینار کا افتتاح معروف کنڑ ادیب اور ساہتیہ اکادمی کے فیلو ایس ایل بھیرپا نے کہا کہ مغرب کے لوگ انسان کی صحت کے لیے پیڑوں اور جنگلوں کو بنائے رکھنے کی وکالت کرتے ہیں، جبکہ ہندستانی عقیدے فطرت کے ساتھ اپنے روحانی لگاؤ کو بنائے رکھنے کے لیے یہی کام کرتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ امت چودھری نے دیا اور صدارتی خطبہ اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے دیا۔ سمینار کے اگلے سیشن کی صدارت اکادمی کے سابق صدر وشوناتھ پرساد تیواری نے کی اور کہا کہ انھوں نے کالیداس کی سنسکرت عبارتوں میں ہمالیہ کی خوبصورتی کے کچھ دلکش مناظر پر بات کرتے ہوئے کہا

خبر نامہ

کہ ہمیں فطرت کو انسان کا درجہ دینا ہوگا تبھی ہم اسے بچا پائیں گے۔ شاید وہ دنیا کے آخری بلند پایہ شخص تھے جنھوں نے ماحولیاتی تحفظ کو اپنا اہم موضوع بنایا تھا۔ سیمنار کے تیسرے اجلاس کی صدارت دامودر موزو نے کی جبکہ چوتھے اجلاس کی صدارت اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ ’آمنے سامنے‘ پروگرام کے تحت آج بنگلہ، گجراتی، ہندی، ملیالم اور اردو کے ایوارڈ یافتہ ادیبوں سے بات چیت ان زبانوں کے معروف ادیبوں نے کی۔ ساہتیہ اکادمی کے ذریعہ دوسری بار منعقد LGBTQ شعری نشست میں خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے کہا کہ ہم لوگ ہندوستان کے سبھی شاعروں کا بلاتفریق احترام کرتے ہیں اور انھیں منچ پر جگہ دیتے ہیں۔ نشست کے مہمان خصوصی اور انگریزی کے معروف شاعر ہوشانگ مرچنٹ نے اپنی تین نظموں کی قرأت کی۔ آر راج راؤ نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس پروگرام کے اگلے اجلاس کی صدارت وکرمادتیہ سہائے نے کی اور دس LGBTQ شاعروں آدتیہ انگرس، چاندنی، گریش، شانتا کھورائی، ریشما پرساد، عبدالرحیم، آکاش (رائے) دت چودھری، توشی پانڈے، وشال پنجابی، الگو جگن اور ڈینیل مینڈ یکا نے اپنے کلام پیش کیے۔

جشن ادب 2020 کا چھٹا اور آخری دن بچوں اور نوجوان ادیبوں کے نام رہا۔ بچوں کے لیے آج مختلف ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں نظم نگاری کا مقابلہ، افسانہ نگاری کا مقابلہ، تصویر سازی کا مقابلہ اور ادب اطفال کے ادیبوں کے ذریعہ کہانیاں سنانے جیسی کئی تقریبات ہوئیں۔ ہندوستان میں اشاعت کی موجودہ صورت حال پر منعقد پینل گفتگو کا افتتاح نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین گووند پرساد شرما نے کیا۔ اپنے افتتاحی خطبے میں انھوں نے کہا کہ کتابوں کو عام لوگوں سے جوڑنے کا چیلنج آج بہت اہم ہے۔ اس کے لیے ادیبوں کو بھی آگے آ کر قارئین کو کھوجنا ہوگا۔ پروگرام کے اگلے اجلاس کی صدارت معروف انگریزی ادیب نزل کانتی بھٹاچاریہ نے کی اور کارتیکا وی کے، آدیتی مہیشوری، پریتی شنائے اور پربیتا ست پتی نے حصہ لیا۔ کارتیکا وی کے نے کہا کہ نوجوان نسل کی اولیت میں اب کتابیں نہیں ہیں۔ ہمیں نئے ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے قاری کی بھی ضرورت ہے۔ انھوں نے علاقائی زبانوں کے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے کچھ برسوں میں اچھا ادب یہیں سے آیا ہے۔ وانی پرکاشن کی نمائندگی کر رہی آدیتی مہیشوری نے کہا کہ دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی اس میدان میں سرکاری امداد کی ضرورت ہے۔ پریتی شنائے نے کہا کہ ادیبوں کو بھی قارئین کی دلچسپی کو دھیان میں رکھتے ہوئے کام کرنا چاہیے۔ اپنے صدارتی خطبے میں نزل کانتی بھٹاچاریہ نے کہا کہ درسی کتب کی اشاعت میں بھی اگر ادبی پبلشرز سے مدد لی جائے تو اس میدان میں آ رہی گراوٹ کو روکا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہندستانی زبانوں کے تراجم کو زیادہ شائع کرنے کی اپیل کی۔ اگلا سیشن معروف شاعر ارون کمال کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں آلوک شریواستو اور ارندھتی سبرمنیم نے شعری تصانیف کی اشاعت کی موجودہ حالت پر بات چیت کی۔ ارون کمل نے صدارتی خطبے میں کہا کہ شاعری پچھلے کچھ برسوں میں زیادہ جمہوری ہوئی ہے۔ کوئی بھی سماج تبھی تک زندہ رہے گا جب تک اس کے لوگ شاعری کرتے رہیں گے۔ انھوں نے ملیالم، مراٹھی اور بنگلہ میں شاعری کی اچھی فروخت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی، اردو اور اڑیہ میں شعری مجموعوں کی فروخت کم ہوئی ہے۔ نئی فصل عنوان سے نوجوان ادیبوں کا قومی کانفرنس کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس کا افتتاح معروف کنڑ ادیب سدّ لنگیا نے کیا۔ آسامی ادیب دھروجیوتی بورا نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کے پی رام منّی، گورہری داس، رام کمار مکھوپادھیائے، پرکاش بھاتمبریکر اور شین کاف نظام نے کی۔ ساہتیہ اکادمی کے سالانہ ادبی پروگرام ’جشن ادب‘ کو کامیاب بنانے میں اس کے ملازمین کے شب و روز کی محنت شامل رہی۔

پریس ریلیز، موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 25 تا 30 فروری 2020

دھلی : ———————————

غالب کی یاد میں غزل سرائی

دھلی: مرزا اسداللہ خاں غالب کی یاد میں غزل کی ایک شام بعنوان ’انداز بیاں‘ دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد کی گئی جس میں ملک کی نامور شخصیات کی موجودگی میں ملکۂ ترنم انیتا سنگھوی نے غالب کی متعدد غزلیں پیش کیں۔ جشن کے افتتاح میں پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو غزل محبت کے پیغام کو عام کرتی ہے۔ اس دوران ڈاکٹر محسن ولی اور بیگم فروغ نام نے گلدستہ پیش کر کے مہارانی کرن سنگھ، سابق گورنر اور ہوم سکریٹری وی کے دوگل، سابق گورنر سبط رضی، جسٹس منموہن سنگھ، جسٹس بی اے خاں، ہمدرد کے چانسلر سید شاہد مہدی کا استقبال کیا۔ معروف مصور ڈاکٹر علی جعفر نے مرزا غالب کی تصویر فخر ہند انیتا سنگھوی کو پیش کی۔ سینٹر کی جانب سے اس سال کا فخر ہند اعزاز سماجی کارکن نینا پوری، شاعر سنجے جین، پی ایف کمشنر الوک یادو، عالمی شہرت یافتہ مصور ڈاکٹر علی جعفر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر جمشید کمال کو دیا گیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عباس رضا نیر جلالپوری نے انجام دیے۔ دیگر معززین میں سابق گورنر ایم پی سنگھ، سابق چیف جسٹس آف انڈیا رامیش چندلہوتی، جسٹس وزیری، جسٹس راج کپور، کمشنر ارکے سنگھ، رخشندہ جلیل، جسٹس بشیر، سابق کمشنر قمر احمد زیدی، پولس کمشنر چودھری، انکم ٹیکس چیئرمین ابرار احمد و دیگر شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ ’میرا وطن‘، دہلی 24 فروری 2020

طب یونانی: مسائل و وسائل

نئی دھلی: ورلڈ یونانی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ’طب یونانی: مسائل و وسائل‘ کے عنوان سے ایک نیشنل سیمنار کا انعقاد جامعہ ہمدرد کے کنونشن سینٹر میں کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ہمدرد میں اسکول آف یونانی میڈیسن کے ڈین پروفیسر آفتاب احمد نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید محمد فیصل اقبال نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر حکومت ہند نیشنل میڈیسن پلانٹ بورڈ کے سی ای او ڈاکٹر جے ایل این شاستری نے شرکت کی۔ جبکہ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد خالد (اے ڈی سی) دہلی حکومت، پروفیسر محمد ادریس پرنسپل طبیہ کالج قرول باغ نے بھی شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر خبیب احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ڈاکٹر محمد اکرم نے تمام مہمانان کا استقبال گلدستہ پیش کر کے کیا۔ ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی سابق ڈائرکٹر (سی آر آئی یو ایم لکھنؤ) نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ سچائی تو یہ ہے کہ پچاس سال پہلے معاشرے کے وہی افراد درس و تدریس سے وابستہ ہوتے تھے، جن کا ذہنی رجحان طب یونانی کی طرف ہوتا تھا اور وہ اس میدان میں اپنی فکر رکھتے تھے، ان میں پڑھنے پڑھانے پر گہری مناسبت ہوتی تھی۔ پروفیسر آفتاب احمد نے اپنے صدارتی خطبے میں یونانی میڈیسن کے فائدے اور موجودہ حالات میں اس کی ضرورت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد خالد نے کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم مسائل پر کم بات کریں وسائل پر زیادہ زور دیں لیکن ساتھ ہی مسائل کی تلاش کریں اور ان کا حل نکالنے کی کوشش کریں۔ ڈاکٹر محسن دہلوی نے تمام مہمانان، سینئر فیکلٹیز جامعہ ہمدرد اور میڈیکل افسران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے اطبا نے جو کچھ ہمیں

طب کے حوالے سے دیا ہے۔ ہم اس کی حفاظت کریں اور اس میدان میں اور بہتری لائیں تبھی ہم طب یونانی کا حق ادا کرسکیں گے۔ اس موقعے پر ایل ای ڈی اسکرین پر سوینئر کا اجرا کیا گیا۔ بعد ازاں مرتب ڈاکٹر وسیم اعظمی کی کتاب وفیات اطبا ہندوپاک جلد اول کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سیمینار کنوینز ڈاکٹر نازش احتشام اعظمی، ڈاکٹر اجمل اخلاق، طاہر بن صادق، مونس دہلوی رہے۔ اہم شرکا میں ڈاکٹر کلاڈیہ پرکل، ڈاکٹر یونس منشی (کلکتہ)، ڈاکٹر مصباح الدین، ڈاکٹر اظہر (علی گڑھ)، ڈاکٹر رضا احمد (دہلی حکومت) کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 فروری 2020

معاصر ادب کے ترجمے کے ذریعے ہندوستان و مصر کے ثقافتی روابط

نئی دھلی: آل انڈیا بھی ٹیٹ سینٹر، لودھی روڈ کے گل موہر ہال میں ہندوستان میں مصری سفارت خانہ کی طرف سے ڈاکٹر محمد قطب الدین کے ترجمہ کردہ ناول 'تتلی کے پر' اور کہانی 'چاند کے اس پار' کے حوالے سے بعنوان 'معاصر ادب کے ترجمہ کے ذریعے ہندوستان و مصر کے ثقافتی روابط' ایک مکالمہ منعقد ہوا۔ پروگرام کے کنوینز مصری سفارت خانہ کے کلچرل اور ایجوکیشنل کونسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد شکرندا نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے ہندوستان اور مصر کے قدیم تہذیبی تعلقات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ حالیہ مصری کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے جیسے 'تتلی کے پر' اور 'چاند کے اس پار' اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ اس موقعے پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد قطب الدین نے کہا کہ ہر زمانہ میں ترجمہ نے انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے، خاص طور سے ہندوستان اور مصر کے بیچ ادبی ترجموں نے باہمی ثقافتی اور سیاسی تعلقات کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مصر میں واقع مولانا آزاد مرکز برائے ہندوستانی ثقافت کے سابق ڈائرکٹر و پروفیسر ڈاکٹر آفتاب کمال پاشا نے دونوں ملکوں کے بیچ ہزاروں سال پرانے ثقافتی روابط پر گفتگو کی اور کہا کہ ان تعلقات کی تاریخ مستند ہے، اس لیے اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی مصر کے مشہور ناول نگار محمد سلماوی نے بذریعہ ویڈیو کانفرنس کہا کہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے بھلے ہی دونوں ملکوں نے زیادہ ترقی نہ کی ہو لیکن تہذیبی اور ثقافتی میدان میں دونوں ملک ہمیشہ سے آگے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں میں ادب کا نوبل انعام پانے والے نجیب محفوظ اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ادبی تخلیقات کا ترجمہ وقت کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام میں انڈیا عرب کلچر سینٹر کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر ذکرالرحمٰن، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر حبیب اللہ خاں اور فلسطینی سفارت خانہ کے مندوبین موجود تھے۔ پروگرام کے اخیر میں ہندوستان میں مصری سفارت خانہ کے نائب سفیر خالد شاذلی نے مصری سفیر ہبہ المراسی کا پیغام پہنچایا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 فروری 2020

ذاکر حسین کالج میں توسیعی خطبوں کا انعقاد

نئی دھلی: ذاکر حسین کالج ایوینگ کے شعبۂ فارسی و عربی کے زیر اہتمام مشترکہ طور پر کیمپس میں توسیعی خطبوں کا اہتمام کیا گیا، جن میں شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر عراق رضا زیدی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے پروفیسر عبدالماجد قاضی نے بحیثیت خطیب شرکت کی۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے فارسی ادب میں شعریات کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کیا، انھوں نے اپنے خطبے میں ہندوستانی فارسی شاعری، اس کے عروج و زوال اور ایران و خراسان کے شعرا سے ہندوستانی شعرا کا موازنہ کیا۔ جبکہ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے مشرقی ثقافت پر عربی زبان کا اثر کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ ہندی زبان میں تقریباً پانچ ہزار الفاظ عربی کے مستعمل ہیں، انھوں نے کہا کہ قلم، کرسی اور انسان جیسے الفاظ بکثرت مستعمل ہیں جو کہ اصلاً عربی کے الفاظ ہیں۔ خطبہ کی صدارت پروفیسر راجندر کمار صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی نے کی۔ پروگرام کا آغاز شعبۂ عربی ذاکر حسین کالج کے استاد ڈاکٹر ظفیر الدین نے تلاوت کلام اللہ سے کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر فوزیہ (شعبۂ فارسی) نے توسیعی خطبے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر مرزا مسرور بیگ نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے عربی و فارسی کے تعلق سے اپنے دیرینہ تعلقات و محبت کا اظہار کیا اور فارسی و عربی کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ نظامت مشترکہ طور پر ڈاکٹر ظفیر الدین، ڈاکٹر نازنین و ڈاکٹر خورشید احمد نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 فروری 2020

جامعہ اسکالر یورپی پارلیمنٹ فیلوشپ پروگرام کے لیے منتخب

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مرکز سروجنی نائیڈو برائے مطالعات خواتین سے وابستہ پی ایچ ڈی اسکالر راہل کپور کو یورپی پارلیمنٹ فیلوشپ پروگرام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یوروپی پارلیمنٹ کے ذریعے دو ہفتوں تک مکمل طور پر اسپانسر شدہ فیلوشپ پروگرام میں برسلز میں یوروپی پارلیمنٹ میں تربیت اور انسانی حقوق نیز جمہوری رویوں کے لیے یورپین انٹر یونیورسٹی کے زیر اہتمام وینس اسکول آف ہیومن رائٹس یہ پروگرام منعقد کررہی ہے۔ وینس اسکول آف ہیومن رائٹس کے پروگرام میں صنفی مساوات، انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے افراد کے مقالات اور حقوق اطفال سے متعلق لیکچرز، ورکشاپس اور سیمینارز شامل ہیں۔ پروگرام میں ممتاز ماہرین تعلیم، انسانی حقوق کے کارکنان، غیر سرکاری تنظیموں کے نمائندے، یورپی پارلیمنٹ کے ممبر اور دیگر نامی گرامی شخصیات شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 فروری 2020

عربی ادبیات میں ہندوستان کی منظر کشی

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے زیر انتظام اور پروفیسر رضوان الرحمٰن کی ڈائرکٹر شپ میں 'عربی ادب میں ہندوستان کی منظر کشی' کے عنوان پر تین روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ ساتھ مختلف عرب ممالک کی مشہور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ہندوستان اور عرب کے تعلقات قدیم زمانے سے رہے ہیں۔ ان کی جڑیں ماقبل اسلام تک جاتی ہیں، عرب تاجروں کی آمد و رفت تاریخی طور پر تسلیم شدہ ہے، ہر دور میں عرب اور غیر عرب علما، مفکرین، سیاحوں، شاعروں اور مورخین مثلاً البیرونی اور ابن بطوطہ وغیرہ نے اپنی تخلیقات، تصنیفات اور سفرناموں میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، علوم و حکمت، مختلف زبانوں اور مذاہب وغیرہ کا تذکرہ بڑے عمدہ اسلوب او رپیرائے میں کیا ہے، 'اس کانفرنس کا مقصد مذکورہ چیزوں کو جدید علمی اور تحقیقی انداز میں نئی نسل اور خاص طور پر علم دوست طبقے کے سامنے پیش کرنا تھا۔ افتتاحی تقریب میں مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر حبیب اللہ خان صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، پروفیسر محمد شکرندی کلچرل اینڈ ایجوکیشنل کونسلر مصری سفارت خانہ نئی دہلی، پروفیسر مظہر آصف جے این یو، پروفیسر معین الحسن جے این یو اور پروفیسر ستیش چندر کروئی رجسٹرار 2 جے این یو نے شرکت

کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کانفرنس کے موضوع کی اہمیت اور علمی قدر و قیمت پر زور دیتے ہوئے اس کو سراہا۔ بعدازاں پہلی علمی نشست ہوئی جس میں ڈاکٹر یسری حسام الدین انیس جرار، امریکن یونیورسٹی دبئی، ڈاکٹر سعد جمعہ فرحان، بیان یونیورسٹی اربیل عراق، ڈاکٹر مصلح عبدالفتاح نجار، ہاشمی یونیورسٹی اردن اور ڈاکٹر زرنگار جے این یو نے مرکزی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اپنے اپنے بیش قیمت تحقیقی مقالات پیش کیے۔ ظہرانے کے وقفے کے بعد دوسری اور تیسری نشستیں ہوئیں اور مختلف مقامی اور بیرونی ممالک کے اسکالروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے دن اس کانفرنس کی مجموعی طور پر تین نشستیں ہوئیں جن میں ملک اور بیرونی ممالک کے تقریباً 15 اسکالروں نے اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے، جن میں شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے پروفیسر قاضی عبدالماجد نے آج کی پہلی نشست کے صدر کی حیثیت سے شرکت کی، اسی طرح نمایاں اسکالروں میں پروفیسر براء صفوان عبدالغنی جامعہ ازہر مصر اور ڈاکٹر امامہ مصطفیٰ لواتی سلطان قابوس یونیورسٹی مسقط عمان شامل ہیں۔ کانفرنس کے آخری دن دو نشستیں ہوئیں جن کی صدارت پروفیسر مجیب الرحمٰن جے این یو نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر سعید الرحمٰن عالیہ یونیورسٹی کولکاتا نے کی، اس نشست میں پانچ مقالے پڑھے گئے جبکہ آخری نشست تاثرات کے اظہار اور تقسیم اسناد برائے شرکا خاص تھی جس میں کانفرنس کے شرکا نے اپنے اپنے تاثرات اور خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 فروری 2020

یونانی طب پر دو روزہ عالمی کانفرنس

نئی دہلی: سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم)، وزارت آیوش حکومت ہند کے ذریعے راجدھانی دہلی کے وگیان بھون میں منعقد یونانی ڈے تقریبات اور یونانی طب پر دو روزہ عالمی کانفرنس کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ کانفرنس میں یونانی طب کی خصوصیات اور انفرادیت کو اجاگر کیا گیا اور عالمی سطح پر یونانی طب کے فروغ کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی۔ اس موقعے پر راجناتھ سنگھ نے اپنے خطاب میں کہا کہ یونانی طب ایک منفرد نظام طب ہے جسے صدیوں پر محیط مختلف تہذیبوں نے پروان چڑھایا ہے۔ یہ نظام طب کفایتی اور دور دراز علاقوں میں بھی دستیاب ہونے کے سبب عوام کی طبی ضرورتیں پوری کرتا رہا ہے اور بہت ہی مقبول ہے۔

ڈاکٹر جتیندر سنگھ نے اس موقعے پر کہا کہ پچھلے کچھ سالوں میں حکومت ہند نے دیسی طبی نظاموں کے فروغ و ارتقا پر خصوصی توجہ دی ہے اور یونانی طب سے متعلق بہت سے ادارے قائم کیے ہیں۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں ویدراجیش کوٹیچہ نے دیسی طبی نظاموں کے فروغ میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے استعمال پر زور دیا اور اس سلسلے میں وزارت آیوش کی پیش رفت پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی تقریب کے دوران معزز مہمانوں نے کانفرنس کے یادگاری مجلّہ اور سی سی آر یو ایم دو اہم مطبوعات کا اجرا کیا۔ پروفیسر سید احتشام حسنین، وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی نے کہا کہ یونانی طب ایک بہت ہی مقبول اور مفید نظام طب ہے لیکن اس کے اصولوں اور بنیادوں پر جدید انداز سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر جاوید مسرت، وائس چانسلر، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، جموں و کشمیر نے کہا کہ حکیم اجمل خان کے یوم پیدائش کی یونانی ڈے کے طور پر منانے کا فیصلہ وزارت آیوش کا قابل ستائش قدم ہے۔ انھوں نے یونانی طب میں جدید تحقیق کی ضرورت پر زور دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 فروری 2020

سائنس اور خواتین

نئی دہلی: جامعہ ہمدرد میں یوم قومی سائنس منایا گیا جس کے تحت 'سائنس میں خواتین' لیکچر منعقد کیا گیا جس میں سائنس اینڈ انجینئرنگ ریسرچ بورڈ (ایس ای آر بی) حکومت ہند نے اس موضوع پر خطاب کیا اور اپنے تجربات شیئر کر کے بتانے کی کوشش کی کہ خواتین سائنس میں کس طرح اپنا تعاون پیش کرسکتی ہیں۔ تقریب کی صدارت وائس چانسلر جامعہ ہمدرد ڈاکٹر سید احتشام حسنین نے کی جبکہ استقبالیہ پرو وائس چانسلر جامعہ ہمدرد ڈاکٹر احمد کمال نے کیا۔ لیکچر سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سندیپ کمار نے کہا کہ سائنس دانوں کی حیثیت سے، خواتین بہت سے شعبوں میں اچھی کارکرگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں لیکن اب بھی ایسے کئی شعبے ہیں جہاں معیاری افراد اور مہارت میں خواتین کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یونیورسٹیوں کو خواتین کے اندر حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور ہر وہ موقع فراہم کرنا چاہیے جس سے وہ بیدار ہوسکیں۔ وائس چانسلر ڈاکٹر سید احتشام حسنین نے سائنس میں خواتین کی شراکت کو سراہا اور کہا کہ سائنس کے عمل اور نتائج کی تفہیم پیدا کرنے کے لیے خواتین کو کئی کام انجام دینے ہیں۔ اس موقعے پر جامعہ ہمدرد کے اساتذہ کو اعزاز سے بھی نوازا گیا جن میں ڈاکٹر اروناگم، ہمن فاطمہ، دھارہ، کویتی منجال شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2020

اترپردیش :

منقسم سماج میں ترجمہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ایک سمینار لیکچر بعنوان 'منقسم سماج میں ترجمہ' منعقد کیا گیا۔ اشوکا یونیورسٹی، ہریانہ کے شعبۂ انگریزی کی پروفیسر ریتا کوٹھاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ ایک منقسم سماج میں جہاں تشدد روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے وہاں ترجمہ میں بولیاں زبان بن جاتی ہیں۔ انھوں نے سندھی زبان اور تہذیب سے متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد سندھی سماج اور تہذیب اپنی جڑوں سے کٹ گئی۔ انھوں نے کہا کہ مترجم کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ کن لفظوں کا ترجمہ کریں اور کن لفظوں کو چھوڑ دیں تاکہ مفہوم کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان کی روح بھی برقرارر ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ایس این زیبا نے کہا کہ ترجمہ نگار کا کام بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ اسے ترجمہ کی جانے والی زبان او راس کی تہذیب کو دوسری زبان اور اس کی تہذیب میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ شعبۂ انگریزی کے قائم مقام سربراہ پروفیسر راحت اللہ خاں نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا۔ پروفیسر وبھا شرما نے نظامت کی اور اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 مارچ 2020

غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

رامپور: وزارت ثقافت ہند کے ادارہ رامپور رضا لائبریری میں مولانا امتیاز علی عرشی تیسرا میموریل لیکچر 'غالب کا ہے انداز بیاں اور' پر ایک پروگرام سابق ڈائرکٹر رضا لائبریری ڈاکٹر سید حسن عباس کی صدارت میں ہوا۔ تلاوت کلام الٰہی و نعت سرور کونین سے شروع ہونے والے اس پروگرام میں قائم مقام ڈائرکٹر/ضلع مجسٹریٹ آنجنے کمار نگھ نے کہا کہ رضا لائبریری کو بچوں کی طرح سجانے اور سنوارنے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا اہم کردار ہے جس وقت امتیاز علی خاں لائبریری کو سنبھالے ہوئے تھے اس وقت دقتیں ضرور آئی ہوں گی اور اس وقت لائبریری کو سنبھالنا اور اس کی تزئین و ترقی کے لیے کام کرنا ستائشی قدم تھا۔ ضلع کلکٹر نے کہا کہ فارسی اردو کیا مجھے لگتا ہے کہ ہندی چاہنے والوں میں بھی غالب کا مقام اتنا ہی اونچا ہے غالب ہر ایک دل پر چھائے ہوئے شاعر تھے۔ دور تبدیل

ہوتے گئے مگر غالب آج بھی موجود ہیں اپنے نام کے ساتھ۔ ڈاکٹر حسن عباس نے کہا کہ جب وہ ڈائرکٹر تھے تب انھوں نے لائبریری کی بورڈ میٹنگ میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی میموریل اور مولانا عبدالسلام میموریل توسیع لیکچرز کو بھی پاس کرایا تھا۔ کناڈا سے آئے تقی عابدی نے کہا کہ مولانا عرشی کے تعاون پر رامپور جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ غالب رام پور میں کئی بار تشریف لائے وہ رام پور کے 2 نوابوں کے استاد بھی رہے ہیں۔ اس موقعے پر مہمان ذی وقار کے طور پر نفیس صدیقی اور ممتاز عرشی موجود رہے۔ ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے تقریب کی نظامت کی۔ اس موقعے پر ضلع مجسٹریٹ کے ہاتھوں صائمہ ذوالنور کے افسانوی مجموعہ 'سرشاخ گل' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 فروری 2020

ہندوستانی زبانوں میں دلت ادب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے جدید ہندوستانی السنہ شعبہ کے مراٹھی سیکشن اور ساہتیہ اکادمی

کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ سیمینار بعنوان 'ہندوستانی زبانوں میں دلت ادب' کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی حسن عابدی نے کہا کہ موجودہ وقت میں جس طرح تعصب اور سماجی نفرت بڑھ رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ادب ہی انسانیت کو بچا سکتا ہے۔ آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ گذشتہ کچھ دہائیوں میں دلت تحریک اپنی پوری طاقت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ پہلے مراٹھی اور بعد میں ہندی میں دلت ادب نے اپنی مضبوط حاضری درج کرائی، چنانچہ شاعری، کہانی، ناول، افسانہ، ڈرامہ، تنقید اور خودنوشت وغیرہ میں دلت شعور بیدار دکھائی دیتا ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پرووائس چانسلر پروفیسر اختر حسیب نے کہا کہ دلت ادب ایک ادب ہی نہیں بلکہ تحریک بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دستور ہند سب کو برابری کا حق دیتا ہے۔ دلت ادب کو سمجھنے کے لیے امبیڈکر، بر سا، پھولے اور سرسید کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہوگا، تبھی اس تحریک کا مقصد پورا ہو پائے گا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سارک اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ادیب مسٹر لکشمن گائکواڈ نے کہا کہ دلت ادب صرف دلتوں کے حقوق و اختیارات تک محدود نہیں ہے بلکہ سماجی حوالوں سے ہر طبقے کے وقار اور احترام کی شناخت ہے۔ دلت مصنفین کی خودنوشتیں بیانیہ اور فن کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ مہمان اعزازی پروفیسر پونم اروڑہ (امریکہ) نے دلت ادب کی ابتدا پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے سیاہ فام تحریک پر گفتگو کرتے ہوئے نیلسن منڈیلا، مارٹن لوتھر کنگ جیسے مفکرین اور دانشوروں کے حوالے سے سب کو ایک ہی دھاگے میں پرونے کے لیے مساوات پر زور دیا تاکہ سماج میں انسانی نقطۂ نظر فروغ پا سکے۔ امریکہ کے مشہور مصنف اور سیاہ فام تحریک پر تحقیق کرنے والے پروفیسر رچرڈ ٹرنر نے سبھی دبے کچلے لوگوں، سیاہ فاموں، کسانوں، مزدوروں وغیرہ کے ایک ہونے کی بات کی۔ سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر طاہر ایچ پٹھان نے سیمینار کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دلت ادب کی ابتدا مراٹھی زبان سے ہوئی اور رفتہ رفتہ شاعری، خودنوشت اور کہانیوں میں اس کی توسیع ہوئی۔ شعبے کے کشمیری سیکشن کے پروفیسر مشتاق احمد زرگر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر مسعود انور علوی (ڈین، فیکلٹی آف آرٹس) نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر طاہر ایچ پٹھان اور پروفیسر مشتاق احمد زرگر کی دو کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ جدید ہندوستانی السنہ شعبہ کے چیئرمین پروفیسر کرانتی پال نے اظہار تشکر کیا، جبکہ نظامت شاکر احمد نائیکو نے کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 مارچ 2020

بزمِ شیخ الہند کا اختتامی اجلاس

دیوبند: دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم طلبہ دیوبند کی انجمن بزم شیخ الہند کا اختتامی اجلاس محلہ بڑضیاء الحق میں کمال شاہ مسجد میں منعقد ہوا، جس کی صدارت دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا توحید عالم بجنوری نے کی جبکہ بحیثیت سرپرست دارالعلوم دیوبند ے رکن شوریٰ مولانا سید انظر حسین میاں نے شرکت کی۔ نیز دارالعلوم دیوبند کے استاد مولانا اشرف عباس اور مولانا افضل بستوی نے پروگرام میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی، اس موقعے پر مولانا توحید عالم نے کہا کہ طلبہ کو نصابی علوم کے ساتھ ساتھ زبان و قلم میں بھی مہارت حاصل کرنی چاہیے، انھوں نے انجمن بزم شیخ الہند سے دیوبند کے تمام مقامی طلبہ کو مربوط کرنے کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ ہی اساتذہ دیوبند کے انجمن سے منسلک ہونے پر بھی زور دیا۔ مولانا اشرف عباس نے شہر کے مقامی طلبہ کے پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کافی عرصے بعد ایسا شاندار پروگرام پیش کیا گیا ہے کہ جس کو مثالی کہا جاسکتا ہے، انھوں نے طلبہ کی جانب سے پیش کردہ عمدہ تقریروں کی بھی ستائش کی، اس موقعے پر ناظم انجمن مولانا ناصرالدین دیوبندی نے انجمن کی اہمیت و افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ طلبہ کی جانب سے مختلف موضوعات پر معلومات افزا چار عمدہ تقریریں پیش کی گئیں، یہ تقریریں بالترتیب مولوی عبدالرحمٰن دیوبندی، مولوی حسین دیوبندی، مولوی احمد وصیف دیوبندی اور مولوی مبشر دیوبندی نے پیش کیں، بعدازاں پوزیشن لانے والے طلبہ اور انجمن کے عہدیداران کو گراں قدر انعامات سے نوازا گیا، پروگرام میں شہر کی معزز شخصیات کے علاوہ اہلیان شہر اور دیوبند کے مقامی طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 فروری 2020

یونانی ڈے کا انعقاد

دیوبند: جی ٹی روڈ پر واقع جامعہ طبیہ دیوبند میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے یوم پیدائش کے موقعے پر 'یونانی ڈے' کا انعقاد کیا گیا۔ کالج کے طلبا و اساتذہ نے مل کر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی سوانح اور کارکردگی پر روشنی ڈالی اور ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر جامعہ طبیہ دیوبند کے سکریٹری ڈاکٹر انور سعید نے کہا کہ حکیم اجمل خاں اپنے وقت کے بڑے مشہور و معروف حکیم تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ قوم کے ایک عظیم خدمت گار اور مجاہد جنگ آزادی بھی تھے۔ حکیم اجمل خاں نے طب یونانی سے علاج کو فوقیت و اہمیت بخشی اور اسے پورے عالم میں شہرت دلوائی۔ وہ خاندان یونانی کے تئیں ایک ممبر کے لیے انمول اثاثہ ہے۔ یونانی سے متعلق لوگوں کو نہ صرف اس اثاثہ کی حفاظت کرنی ہے بلکہ اس کے فروغ

کے لیے مسیح الملک کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے ہوئے طب یونانی سے علاج کو کامیابی کی بلندی پر بھی پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سعید نے اس دوران کالج انتظامیہ کو یہ حکم بھی دیا کہ آج کے دن ہر سال ہسپتال میں تمام مریضوں کو ہر طرح کا علاج مفت فراہم کیا جائے یاور ہر سال 'یونانی ڈے' کے موقعے پر یہ رسم جاری رہے۔ جامعہ طبیہ دیوبند کے ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر اختر سعید نے اپنے خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ طب یونانی ہندوستان کے ماحول، رہن سہن اور اس کے غریب عوام کے مزاج کے بالکل موافق ہے اور اس طب یونانی میں دواؤں کے سائڈ افیکٹ بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس کے فروغ و ترقی کے لیے آیوش ڈاکٹروں کو کوشاں رہنا چاہیے۔ نظامت ڈاکٹر احتشام الحق صدیقی نے انجام دی۔

روزنامہ'اخبار مشرق'، 13 فروری 2020

'دستک' کے نئے شمارے پر مذاکرہ

وارانسی: تحقیق محض حقائق کی تلاش کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تہذیب کا مطالعہ بھی ضروری

ہے۔ جب تک علم تحقیق کا تعلق سماجیات، جغرافیہ، تاریخ اور ریاضی سے نہیں ہوگا اس وقت تک تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف نقاد اور محقق پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے عالمی شہرت یافتہ ریسرچ جرنل 'دستک' کے نئے شمارے پر جاری مذاکرہ کے دوران اپنے صدارتی خطبہ میں کیا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ موجودہ دور میں اردو میں ریسرچ کے معیار پر یونیورسٹیز کے اساتذہ کو خاص طور پر اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ شعبۂ فارسی کے سربراہ اور پروگرام کے مہمان اعزازی پروفیسر عقیل احمد نے کہا کہ رسالے کو جاری کرنا اور اس کا سلسلہ جاری رکھنا اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ دستک چونکہ معیاری رسالہ ہے اس لیے یہ ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ شعبۂ عربی کے سربراہ پروفیسر اشفاق احمد نے کہا کہ ایک علمی و ادبی مجلّہ کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ انھوں نے اداریہ پر خاص طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اسے بہت ہی کارآمد بتایا۔ ڈاکٹر محمد اختر استاذ بسنت کالج بنارس ہندو یونیورسٹی نے رسالے کے حوالے سے کہا کہ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں اردو میں جو چند قابل قدر رسالے شائع ہوئے ہیں ان میں دستک کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مغیث احمد نے 'دستک' کے اداریے، اردو زبان کی زبوں حالی اور رسم الخط کے مسئلے پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر لئیق احمد (بسنت کالج بنارس ہندو یونیورسٹی) نے رسالے میں شائع مضمون 'اردو ہندی قضیہ اور مہاتما گاندھی' کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سفینہ بیگم (شعبۂ اردو مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ) نے مختلف ابواب کے تحت شائع تمام مضامین پر مختصر اور جامع تبصرہ پیش کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر افضل مصباحی نے صحافت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس رسالے کو قارئین اور بالخصوص طلبہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے پر زور دیا۔ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر قاسم انصاری نے اپنے خطاب میں بنارس کی اردو صحافت پر روشنی ڈالی۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر احسان حسن نے پروفیسر ابوذر رعثانی کے مضمون 'خلیل الرحمٰن اعظمی: جدید اردو کے پیش رو' پر خصوصی گفتگو کی اور طلبہ کو اس کے مطالعہ کی تاکید کی۔ اس موقع پر ریسرچ اسکالر شمشیر علی نے رسالے کے مشمولات کے حوالے سے تفصیلی مقالہ پیش کیا اور مضامین کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ شعبہ اردو کے طلبہ محمد مقیم، کوثر جمال وغیرہ نے بھی مذاکرے میں حصہ لیا اور دلچسپ انداز میں رسالے کے مشمولات کی اہمیت کو واضح کیا۔

پریس ریلیز/ آفتاب احمد آفاقی، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، 17 فروری 2020

پریم چند: کل اور آج کل

وارانسی: معروف نقاد پروفیسر وجے بہادر سنگھ نے کہا کہ منشی پریم چند، وہ اہم مصنف ہیں جو ہندوستان کو حقیقی معنوں میں پہچانتے تھے۔ انھیں ہندی ادب کا گاندھی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ سوراج تحریک سے وابستہ تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ انسانیت سے بالاتر کوئی طاقت نہیں ہے۔ پروفیسر وجے بہادر سنگھ منگل کے روز منشی پریم چند میموریل ریسرچ اینڈ اسٹڈی سنٹر لمہی میں منعقدہ سیمنار پریم چند: کل، آج اور کل سے وجے بہادر سنگھ خطاب کر رہے تھے۔ سیمنار میں دہلی یونیورسٹی کے ہندو کالج کے ڈاکٹر رامیشور رائے نے کہا کہ پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعے ملک کے ادب میں نئے عوامل داخل کرائے۔ اجلاس کی صدارت کر رہی پروفیسر چندرکلا ترپاٹھی نے کہا کہ پریم چند خواتین کے سوالوں کو آزادی کے شعور کے مرکز میں مانتے تھے۔ سیمنار میں بی ایچ یو اردو شعبہ کے پروفیسر آفتاب احمد نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ'میرا وطن' دہلی، 26 فروری 2020

یومِ مادری زبان

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات اور اداروں میں بین الاقوامی یومِ مادر زبان پر مختلف پروگراموں کا اہتمام کیا گیا۔ شعبۂ قانون میں منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ایڈیشنل ضلع جج مسٹر شاہد رضا نے کہا کہ ترسیل کی فطری زبان مادری زبان ہوا کرتی ہے اور لوگ خواب بھی مادری زبان میں دیکھتے ہیں۔ فیکلٹی آف لا کے ڈین پروفیسر شکیل احمد صمدانی نے کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور مادری زبان انسان خود بخود ماحول میں سیکھ جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے اردو کو اظہار کی زبان کے طور پر منتخب کیا اور انھوں نے ہمیشہ اسی زبان میں لکھا۔ پروفیسر ظفر محفوظ نعمانی اور پروفیسر آئی اے خاں نے بھی اظہار خیال کیا۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبے میں منعقدہ پروگرام میں پروفیسر ٹی این ستھیسن نے زبانوں کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر امینہ خاتون نے مشرقی بنگال میں بنگالی تحریک کی ابتدا پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحریک کسی زبان کے خلاف نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد بطور مادری زبان بنگالی کا تحفظ تھا۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبے کے چیئرمین پروفیسر مشتاق احمد زرگر نے کہا کہ مادری زبان کا تحفظ انسان کا بنیادی حق ہے۔ اس موقعے پر بنگالی، کشمیری، پنجابی، تیلگو، تمل، ملیالم اور مراٹھی کے طلبہ و طالبات نے ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے۔ دوسری طرف لینگویج آف ایڈورٹائزنگ میڈیا اینڈ مارکیٹ کے احاطے میں شعبۂ لسانیات کی جانب سے ایک پوسٹر سازی مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر شعبۂ لسانیات کے چیئرمین

پروفیسر محمد جہانگیر وارثی، پروفیسر ایس امتیاز حسنین، مسعود علی بیگ اور دیگر اساتذہ موجود تھے۔ بیگم سلطان جہاں ہال میں منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے پرووسٹ ڈاکٹر سائرہ مہناز نے کہا کہ مادری زبان انسان کی روح ہے جسے وہ اپنی تہذیبی ولسانی شناخت کی بقا کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس موقعے پر تقریری وتحریری مقابلے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 فروری 2020

کلاسیکی غزل کے استعارے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'کلاسیکی غزل کے استعارے' موضوع پر رجحان ساز ناقد پروفیسر شمس

الرحمٰن فاروقی کے توسیعی خطبے کا انعقاد کانفرنس ہال میں کیا گیا۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کلاسیکی شاعری میں استعارہ کے نظام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شاعر کے آہنگ کی انفرادی شناخت کے بغیر شعر سے صحیح معنوں میں لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا ہے۔ شاعری میں لفظ و معنی اور اسلوب کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ لفظ و معنی کے اشتراک سے ہی شعر کا اسلوب تیار ہوتا ہے۔ شعری اسلوب کو بہتر اور کمتر بنانے میں تشبیہ واستعارے کا اہم کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مضمون سے عام طور پر وہ چیز مراد لی جاتی ہے جس کا ذکر شعر میں ہو اور شعر اس پر مبنی ہو۔ اس موقعے پر خسرو، میر، غالب، مصحفی وغیرہ کے اشعار بطور مثال پیش کیے اور کہا کہ مضمون و معنی میں ایک نازک اور پیچیدہ رشتہ ہوتا ہے۔ قدیم عرب شعریات میں مضمون کی جگہ معنی کہتے تھے۔ مفروضہ یہ تھا کہ جو شعر میں کہا گیا ہے وہ اس کے معنی ہیں۔ کچھ اسی طرح کا اصول ایرانی شعریات میں بھی جاری رہا۔ اس سے قبل خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کہا کہ فاروقی صاحب کو سننے کا شرف ہمارے طلبا کو حاصل ہو رہا ہے۔ یہ ان کے لیے بڑا موقع ہے۔ مہمان خصوصی معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی اردو زبان و ادب کے بڑے عالم اور ہمہ جہت فنکار ہیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے ان علما میں سے ہیں جنھوں نے نسلوں کی تربیت کی ہے، انھوں نے کلاسیکیت سے جدیدیت تک اعلیٰ درجے کی تحقیق پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 فروری 2020

ڈیجیٹل لائبریری کا افتتاح

مئوناتھ بھنجن: جامعہ عالیہ عربیہ مئو میں ڈیجیٹل لائبریری کا افتتاح کیا جس سے طلبہ و اساتذہ کو مطالعہ اور تحقیق میں آسانی ہوگی۔ طلبہ و اساتذہ اور دیگر شائقین علوم وفنون کے لیے جامعہ کی مرکزی لائبریری میں ای بکس کا انتظام کیا گیا اور مراجع ومصادر کی بیش قیمتی کتابوں کا ایک معتد بہ ذخیرہ فراہم کیا گیا، اس سے اساتذہ طلبا کو اب نادر و نایاب کتابوں کے لیے انھیں پی ڈی ایف کتابوں کی شکل میں ایک بہترین متبادل دستیاب ہو گیا ہے جس سے نہ صرف استفادہ میں آسانی ہوگی، بلکہ بوقت ضرورت حوالہ دینے میں بھی کسی قسم کا تردد نہیں رہے گا، سبھی کمپیوٹر کو ایک پرنٹر سے جوڑ کر یہ سہولت بھی دی گئی ہے کہ بوقت ضرورت مطلوبہ صفحات کا پرنٹ آؤٹ بھی لیا جا سکتا ہے، ساتھ ہی ساتھ بحث و تحقیق کو دھیان میں رکھ کر بنائے گئے بکس ایپلی کیشن کی مدد سے کسی بھی لفظ یا عبارت تک نہایت مختصر وقت میں رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ڈیجیٹل لائبریری کی جانب پیش رفت میں اسے اولین قدم کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ مستقبل میں اس میں مزید نکھار کی کوشش کی جائے گی۔ اسی طرح لائبریری کی ڈیجیٹل فہرست سازی کے لیے ایپلی کیشن بھی تیار کرا لیا گیا ہے جس پر جلد ہی کام شروع ہو جائے گا اور اساتذہ و طلبہ کے لیے لائبریری میں موجود کتابوں کی تلاش و جستجو ایک کلک پر دستیاب ہوگی، نیز انٹرنیشنل ڈیجیٹل لائبریریوں تک رسائی کے لیے نیٹ سروس فراہم کی جائے گی۔ ڈیجیٹل لائبریری کا افتتاح ناظم اعلیٰ جامعہ عالیہ عربیہ مولانا مظہر احسن ازہری، ڈاکٹر عبدالعلی ازہری (سابق پرنسپل مسلم کالج لندن)، ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی ازہری (سابق اناؤنسر سعودی ریڈیو جدہ) اور محمد طیب پالکی چیئرمین نگر پالیکا پریشد مئو نے بیک وقت الگ الگ کمپیوٹر پر کتابوں کی ورق گردانی سے کیا اور اس کی افادیت کا اعتراف کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2020

سترہویں صدی کا فارسی ادب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز تحقیقات فارسی کے زیر اہتمام 'سترہویں صدی کا فارسی ادب' کے عنوان سے ایک سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کے افتتاحی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے پرو وائس چانسلر، پروفیسر اختر حسیب نے ہندوستان میں فارسی زبان کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس سمینار میں آئے مندوبین فارسی ادب کی نئی جہات کی تلاش کریں گے۔ اپنے افتتاحی خطبے میں ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی ربانی نے کہا کہ 17ویں صدی ہندوستان میں فارسی ادب کی ترقی کے لحاظ سے نہایت اہم صدی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جس میں تاریخ، تصوف، ملفوظاتی ادب، غرض کہ منثور و منظوم ہر میدان میں اہم کارنامے انجام پائے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ظہیر حسین جعفری نے کہا کہ فارسی زبان و ادب کے فروغ میں سترہویں صدی ایک اہم دور رہا ہے۔ اس موقعے پر یزد یونیورسٹی، ایران کے پروفیسر کاظم کہدوئی نے اکبر کے عہد میں سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سترہویں صدی عیسوی کے ہندوستانی فارسی ادب میں اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ نائب کلچرل کاؤنسلر اور ایران کے معروف ومشہور شاعر ڈاکٹر علی رضا قزوہ نے صائب کے حوالے سے جامع اور تفصیلی گفتگو کی اور ہندوستان میں فارسی ادب کے سترہویں صدی میں فروغ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائریکٹر اور سمینار کے کنوینر پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید نے سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں 17ویں صدی میں متعدد بیش قیمتی فارسی تصانیف وجود میں آئیں جن کی اہمیت پر روشنی ڈالے جانے کے ساتھ ساتھ ان کا تعارف بھی ضروری ہے۔ ڈین، فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر مسعود انور علوی اور مشیر، مرکز تحقیقات فارسی پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے بھی خطاب کیا۔ افتتاحی جلسے میں مرکز کی شائع کردہ پانچ کتابوں کی رسم اجرا عمل میں آئی جن میں شگوفائی ادبیات فارسی کی دو جلدیں، نزد الارواح، مناقب الاسرار اور برہان اودھ شامل ہیں۔ ایران کے مشہور ومعروف فوٹوگرافر محمد یوسفی نے اپنی تصاویر کی نمائش لگائی جس کا افتتاح ڈاکٹر علی ربانی اور پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید نے کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 فروری 2020

منشی نول کشور: شخصیت اور خدمات

لکھنؤ: انسٹی ٹیوٹ فار سوشل ہارمنی اینڈ اپلفٹمنٹ کے تحت 'منشی نول کشور، شخصیت اور خدمات' کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد ہوٹل عارف کیسل شاہ نجف روڈ لکھنؤ میں

ہوا۔ سمینار کا افتتاح امام عیدگاہ قاضی شہر مولانا خالد رشید فرنگی محلی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پدم شری ڈاکٹر رنجیت بھارگوا نے کیا جبکہ مقرر خصوصی عمیر منظر نے منشی نول کشور کی شخصیت اور خدمات پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ فار سوشل ہارمنی اینڈ اپلفمنٹ کے چیئرمین سابق آئی اے ایس انیس انصاری نے سمینار کی صدارت، وائس چیئرمین طارق صدیقی نے شکریہ کے فرائض سمینار کے کنوینر و نظامت محمد خالد نے انجام دیے۔ اس موقعے پر انیس انصاری نے استقبالیہ خطاب کرتے ہوئے کہا کہ منشی نول کشور ایک درخشندہ ستارہ ہیں۔ منشی نول کشور نے بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں، اس کے علاوہ آپ نے طب یونانی اور آیورویدکے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے، منشی نول کشور نے اتحاد پر کافی زور دیا ہے، اس لیے منشی نول کشور کے اتحاد کے پیغام کو ہمیں دور دور تک لے جانا ہے۔ مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے افتتاحی خطاب میں کہا کہ آج ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے کہ بزرگوں کے یکجہتی کے پیغام کو عوام تک پہنچایا جائے، ہماری یکجہتی کی جیتی جاگتی مثال منشی نول کشور کی قومی یکجہتی ہے۔ مہمان خصوصی پدم شری ڈاکٹر رنجیت بھارگوا نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج منشی نول کشور کو مشترکہ تہذیب کی ایک بڑی علامت کے طور پر یاد کیا جارہا ہے۔ اردو زبان کو ثروت مند بنانے میں مطبع نول کشور سے شائع کتابوں کا اہم کردار ہے۔ مقرر خصوصی ڈاکٹر عمیر منظر نے تفصیلی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی ترویج وترقی اور اس کے تحفظ میں انفرادی سطح پر جن مطابع کی بہت خدمات رہی ہیں ان میں نمایاں نام مطبع نول کشور کا ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ منشی نول کشور نے داستانوں کی اشاعت سے اردو کے زبانی بیانیہ کو مستحکم اساس فراہم کی۔ اس پریس نے قصہ گوئی کے فن کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ اخبار مشرق دہلی، 20 فروری 2020

بیسویں صدی کا ہندوستانی ادب اور قومی تحریک

شاہجہاں پور: گاندھی فیض عام کالج کے شعبہ ہندی اور یو جی سی کی سی پی ای اسکیم کے اشتراک سے 20 ویں صدی کا ہندوستانی ادب اور قومی تحریک کے موضوع پر آج دوسرے روز مقررین نے خیالات کا اظہار کیا اور مقالہ نگاروں نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ بہترین مقالہ پیش کرنے والے شرکا کو انعامات سے نوازا گیا۔ منگل کے روز کالج کے کمیٹی ہال میں دو روزہ قومی سمینار کو خطاب کرتے ہوئے مقرر خصوصی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر عارف نظیر نے کہا کہ ہندوستانی ادب کا ملک میں چلائی گئی قومی تحریکوں میں قابل ذکر رول ہے۔ یہاں کے مصنفین، ادبا، شعرا، قلمکاروں نے ہندوستان کی عظیم روایتوں کو بچانے اور ان کو فروغ دینے میں عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ صدارتی خطبہ میں کالج کے پرنسپل پروفیسر جمیل احمد نے کہا کہ تحریک آزادی ہندوستانی تاریخ کا دوہ دور ہے جو تلخی، کرب، خوداعتمادی، فخر، اعزاز اور سب سے زیادہ شہیدوں کے لہو کو سمیٹے ہوئے ہے۔ آزادی کے اس دور میں سماج کے ہر طبقے نے اپنے اپنے طریقے سے قربانی دی ہے۔ آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر فیاض احمد نے کہا کہ تحریک آزادی اور قومی تحریک میں ادب نے ہمیشہ جدوجہد اور تعمیری مداخلت کا شاندار رول ادا کیا ہے۔ سمینار میں ڈاکٹر غلام اشرف قادری، ڈاکٹر عائشہ زیبی، ڈاکٹر نیلم ٹنڈن، ڈاکٹر سوپنل یادو، ڈاکٹر رئیس احمد، ڈاکٹر تنویر حسین ڈاکٹر منصور صدیقی، اُمیش مشرا نے بھی تحقیقی مقالے پیش کیے۔ بہترین مقالے پیش کرنے والے ڈاکٹر تنویر حسین لکھنؤ کی سوبی گپتا، ابھیشیک ٹھاکر کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس سے قبل پرنسپل نے مقرر خصوصی پروفیسر عارف نظیر کا مومنٹو دے کر وشال اوڑھا کر خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر محمد ارشد خاں نے استقبالیہ خطبہ دیا۔ نظامت ڈاکٹر کاشف نعیم اور ڈاکٹر پرویز محمد نے کی۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 فروری 2020

مولانا جلال الدین رومی کی حیات وتعلیمات

متھرا: ساتویں صدی ہجری یا بارہویں صدی عیسوی کے عالم اسلام کے جو سیاسی، سماجی اور علمی حالات مورخین

نے لکھے ہیں، تقریباً وہی حالات پوری دنیا میں آج بھی موجود ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مختلف مقررین نے یہاں ایچ ایم اسکول چندن ون متھرا میں منعقد ایک روزہ نیشنل سمینار مولانا جلال الدین رومی کی حیات وتعلیمات میں کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے متھرا کے میئر ڈاکٹر نے کہا کہ رومی فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں خاص طور پر انگریزی میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مشرقی مصنف اور شاعر ہیں اور اس کی اصل وجہ ان کی اخلاقی تعلیمات ہیں۔ سمینار کے سرپرست اور اختر حسن میموریل پبلک ویلفیئر سوسائٹی متھرا کے صدر ڈاکٹر ظہیر حسن نے آریہ بندھو اور سٹی مجسٹریٹ ڈاکٹر منوج کمار نے شرکت کی۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی سے تشریف لائے ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے کہا کہ مولانا رومی کے دور میں اخلاقی زوال، دکھاوا، علم اور تعلیم پر جھوٹا فخر، تصوف میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ظاہر پرستی، اخلاقی زوال اور تعلیم کے نام پر کتابیں پڑھائے جانے کا رجحان عام تھا، ہمارے سماجی اور تعلیمی اداروں کی بھی آج یہی صورت حال ہے۔ جس طرح مولانا جلال الدین رومی نے اس تعلیمی صورت حال کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، آج اسی طرح کی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ معروف مورخ اور محقق فاروق ارگلی نے اس بات پر زور دیا کہ جلال الدین رومی کی حیات اور تصوف کے مختلف ابواب میں نئے سرے سے تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج سے تشریف لائے ڈاکٹر محمد فرقان نے تصوف میں رقص اور موسیقی کی صورت حال پر تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ ادارہ تحقیقات فارسی اے ایم یو علی گڑھ کے پروفیسر قمر عالم نے جلال الدین رومی کے دور کی اخلاقی صورت حال، روحانی تعلیم اور خانقاہی نظام پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انجینئر سمیع الدین علیگ نے تصوف کے سلسلوں اور صوفیوں کے مختلف درجات پر روشنی ڈالتے ہوئے جلال الدین رومی کے عہدے اور اہمیت پر تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر سید اختیار جعفری نے جلال لدین رومی اور شیخ شمس تبریز کے تعلقات پر اور حقانی القاسمی نے رومی کی تعلیمات کا خلاصہ ان کی مثنوی مولوی معنوی کی روشنی میں پیش کیا۔ صدارت کرتے ہوئے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (بھارت سرکار) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شعیب رضا

سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انگریزی داں طبقے نے مشرقی ادبیات میں جتنا مطالعہ رومی کی مثنوی مولوی معنوی کا کیا ہے، اتنا اہل زبان کے ذریعے بھی نہیں کیا گیا۔ اختر حسن میموریل پبلک ویلفیئر سوسائٹی اینڈ لائبریری کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر ناہید اختر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، سید اختیار جعفری، 17 فروری 2020

بہار:

فروغ اردو سمینار و مشاعرہ

بھاگلپور: بانکا ضلع اردو زبان سیل کے زیر اہتمام آج ٹاؤن ہال میں فروغ اردو سمینار اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت بانکا کے ڈی ڈی سی آئی اے ایس روی پرکاش نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی اساس ہے۔ اس کی بنیاد کو انگریزوں نے جو نقصان پہنچایا اس کی بھرپائی آج تک نہیں کی جا سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کو ایک مذہب کے ماننے والوں کی زبان بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اگر اردو کو کسی مذہب سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے تو یہ غلط ہے۔ منشی پریم چند جو اپنے کو نواب رائے سے تعارف کراتے تھے انھوں نے اپنی پہلی تخلیق اسرار معابد اردو میں لکھی، انھوں نے کہا کہ گاندھی جی نے بھی زبان کو کسی بندھن سے نہیں باندھنے دیا، انھوں نے کہا کہ آج بھی فلمی دنیا میں جو گیت اور گانے ہیں وہ اردو کے الفاظ کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ مہمانِ خصوصی این منڈل یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر فاروق علی نے کہا کہ زبان کے فروغ میں عوام کا جوش اور جذبہ ضروری ہے اس کے بغیر کسی بھی زبان کو فروغ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کو رابطہ کا ذریعہ بنائیں تو اس سے بھی اردو کو استحکام مل سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ واحد زبان ہے جس کو مذہب سے جوڑ دیا گیا، آزادی تو اس زبان کے ذریعے ملی لیکن تقسیم کرو اور حکومت کا شکار ہو گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2020

اردو کو الگ مقام دلانے کے لیے کام کریں

ارریا: محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے جوائنٹ سکریٹری اور اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز کریمی ارریا دورے پر پہنچے، اردو ٹرانسلیٹر وں، اور ملازمین اور اردو اساتذہ کے ساتھ سرکٹ ہاؤس میں میٹنگ کر کے اردو کے فروغ کے لیے کئی ضروری ہدایتیں دیتے ہوئے کہا کہ حکومت نے اسے ثانوی زبان کا درجہ دیا ہے مگر اردو کے لیے جو کام ہونا چاہیے وہ اب تک نہیں ہوا ہے۔ صرف اردو زبان میں نیم پلیٹ مشاعروں اور سمیناروں سے اردو کا فروغ نہیں ہو سکتا۔ اس کے نفاذ کے لیے عملی طور پر کام کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ آپ اسکولوں میں جا کر دیکھیں کہ بچوں کے پاس اردو کی کتابیں ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو دستیاب کرائیں۔ اردو کے لیے کم سے کم دو گھنٹہ وقت دیں تو بڑی خدمت ہوگی۔ اس موقعے پر فاروق عادل، آصف اقبال، صابر عالم، عارض حسین، سرور عالم، طارق انور، آفرین فرحت وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 فروری 2020

تلنگانہ:

مخطوطہ شناسی پر ورکشاپ

حیدرآباد: تلنگانہ اسٹیٹ اورینٹل مینو اسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے احاطے میں شعبۂ اردو و عربی، فارسی، مرہٹی اور کنڑ کے اشتراک سے پروفیسر ڈی۔ رویندر پرنسپل آرٹس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں مخطوطہ شناسی کے موضوع پر ایک روزہ ورک شاپ کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر سبا راو ڈائرکٹر تلنگانہ اسٹیٹ اورینٹل مینو اسکرپٹس لائبریری نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے اپنے استقبالیہ کلمات میں اس لائبریری میں موجود عربی، فارسی اور اردو کے (17124) مخطوطات کے (47) فنون کے تحت ترتیب دیے جانے اور ان میں بیشتر مخطوطات کی طلائی تحریروں (Gold Coated) سے نہ صرف واقف کروایا بلکہ کچھ اہم مخطوطات کو مشاہدہ کے لیے بھی رکھا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر فضل اللہ مکرم صدر شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں مستقبل میں بھی ایسے پروگرامس منعقد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس صدر شعبہ اردو مولانا آزاد اورینٹل اردو یونیورسٹی و ڈین فیکلٹی آف لینگویجز نے مخطوطات کی اہمیت پر مختصر مدتی ورکشاپس کے انعقاد اور مخطوطہ شناسی کو نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا۔ پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ و سابق رکن عاملہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے کلیدی خطبے میں ڈاکٹر سبا راو ڈائرکٹر تلنگانہ اسٹیٹ اورینٹل مینو اسکرپٹس لائبریری کی اس ابتدائی کوشش کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ مدت کے بعد اس لائبریری میں زندگی دیکھنے کو ملی ہے۔ پرنسپل ڈی رویندر نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈائرکٹر اور تمام مہمانوں اور شرکائے محفل کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً یہ لائبریری ایک علمی خزانہ ہے ہم سب کو اس جانب توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ نے اس ورکشاپ کے انعقاد میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد محترمہ سلیمہ سلطانہ اور اکبر کی معاونت نے اس ورکشاپ کو بڑی کامیابی سے ہمکنار کیا۔

روزنامہ 'بھاگیہ نگر ٹائمز'، حیدرآباد، 10 فروری 2020

لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ پر نکڑ ناٹک

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شعبۂ سوشل ورک کے طلبہ نے جنسی شعور بیداری مہم کے تحت ایک نکڑ ناٹک 'سماج کو آگے بڑھانا ہے تو لڑکی کو بھی پڑھانا ہے۔'' شعبہ نے مائی چوائس فاؤنڈیشن، حیدرآباد کے تعاون سے 'امن کے چیمپئن' نامی ایک فورم قائم کیا ہے جہاں یونیورسٹی، کالج اور سلم بستیوں کے طلبہ میں جنسی مسائل پر شعور بیداری کے لیے والینٹر تیار کیے جائیں گے۔ یہ ڈراما اس مہم کا حصہ تھا جس میں حصولِ تعلیم سے لڑکیوں کو روکنے کی غلط روایت پر سوال اٹھاتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی کہ کس طرح سے ہمارا سماج صنفِ نازک کو اپنا تابعدار اور گھر تک محدود رکھنے کے لیے جواز پیش کرتا ہے۔ امن کے چیمپئن والینٹرس عوام میں سلم علاقوں میں مستقبل میں اس طرح کا ڈراما اور دیگر پروگرام کرتے ہوئے شعور بیدار کریں گے کہ لوگ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھیں اور لڑکیوں کی تعلیم کا بھی بہتر نظم کریں۔ دیگر کالجوں کے چیمپئن، مائی چوائس فاؤنڈیشن کے اسٹاف، طلبہ اور یونیورسٹی کے مختلف اراکین عملہ نے اس ناٹک کا مشاہدہ کیا۔ پروفیسر محمد شاہد، شعبۂ سوشل ورک نے کہا کہ اس طرح کی پہل کے ذریعے نوجوان طلبہ کے ذہنوں پر اچھا اثر ہوتا اور ان میں جنس مخالف کے تئیں احترام پیدا ہوتا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 فروری 2020

قومی اردو سائنس کانگریس

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اساتذہ کی دوہری ذمے داری ہے کہ وہ اردو میں لکھیں تاکہ طلبہ کو انھیں سمجھنے میں سہولت ہو اور انھیں اردو میں پڑھائیں اس کے ساتھ ساتھ اپنے تحقیقی کام کی اشاعت انگریزی میں بھی عمل میں لائیں تاکہ تحقیقی عمل چلتا رہے اور اس کا خود ان کا اور عوام کا بھی فائدہ ہو۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی سے جاری کردہ اعلامیہ میں اس بات کو لازمی کر دیا گیا ہے کہ اساتذہ کی تقرری کے دوران انھیں امیدواروں کو قطعی

فہرست میں شامل کیا جائے گا جنھوں نے کم از کم دسویں یا بارہویں سطح پر اردو میڈیم یا کم از کم ایک زبان کے طور پر اردو پڑھی ہو۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے قومی اردو سائنس کانگریس 2020 کے اختتامی اجلاس میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے بتایا کہ اردو سائنس کانگریس کے مسلسل انعقاد کے باعث نہ صرف یہ کہ نئے لکھنے والے آنے لگے ہیں بلکہ مقالوں کا معیار بھی بڑھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگلے سال جب وہ یہاں نہیں ہوں گے تب بھی یہاں سائنس کانگریس ہوگی تو انھیں مسرت ہوگی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں نہ ہی ستائش پر بہت مسرور ہونا ہے اور نہ ہی تنقید پر رنجیدہ۔ مسلسل محنت اور ایمانداری سے اپنا کام کرتے رہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے لوگ پیچھے ہو رہے ہیں تو یہ ہم سبھی کی ذمے داری ہے کہ انھیں آگے لانے کے لیے حتی المقدور کاوشیں کریں۔ اردو عوام میں صحت، منطق جیسے امور پر شعور بہت کم ہے۔ جبکہ ان میں بہت زیادہ جذباتیت پائی جاتی ہے۔ ان حالات کو بہتر بنانے کی خاطر انھوں نے ماہنامہ 'سائنس' کا اجرا عمل میں لایا گیا۔ پہلے کے مقابلے میں آج حالات پھر بھی بہتر ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 فروری 2020

اردو میں شعری رجحانات

حیدرآباد: اردو شاعری میں شعری رجحانات کا آغاز منظوم داستانوں سے ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی ادب سے

یہ رجحانات اردو میں آئے اور اس طرح اردو کا شعری رجحان وسیع ہوتا گیا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر م ق سلیم صدر شعبۂ اردو شاداں کالج نے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ ڈاکٹر راہی معتمد مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی نے اپنے کلیدی نوٹ سے مذاکرہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ فرزند جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر منیر الزماں میر نے اردو میں مثنوی رجحانات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عربی اور فارسی زبانوں کے شعری ادب اور رجحانات اردو کے شعری رجحانات سے تقابل کرتے ہوئے تفصیل سے جائزہ لیا۔ ڈاکٹر ناظم علی سابق پرنسپل موڑتاڑ نظام آباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ مسدس حالی کے ذریعے اردو میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر م ق سلیم، حیدرآباد، 19 فروری 2020

مہاراشٹر:

الوداعی تقریب و تقسیم انعامات

جلگاؤں: اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام جاری اقرا شاہین اردو ہائی اسکول مہرون میں دسویں جماعت کے طلبہ کے لیے الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا اور جماعت پنجم تا بارہویں میں اوّل دوم اور سوم مقام حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا۔ پروگرام کا آغاز انصاری صحیب محمد نسیم (جماعت نہم) کی تلاوت قرآن کے ذریعے کیا گیا۔ صالحہ (جماعت دہم) اور ہمنوا نے ترانہ اقرا پیش کیا۔ ارم فاطمہ تسلیم خان (جماعت دہم) اور ہمنوا نے الوداعی گیت پیش کیا۔ جماعت پنجم سے نہم میں سب سے زیادہ فی صد مارکس حاصل کرنے والی جماعت پنجم کی طالبہ بانہ انیس پٹیل 97.% کو اقرا شاہین اردو ہائی اسکول مہرون کی جانب سے اسٹار آف اقرا، گذشتہ تعلیمی سال 19-2018 میں ایس ایس سی بورڈ امتحان میں اقرا شاہین اردو ہائی اسکول مہرون اور ضلع جلگاؤں کے تمام اردو اسکولوں میں اوّل مقام حاصل کرنے والے شیخ اُسید گلاب (92.%) کو اقرا کے صدر ڈاکٹر عبدالکریم سالار کی جانب سے شیخ احمد سر ٹرافی، اقرا شاہین کے لڑکوں میں سے بطور بیسٹ اسٹوڈنٹ 2020 خان فیض ظفر (جماعت دہم) کو الفیض فاؤنڈیشن کی جانب سے عبدالمجید سالار ٹرافی اور شاہکار فاؤنڈیشن کی جانب سے قیمتی رسٹ واچ اور لڑکیوں میں سے بیسٹ اسٹوڈنٹ تنزیلا عبدالستار پٹیل (جماعت دہم) کو اقرا شاہین کے چیئرمین ڈاکٹر طاہر شیخ کی جانب سے مرحومہ رحمت بی ٹرافی سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت پنجم تا بارہویں تمام اوّل تا پنجم مقام حاصل کرنے والے طلبہ کو اقرا شاہین کے شعبۂ امتحانات کی جانب سے انعامات نوازا گیا۔

ماہنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 16 فروری 2020

تحریری ریاضی مقابلے کا منظر

تحریری ریاضی مقابلہ

نندوربار: نندوربار شملہ گروپ نے طلبا کے ذہن سے علم ریاضی کا ڈر نکالنے اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے شہر نندوربار کے تمام اردو میڈیم سیکنڈری اسکولوں سے آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کے طلبا کے لیے تحریری ریاضی مقابلے کا انعقاد کیا۔ انٹر اسکول ریاضی تحریری مقابلہ کے لیے شہر کے نامور ریاضی داں اشفاق سر نے سوالیہ پرچہ ترتیب دینے میں بھور تعاون دیا۔ نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کی ہمت اور حوصلہ افزائی کے لیے انعامات، تمغے اور سرٹیفکٹ تقسیم کرنے کا پروگرام بمقام بادشاہ نگر نندوربار منعقد ہوا۔ اس پروگرام میں گروپ کے روح رواں فہیم اکرم نے گروپ کے اغراض و مقاصد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''نندوربار شملہ گروپ نے انسانوں تک پہنچنے کی ایک ادنی سی کوشش کی ہے، دعا کیجیے کہ ہمیں مقصد میں کامیابی ملے'' اس موقعے پر گروپ کے تمام اراکین اور شہر کی نامور شخصیات موجود رہیں۔

رپورٹ: عادل فہیم، دھنی، 14 فروری 2020

مغربی بنگال:

غالب تقریبات کا انعقاد

کلکتہ: اسد اللہ خان غالب کو کسی نظریہ فکر اور زبان کے تناظر میں قید نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ زماں و مکاں اور فکر و نظریات سے ماورا شاعر ہیں۔ یہ باتیں پروفیسر شمیم حنفی نے مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقد پانچ روزہ 'یادِ غالب تقریبات' کے موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہیں۔ اس موقعے پر ممبر پارلیمنٹ ندیم الحق نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ چونکہ غالب نے اپنی فلسفیانہ شاعری سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کی نمائندگی کی ہے، اس لیے انھیں بعد از مرگ 'بھارت رتن' سے نوازا جائے۔ غالب پر پانچ روزہ تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے کلکتہ کارپوریشن کے میئر و سینئر ریاستی وزیر فرہاد حکیم نے کہا کہ کلکتہ کے لیے یہ شرف کی بات ہے کہ اس نے

رابندرناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام اور اسداللہ خان غالب کی میزبانی کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ کو کلچرل راجدھانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغربی بنگال کی وزیراعلیٰ ممتا بنرجی ہمیشہ اردو زبان کی ترقی کے لیے فکرمند رہی ہیں اور انھوں نے اقتدار میں آتے ہی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا اور آج بنگال اردو اکادمی وزیراعلیٰ کی سرپرستی میں علمی کام کر رہی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 22 فروری 2020

مولانا ابوالکلام آزاد اور تکثیری ہم آہنگی

کولکاتہ: آڈیٹوریم عالیہ یونیورسٹی پارک سرکس کیمپس شعبۂ اردو عالیہ یونیورسٹی کی جانب سے 'مولانا ابوالکلام آزاد اور تکثیری ہم آہنگی' پر خطبہ پیش کرتے ہوئے مہمان خاص جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ہندوستان کی خوبصورتی آپسی میل ملاپ، محبت و یکجہتی اور تکثیری ہم آہنگی میں ہی مضمر ہے۔ اگر میں کہوں کہ تکثیری ہم آہنگی ہی ہندوستان کی روح ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر درخشاں زریں نے مہمانان، حاضرین و سامعین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد جیسی علمی و ادبی مذہبی و ترقی پسند شخصیت پر گفتگو کے لیے آج ہم سب یکجا ہوئے ہیں اس کے لیے شعبۂ اردو آپ سب کا تہہ دل سے شکرگزار ہے۔ دیگر معزز مہمانان میں یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر امجد حسین، ڈین فیکلٹی پروفیسر ایم آر کریم، ڈپٹی رجسٹرار ڈاکٹر اشفاق علی، مہمان ذیشان ڈاکٹر ابوبکر جیلانی، جمیل منظر، ڈاکٹر شاہد اختر اور کنیڈا سے تشریف لائے جاوید دانش نے اس یادگاری خطبے کی اہمیت اور عصری افادیت کا اعتراف کیا، قیصر شمیم نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ محمد اکرام نے اپنے موضوع سے کما حقہ انصاف کیا ہے اور اپنی بات سامعین کے ذہن نشین کرانے کے ہنر سے انھیں بخوبی واقفیت ہے، پروگرام کا آغاز ارشد ناصر کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور آصف علی مرزا نے شعر و نغمہ سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس یادگاری خطبے میں شہر و بیرون شہر کی ادبی، دینی، ملی، قومی شخصیات اور دیگر عمائدین شہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 فروری 2020

ہریانہ:

تقریب غالب

پنچکولہ/ہریانہ: مرزا اسداللہ خاں غالب کے 150 ویں یوم وفات پر پنچکولہ ہریانہ اردو اکادمی کے کیمپس میں ایک روزہ تقریب کا انعقاد ہوا۔ تقریب کی ابتدا میں ڈپٹی چیئرمین و ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی ڈاکٹر

چندر ترکھانے اکادمی کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ کی کوشش میں کی جانے والی اکادمی کی ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے موجودہ حالات کے تناظر میں اردو اکادمی کے وجود کو غنیمت قرار دیا۔ تقریب کی صدارت ہریانہ کے ڈی جی پی اور قلمکار کے پی سنگھ نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر چندر ترکھانے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر اس تقریب میں ڈاکٹر سونیا کھلر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے شائع شدہ کتاب بعنوان مرزا غالب اور ہریانہ کے مہمان شاعر، آنجہانی پنڈت سوز کے شعری مجموعہ 'زخم کوئی ہو' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ تقریب میں مہمان ادیب شیوکمار عرف شین کاف نظام، مشہور شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی، ناٹک کار ڈاکٹر آتم جیت، سابق آئی اے ایس آر کے تنیجا، مشہور شاعر مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر کے کے رشی، مرکزی ساہتیہ اکادمی کے قومی نائب صدر مادھو کوشک نے اظہار خیال کیا۔ غالب کے حوالے سے شین کاف نظام نے اپنے خطاب میں غالب کو عظیم شاعر بتاتے ہوئے اپنے وقت کا بہترین ترجمان قرار دیا۔ شرکا کا کہنا تھا کہ غالب آج بھی شعر و ادب میں اگر غالب ہیں تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جن میں سب سے بڑی وجہ ان کی شاعری ہے جسے شاعری سے لگاؤ ہوگا وہ غالب نواز لازمی ہوگا، بلاشبہ غالب اردو کے شیکسپیئر ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی زبان کا شاعر یا ادیب غالب کو پڑھنا چاہتا ہے، اور تبھی غالب کی شاعری دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہے، یہی غالب کی مقبولیت کا اصل راز بھی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 فروری 2020

اعزاز و اکرام:

ڈاکٹر اختر سعید

دیوبند: مسیح الملک حکیم اجمل خان میموریل سوسائٹی دہلی کی جانب سے گذشتہ 13 فروری کو یونانی ڈے کے

موقعے پر بیسٹ یونانی ڈرگ مینوفیکچرنگ کمپنی کے لیے جامعہ ریمیڈیز دیوبند کے ایم ڈی ڈاکٹر اختر سعید کو حکیم اجمل خان گلوبل ایوارڈ 2019 سے نوازا گیا، ڈاکٹر اختر سعید کو ایوارڈ ملنے پر علاقے میں خوشی کا ماحول ہے۔ واضح ہو کہ دیوبند میں واقع جامعہ ریمیڈیز یونانی ادویات تیار کرنے میں بین الاقوامی شہرت یافتہ کمپنی ہے جس کی ابتدا مرحوم پروفیسر حکیم شمیم احمد سعیدی نے سال 2005 میں کی تھی۔ یہ کمپنی 300 سے زیادہ مختلف اقسام کی یونانی دوائیں تیار کر رہی ہے اور بیرون ملک مریضوں کو علاج کے لیے خالص یونانی ادویات پیش کر رہی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 فروری 2020

ڈاکٹر محمد آفتاب

نئی دہلی: عالمی یوم یونانی میڈیسن کے موقعے پر سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن نے جامعہ ہمدرد کے اسکول آف یونانی میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے شعبۂ علم الصیدلہ سے تعلق رکھنے والے حکیم محمد آفتاب احمد کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ واضح

رہے کہ وگیان بھون نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں راجناتھ سنگھ وزیر برائے دفاع حکومت ہند، شری پدیسو نائک وزیر برائے وزارت آیوش جتیندر سنگھ وزیر حکومت ہند کے ہاتھوں ڈاکٹر محمد آفتاب احمد نے یہ ایوارڈ وصول کیا جس میں مومنٹو، شال کے علاوہ کیش انعام پیش کیا گیا۔ اس خبر سے اسکول آف یونانی میڈیسن جامعہ ہمدرد کے تمام اساتذہ اور طلبہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے

ڈاکٹر محمد آفتاب احمد کو دلی مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر محمد آفتاب احمد کو ملک اور بیرون ملک متعدد انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد آفتاب گذشتہ پینتیس برسوں سے طلبہ طب یونانی کو اپنے علم وفن سے فیضیاب رہے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 14 فروری 2020

مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات اعزاز سے سرفراز

نئی دهلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے زیر اہتمام

عالمی یونانی میڈیسن ڈے تقریب کا کل یہاں انعقاد کیا گیا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے اطبا نے طب یونانی کے فروغ کے لیے مختلف طریقہ کار پر تبادلہ خیال کیا۔ اقلیتوں کے قومی تعلیمی کمیشن کے چیئرمین جسٹس این کے جین نے مسابقت کے اس دور میں یونانی سسٹم کو سائنسی بنانے اور اس میں نئی نئی تحقیقات پر زور دیا اور کہا کہ طب یونانی سے وابستہ افراد کو ایسی دوائیں تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کو فوری اثر پذیر ہوں۔

اس موقعے پر طب یونانی کی ترویج و اشاعت میں نمایاں رول ادا کرنے کے لیے مختلف افراد کو اعزاز سے نوازا گیا۔ ان میں ڈاکٹر حکیم سید امام الدین احمد (چینئی)، ڈاکٹر افتخار احمد سیفی (دبئی)، ڈاکٹر راکیش کمار شرما (پنجاب)، ڈاکٹر غزالہ جاوید (نئی دہلی)، ڈاکٹر فخر عالم (علی گڑھ)، پروفیسر محمد محی الحق صدیقی (علی گڑھ)، ڈاکٹر صوفیہ اتساہی (نئی دہلی)، ڈاکٹر ابوالحسن اشرف (حیدرآباد)، ڈاکٹر شکیل احمد خاں (عثمان آباد)، ڈاکٹر پی بی کانجی لال (کولکاتا)، مقبول حسن (نئی دہلی) کے علاوہ اردو صحافت کے لیے معروف صحافی روزنامہ میرا وطن کے ایڈیٹر ارشد فریدی کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ملک کے گوشے گوشے سے متعدد یونانی نوجوان طبیبوں کو اسٹاف آف یونانی میڈیسن سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ان میں ڈاکٹر ابورضوان (جمشید پور)، ڈاکٹر محمد روشن (اجمیر)، ڈاکٹر آشیش چودھری (نئی دہلی)، جناب عبدالوہاب عادل (نئی دہلی)، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن (دیواس)، ڈاکٹر محمد اویس حسن (ناگپور)، ڈاکٹر سنبل رحمٰن (علی گڑھ)، ڈاکٹر شہناز پروین (نئی دہلی)، حکیم محمد صادق (نئی دہلی)، ڈاکٹر حسان حامد (جے پور)، ڈاکٹر نثار احمد (جے پور)، حکیم محمد وسیم (نئی دہلی)، جناب پرویز احمد خان (امروہہ)، ڈاکٹر حکیم رفیع الدین احمد (ویلور)، ڈاکٹر شبیر احمد انصاری (گوہاٹی)، ڈاکٹر زبیر احمد (نوح)، ڈاکٹر عبدالماجد خان (سہارنپور)، ڈاکٹر حبیب اللہ (نئی دہلی)، ڈاکٹر ظفر اقبال (رانچی)، ڈاکٹر بدرالاسلام کیرانوی (نئی دہلی) شامل ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 14 فروری 2020

اے ایم یو کے تین اساتذہ ایوارڈ سے سرفراز

علی گڑھ: اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے تین اساتذہ کو ان کی خدمات کے اعتراف میں وزارتِ آیوش، حکومت ہند کی جانب سے یونانی طب کے موضوع پر وگیان بھون، نئی دہلی میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ طبیہ کالج کے شعبۂ علاج بالتدبیر کے پروفیسر محمد انور کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھیں ایوارڈ کے طور پر دو لاکھ روپے پیش کیے گئے۔ پروفیسر محمد انور 25 برسوں کا تحقیق و تدریس کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کے متعدد تحقیقی مقالے مختلف قومی و بین الاقوامی مجلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے اختصاص کے موضوع پر چار کتابیں تصنیف کی ہیں اور اکیس پوسٹ گریجویٹ طلبہ کی علمی رہنمائی کی ہے۔

کانفرنس میں شعبۂ امراض جلد و زہراویہ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد محسن کو ایک لاکھ روپے پر مشتمل ینگ سائنٹسٹ ایوارڈ اور شعبۂ امراض نسواں و اطفال کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ابیہہ احمد کو پچاس ہزار روپے پر مشتمل بیسٹ کلینیکل ریسرچ پیپر کا ایوارڈ دیا گیا۔ تینوں ایوارڈ یافتگان کو توصیفی اسناد بھی پیش کی گئیں۔ انھیں مذکورہ ایوارڈ وزیر دفاع مسٹر راجناتھ سنگھ اور وزیر مملکت ڈاکٹر جتیندر سنگھ و مسٹر شریپد یسو نائک کے بدست پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 13 فروری 2020

پروفیسر آفتاب احمد عراقی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے آرتھوپیڈک سرجری شعبے کے سابق چیئرمین پروفیسر آفتاب احمد عراقی کو ان کی گراں قدر علمی وطبی خدمات کے اعتراف میں لکھنؤ میں منعقدہ یوپی آرتھوکون 2020 کے دوران یوپی آرتھوپیڈک ایسوسی ایشن کے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مذکورہ کانفرنس کے مختلف اجلاس میں آرتھوپیڈک سرجری شعبے کے اساتذہ نے حصہ لیا۔ شعبے کے تین اساتذہ نے خطبات دیے۔ پروفیسر نیر آصف نے ہوفا فریکچر کے سلسلے میں، پروفیسر اے بی صابر نے کولہے کی پیوندکاری اور ڈاکٹر سہیل احمد نے بون سسٹ کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر یاسر سلام صدیقی، ڈاکٹر محمد فیضان اور ڈاکٹر ایم جے خاں نے الگ الگ اجلاس میں اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ پروفیسر مظہر عباس نے کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 فروری 2020

سید عامر

رامپور: سماجی تنظیم نیشنل یوتھ رائٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن (یاردا) کا 5 واں یوم تاسیس انتہائی پروقار انداز میں منایا گیا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ایس ڈی ایم پریم پرکاش تیواری کی موجودگی نے محفل کو رونق افروز بنایا۔ اس موقعے پر نوجوان صحافی سید عامر کو سماجی بہبود کے تئیں ان کی بہترین صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 'ایوارڈ فار ایکسی لنس' سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پریم پرکاش تیواری نے تنظیم کے ذریعے کیے گئے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے مستقبل میں بھی سماج کی فلاح و بہبود کے کام کرتے رہنے پر زور دیا۔ تقریب کے اعزاز یافتہ صحافی سید عامر نے اپنے خطاب میں کہا کہ سماجی خدمات میں لگے افراد کی بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی ضرورت مند انسان کافی امید کے ساتھ ان کے پاس آتا ہے۔ اس لیے انھیں انتہائی ایمانداری اور شفقت کے ساتھ ایسے کام انجام دینے چاہئیں۔ آخر میں یارو گروپ کے صدر فواد احمد نے بھی مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تنظیم کے کاموں سے متعارف کرایا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 25 فروری 2020

رام پور رضا لائبریری کا تقسیم ایوارڈ پروگرام

تصدق حسین رضوی

سندیلہ، ہردوئی: ٹی آر اسکول میں منعقدہ تقریب میں علاقہ بھر میں اپنی طبی خدمات کے لیے مشہور ڈاکٹر تصدق حسین رضوی کو اسکول انتظامیہ کی جانب سے میڈیکل رتن اعزاز سے نوازا گیا۔ پروگرام کا افتتاح مہمان خصوصی راجیہ سبھا کے رکن ڈاکٹر اشوک واجپئی نے شمع روشن کر کے کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم اقدار اور عاجزی فراہم کرتی ہے۔ زندگی میں تعلیم کا بہت بڑا کردار ہے۔ مہمان اعزازی ایم ایل اے راج کمار اگروال نے طلبا کے ثقافتی پروگراموں کو سراہا اور بچوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ایم ایل سی کانتی سنگھ نے تعلیم نسواں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ بیٹیاں ہر شعبے میں آگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنی بیٹیوں کو اچھی تعلیم دے کر روشن مستقبل بنانا چاہیے۔ بلاک پرمکھ کنور ویریندر سنگھ نے کہا کہ تعلیم ہی سے انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2020

رام پور رضا لائبریری کا تقسیم ایوارڈ پروگرام

رام پور: رضا لائبریری رام پور میں تقسیم ایوارڈ یافتگان تقریب رنگ محل میں منعقد ہوئی۔ یوپی گورنر/ رضا لائبریری بورڈ کی چیئر پرسن آنندی بین پٹیل اس تقریب میں مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئیں۔ آنندی بین پٹیل نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نواب فیض اللہ خاں نے اس رام پور کو بسایا تھا۔ یہاں آنے پر میں بھی کا استقبال کرتی ہوں۔ یہاں بڑی تعداد میں لوگ دور دراز سے اپنی علمی پیاس بجھانے کی غرض سے آتے ہیں، کیونکہ رضا لائبریری ایک اہم ادارہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ رضا لائبریری قدیم میں تعلیمی خزانہ یہاں موجود ہے۔ اس میں 70 ہزار مخطوطات کے ساتھ ہی ہڈی، کپڑا، پتا وغیرہ میں اردو، عربی، فارسی، سنسکرت، پشتو جیسی زبانوں میں خطاطی اور کیلی گرافی کے نایاب نمونے بھی موجود ہیں۔

گورنر موصوفہ کے ہاتھوں پروفیسر اختر الواسع کی عدم موجودگی میں ان کے صاحب زادہ کامران الواسع کو ایک لاکھ 10 ہزار نقد، شال اور سرٹیفکٹ سے سرفراز کیا گیا، جبکہ ساجد علی اور پروفیسر سید احتشام احمد ندوی ایک لاکھ نقد اور دو شال کے ساتھ ہی سرٹیفکٹ سے بھی نوازے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 فروری 2020

اسلم مرزا

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں آج ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہوئی جس میں 23 ہندوستانی زبانوں کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ

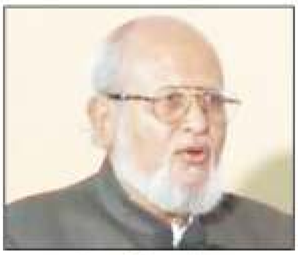

ایوارڈ 2019 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں ترجمہ کے لیے ممتاز مترجم اسلم مرزا کو ان کے بہترین ترجمہ 'مور پنکھ' کے لیے منتخب کیا گیا جو پرشانت اسنارے کے مراٹھی شعری مجموعہ 'میچ ماجھا موز' کا اردو ترجمہ ہے۔ اسلم مرزا کا تعلق اورنگ آباد (مہاراشٹر) سے ہے۔ اب تک ان کی 13 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'آئینہ معنی نما'، 'گیلے پتوں کی مسکان' (شعری مجموعہ)، 'ہم جزیروں میں رہتے ہیں' (ترجمہ)، 'کلنت' (ترجمہ)، 'عطر گل مہتاب'، 'گل دستۂ خوش باش'، 'سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں'، 'پیاری انو' (ترجمہ) اور 'مور پنکھ' (ترجمہ) اہم ہیں۔ اسلم مرزا نے متعدد سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور اپنے مقالے پیش کیے ہیں۔ انھیں ولی دکنی نیشنل ایوارڈ، لٹریری پرسنالٹی آف دی ایئر ایوارڈ، ڈاکٹر عصمت جاوید لٹریری ایوارڈ وغیرہ سے نوازا جاچکا ہے۔ دیگر انعام یافتہ مترجمین میں تپن بندوپادھیائے (بنگالی)، سوسان ڈینیل (انگریزی)، آلوک گپتا (ہندی)، رتن لال جوہر (کشمیری)، سیئی پرانچے (مراٹھی)، پریم پرکاش (پنجابی)، ڈھولن راہی (سندھی)، پی ستیہ وتی (تیلگو) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 فروری 2020

پروفیسر محسن عثمانی

نئی دھلی: آٹھواں آئی او ایس لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ پروفیسر محسن عثمانی ندوی کو ان کی گراں قدر خدمات کی بنیاد پر ایک تقریب کے دوران پیش کیا گیا۔ تفویض ایوارڈ کا یہ پروگرام جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سی آئی ٹی بلڈنگ کے ایف ٹی کے ہال میں منعقد ہوا۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی معروف دانشور، محقق اور مصنف ہیں۔ جے این یو میں اسسٹنٹ پروفیسر رہ چکے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز کی گورننگ کونسل کے ممبر ہیں۔ تعلیمی، تصنیفی اور فکری میدان میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ آئی او ایس لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ میں سپاس نامہ، ایک لاکھ روپے کا چیک اور ایک ٹرافی پیش کی گئی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر مولانا جلال الدین عمری نے سپاس نامہ، پیش کیا۔ آئی او ایس کے سکریٹری جنرل پروفیسر زیڈ ایم خان نے چیک پیش کیا جبکہ آئی او ایس کے چیئر مین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے مومنٹو پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر محسن عثمانی کی شخصیت اور خدمات پر بنی ایک ڈوکومینٹری فلم بھی ریلیز کی گئی۔ مولانا جلال الدین عمری نے ایوارڈ کے سلسلے کی ستائش کرتے ہوئے اسے آئی او ایس کا تاریخی اور نمایاں کارنامہ بتایا۔ ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ایوارڈ کا مقصد خدمات کی ستائش اور حوصلہ افزائی ہے اور یہ پیغام دینا ہے کہ نئی نسل میں جذبہ اور امنگ پیدا ہو اور مستقبل میں وہ نمایاں کارنامہ انجام دینے کا شوق اپنے اندر پیدا کریں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2020

ڈاکٹر حکیم نظیم الرحمٰن

دیو بند: ڈاکٹر حکیم نظیم الرحمٰن کو حکیم عزیز خان نیشنل ایوارڈ سے نوازے جانے پر ایک استقبالیہ پروگرام کا انعقاد جامعۃ القدسیات ششکشا سمیتی کی جانب سے کیا گیا جس میں خطاب کرتے ہوئے معروف دینی ادارہ جامعۃ القدسیات کے مہتمم مولانا قاری عامر عثمانی نے کہا کہ طب یونانی ایک بہت بڑا فن ہے اور اس سے کی جانے والی خدمات دنیا میں سب سے اعلیٰ تسلیم کی جاتی ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر حکیم نظیف احمد کو اوارڈ ملنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھیں امید ہے کہ حکیم نظیف اسی طریقے سے عوام کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عثمان مسعود، ڈاکٹر کاشف اور صادق صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ اخیر میں جامعۃ القدسیات ششکشا سمیتی کی جانب سے حکیم نظیم الرحمٰن کو مومنٹو بھی پیش کیا گیا۔ روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 فروری 2020

محمد کاشف

نئی دھلی: مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے 152 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر مختلف تنظیموں کی جانب سے مختلف شہروں میں تقریبات کے تحت یونانی میڈیکل ایسوی ایشن کی جانب سے حیدرآباد میں پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں طب کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اس موقعے پر سلیم پور کے مشہور نیلم دواخانہ کے ڈاکٹر و حکیم محمد کاشف ذکائی کو یونانی میڈیکل ایسوی ایشن کی جانب سے ماڈرن یونانی سپر اسپیشلٹی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر کاشف ذکائی کافی عرصے سے مختلف موضوعات پر یونانی کانفرنس وغیرہ میں مقالے پیش کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر کاشف ذکائی نے نمائندہ راشٹریہ سہارا کو بتایا کہ یہ ایوارڈ ملنا میرے لیے باعث فخر ہے۔ مگر اس سے زیادہ طب یونانی کے شعبے میں کام کر رہے لوگوں کے لیے خوشی کا مقام ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 فروری 2020

حکیم نظیف الرحمٰن

دیوبند: گذشتہ دنوں حیدرآباد میں یونانی ڈے کے موقعے پر دیوبند کا نام طبی شعبے میں روشن کرنے والے معروف حکیم نظیف الرحمٰن کو اعزاز سے نوازا گیا۔ شعبۂ علاج بالتدبیر اور جوڑوں و اعصابی درد میں خاص مہارت کی وجہ سے انھیں بیسٹ یونانی سپر اسپیشلٹی ان آرتھو اور نیورو امراض ایوارڈ ریاست تلنگانہ کے سی سی آئی ایم کے رکن ڈاکٹر عبدالحسن، آندھرا پردیش کے سی سی آئی ایم رکن ڈاکٹر ٹی حسن وغیرہ کے ہاتھوں دیا گیا۔ حکیم نظیف الرحمٰن کو ایوارڈ ملنے پر یہاں کے اطبا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں مبارک باد دی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 18 فروری 2020

امتیاز انصاری

جے پور: (پنک سٹی) میں منعقدہ بین الاقوامی آرٹ اینڈ کیلی گرافی فیسٹول سعودی عرب، ایران، الجیریا، عمان، اردن، مراکش، بنگلہ دیش اور نیپال کے ماہر اساتذہ خطاط نے شرکت کی۔ اس بین الاقوامی خطاطی فیسٹول میں نشاط ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس، شہادہ ضلع نندربار مہاراشٹر کے فعال معلم و معروف خطاط انصاری امتیاز محمد ایاز کو جے پور کلا کیندر کی ڈی جی محترمہ کرن سونی آئی اے ایس کے ہاتھوں بین الاقوامی خطاطی سند اور محترم سید شاکر علی پدم شری کے ہاتھوں مومنٹو سے سرفراز کیا گیا۔

پریس ریلیز: امتیاز انصاری، مہاراشٹر، 10 فروری 2020

رسم اجرا: ——————

مجلّہ 'ارمغان'

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پوری ادبی دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس شعبے کا تحقیقی معیار ہمیشہ سے مثالی رہا ہے۔ یہاں سے زبان و ادب کی عظیم شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ عصری منظرنامے پر اس شعبے کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی خدمات کو وقار و اعتبار حاصل ہے۔ آج جب کہ جامعہ اپنی صدی کی دہلیز پہ کھڑی ہے، اس کی صدی تقریبات کو بامعنی بنانے میں شعبۂ اردو کے تین قومی اور بین الاقوامی سمینار اور سالانہ مجلّہ 'ارمغان' کا کردار غیر معمولی ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آٹھویں سالانہ مجلّہ 'ارمغان' (2019) کی تقریب رونمائی میں کیا۔ انھوں نے مجلّے کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ارمغان کا یہ شمارہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں ایک صدی پر محیط جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو خدمات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پرو وائس چانسلر پروفیسر الیاس حسین نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں ذاتی طور پر شعبۂ اردو کی سرگرمیوں اور اس کی فعالیت سے متاثر ہوں۔ رجسٹرار آئی پی ایس اے پی صدیقی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو نے اس مجلّے کا یہ خصوصی شمارہ جاری کر کے دوسرے شعبوں کے لیے ایک ایسا نمونہ قائم کیا ہے کہ جس کی پیروی کر کے جامعہ کے دیگر شعبوں کی منظم تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں اور یہاں سے وابستہ اساتذہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس شعبے کی علمی و ادبی فتوحات کو اب پوری دنیا نے تسلیم کرلیا ہے۔ سالنامہ 'ارمغان' کے مدیر پروفیسر کوثر مظہری نے اظہار تشکر پیش کرتے کہا کہ پروفیسر نجمہ اختر اور یونیورسٹی انتظامیہ نے اس یادگار اور تاریخ ساز شمارے کی اشاعت میں ناقابل فراموش تعاون کیا ہے۔ اجرا کے اس خوبصورت اور یادگار موقعے پر پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر ندیم احمد، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر عبدالحصیب خان، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر محمد مقیم اور ڈاکٹر جاوید حسن موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 فروری 2020

بہارِ عقیدت اور مناقب مفتیِ اعظم اڑیسہ

بھساول: بھساول میں آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر احسن اعظمی کے نعتیہ دیوان 'بہار عقیدت' اور سید خادم رسول عینی کی کتاب 'مناقب مفتی اعظم اڑیسہ' کا اجرا غازی آباد سے آئے معروف شاعر ڈاکٹر ذکی طارق کے ہاتھوں انجام پایا۔ شعرا اور مہمانوں کا استقبال جلیل قریشی، شنکر انا، صابر ممبر، سلیم گولی وغیرہ نے کیا۔ سید خادم رسول کی صدارت میں منعقدہ اس مشاعرے میں نظامت ہارون عثمانی نے انجام دی۔ مشاعرے میں صابر مصطفیٰ آبادی، شکیل قریشی، اصغر بھساولی، حامد بھساولی، حبیب منظر، قمر راز، فاروق رضا، ارشاد وسیم، عالم نظامی، ڈاکٹر ذکی طارق، احسن اعظمی، کنور جاوید، ناصر فراز، فرید احمد فرید قریشی، کرشنا شرما دامنی وغیرہ شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2020

چاندی بہو

نئی دھلی: سالک دھامپوری کے افسانوں کے مجموعہ 'چاندی بہو' کی رسم اجرا بزم احباب کے دفتر نئی دہلی میں معروف صحافی فاروق سلیم کی صدارت میں ہونے والی

شعری نشست میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر دلشاد اصلاحی نے 'چاندی بہو' پر سیر حاصل نقد و تبصرہ کیا۔ مصنف اور اس کی کاوش کا بھرپور تعارف کرایا۔ صحافی اشرف علی بستوی ایڈیٹر 'ایشیا ٹائمز' نے سالک دھامپوری کی ادبی و صحافتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے آس پاس کی حقیقت کو زندہ کرداروں کے ذریعے روشناس کرایا۔ اپنے صدارتی کلمات میں فاروق سلیم صاحب نے کہا کہ سالک دھامپوری کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ان کی عام فہم اور سلیس زبان ہے۔ رسم اجرا کے بعد شعری نشست کا آغاز احسن فیروز آبادی کی نظامت میں ہوا۔ جن شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا ان میں معین قریشی، ضمیر اعظمی، دانش نور پوری، اظہار نگینوی، کاظم بن حبیب بجنوری، سالک دھامپوری اور ظفر شکر پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 فروری 2020

ادھو مہاجن بسمل کی چار کتابوں کا اجرا

پونے: اسباق پبلی کیشن پونے کی جانب سے مشہور شاعر ادھو مہاجن بسمل کی چار کتابوں کی رسم اجرا کی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جلگاؤں سے تشریف لائے مشہور افسانہ نگار معین الدین عثمانی نے کی۔ اس پروگرام

میں مہمان خصوصی کے طور پر بلاسپور مدھیہ پردیش سے تشریف لائے، معروف افسانہ نگار اور ناقد خورشید حیات شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ حاجی انصار احمد (بھساول)، ڈاکٹر کانتی لودھی (پونہ) بھی پروگرام میں شریک تھے جنھوں نے کتابوں پر تحریر کردہ اپنے مقالے پیش کیے۔ معین الدین عثمانی نے 'مناظر عاشق ہرگانوی سے مصاحبہ' پر ڈاکٹر کانتی لودھی نے 'دشت امکان سے پرے (ہندی)' پر خورشید حیات نے 'دشت امکاں سے پرے اردو' پر اور حاجی انصار احمد نے 'لفظوں کے حصار میں' پر اپنے مقالے پیش کیے۔ اس پروگرام کی نظامت ظل ہما بارگیر نے کی، شمشاد جلیل شا نے رسم شکریہ ادا کی۔

پریس ریلیز، معین الدین عثمانی، مہاراشٹر 25 فروری 2020

وفیات:

حسین امین

لکھنؤ: روزنامہ 'قومی آواز' کے سابق چیف رپورٹر ضلع

جمعیۃ العلما کے جنرل سکریٹری دارالعلوم ندوۃ العلما میں شعبۂ صحافت کے بزرگ لیکچرر حسین امین کا تقریباً 87 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ حسین امین نے صحافی گھرانہ میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی پیدائش اردو کے مشہور صحافی اور شاعر امین سلونوی کے گھر لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں پر ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ والد امین سلونوی شاعر اور صحافی تھے۔ انھوں نے 1930 میں 'انڈپنڈنٹ نیوز سروس' کے نام سے برصغیر ہندوستان میں اردو کی اولین خبر ساں ایجنسی قائم کی جو الف نون سین سے مشہور ہوئی۔ حسین امین نے اپنے کریئر کا آغاز روزنامہ 'قومی آواز' لکھنؤ سے کیا۔ 'قومی آواز' سے وابستگی کے دوران انھوں نے صحافیوں کے وفد کے ساتھ عراق کا دورہ کیا۔ واپسی پر 'دجلہ و فرات' نام سے سفرنامہ بھی قلم بند کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2020

گری راج کشور

کانپور: ہندی زبان کے معروف مصنف اور سماجی مفکر گری راج کشور کا 9 فروری کو انتقال ہوگیا۔ وہ 82 برس

کے تھے۔ مسٹر کشور کے لواحقین میں ان کی اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ اترپردیش کے مظفر نگر میں 8 جولائی 1932 کو پیدا ہوئے۔ مسٹر کشور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (آئی آئی ٹی) کانپور کے رجسٹرار عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد آزادانہ طور پر لکھتے تھے۔ پدم شری اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازے جا چکے مسٹر کشور افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈرامہ نگار بھی تھے۔ مسٹر کشور کو سب سے پہلے شہرت ان کے ناول گرتیا سے ملی تھی جو انھوں نے گاندھی جی کے جنوبی افریقہ میں قیام پر لکھا تھا۔ ڈھائی گھر ناول پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ پریشِشٹ ان کا مشہور ناول ہے۔ پرجا ہی رہنے دو ان کا مشہور ڈرامہ تھا۔ وہ کانپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے۔ انھیں متعدد انعامات سے نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 فروری 2020

مولانا ولی اللہ ولی بستوی

دیوبند: شاعر اسلام اور مظاہر علوم وقف سہارنپور کے استاذ حدیث مولانا ولی اللہ ولی بستوی کا محلّہ خانقاہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر اچانک معمولی علالت کے بعد انتقال ہوگیا، ان کے انتقال کی خبر سے علمی اور ادبی حلقوں کی فضا مغموم ہوگئی، دیر رات بڑی تعداد میں علما کرام، طلبہ اور شعرا نے مرحوم کی رہائش گاہ پر پہنچ کر تعزیت مسنونہ پیش کی اور مرحوم کے انتقال کو ایک عہد کے خاتمہ سے تعبیر کیا۔ فاضل دارالعلوم دیوبند مولانا ولی اللہ ولی بستوی کی عمر تقریباً 55 سال تھی اور وہ گذشتہ پینتیس سال سے درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے، زبان و ادب اور شعر و شاعری سے مرحوم کو بچپن سے ہی خاص شغف تھا اور علمی حلقوں میں اسلامی شاعری کے لیے نہایت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آبائی وطن ضلع بستی، کشمیر اور اکل کوا و جامعہ اشرف العلوم گنگوہ میں مرحوم نے اپنی تدریسی خدمات انجام دی ہیں، فی الحال جامعہ مظاہر علوم وقف سہارنپور میں علم حدیث کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مرحوم نہایت نیک، مخلص، ملنسار اور گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ مرحوم اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے، لاکھوں شعر کہے ہیں، سیکڑوں ادبی، منظوم اور نثری کتابوں کے مصنف مرحوم مولانا ولی اللہ ولی بستوی کا خاص کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں جتنے بزرگان دین دنیا سے رخصت ہوئے ہیں ان کے مرثیے لکھے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 فروری 2020

زوّار اعظمی

ممبرا/تھانے: اردو کے معروف شاعر زوّار اعظمی 25 فروری کو دورۂ قلب کی وجہ سے رحلت کر گئے۔ سید زوار حسین اعظمی گذشتہ کئی روز سے علیل تھے، طبیعت جب زیادہ بگڑی تو انھیں نوی ممبئی کے ڈی وائی پاٹل اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں وینٹی لیٹر پر انھیں رکھا گیا، ڈاکٹروں کی انتہائی کوششوں کے باوجود ان کی سانسوں کا سلسلہ برقرار نہ رہ سکا اور انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ زوار اعظمی 30 جنوری 1940 کو اترپردیش کے اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سلام، نوحے، مرثیے، قصیدے اور غزلیں بھی کہیں، سوئے اتفاق کہ ان کی کوئی کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی۔ وہ ملنسار، نرم لہجے میں گفتگو کرنے والے سادہ طبیعت کے حامل شخص تھے۔ زوار اعظمی کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2020

وصی احمد نعمانی

نئی دھلی: سپریم کورٹ کے معروف وکیل اور 'قرآن، سائنس اور کاسموس' کے مصنف وصی احمد نعمانی کا دہلی کے ہولی فیملی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 67 سال کے تھے۔ وصی نعمانی کی پیدائش 1952 میں بہار کے ضلع مدھوبنی میں ہوئی تھی۔ گاؤں مرزاپور میں ابتدائی تعلیم کے بعد مظفرپور کے جامع العلوم سے مزید تعلیم حاصل کی۔ پھر

جامعہ مفتاح العلوم متوناتھ بھنجن سے تجوید و قرأت کی سند حاصل کرنے کے بعد الہ آباد بورڈ سے منشی کا امتحان پاس کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1973 میں بی اے آنرس کیا۔ 1977 میں ایل ایل بی کیا اور اسی دوران طلبہ یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ مختلف عدالتوں سے ہوتے ہوئے 1986 میں سپریم کورٹ آگئے۔ کچھ دن سیاست میں بھی کاٹے اور اندرا گاندھی کے کہنے پر کانگریس میں شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی عملی سیاست سے الگ ہوگئے۔ 1991 میں وہ سپریم کورٹ میں وکالت بھی کرتے تھے اور اخبارات میں مسلم مسائل پر مضامین بھی لکھتے تھے۔ 2004 میں وہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر (آئی آئی سی سی) پہلی گورننگ کونسل کے سکریٹری رہے۔ وصی احمد نعمانی کو علمی مطالعہ کا بڑا شغف تھا۔ اسکالی پبلی کیشن کے ذریعے ان کے مضامین اور تقاریر کا مجموعہ، قرآن، سائنس اور کاسموس، شائع کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2020

ڈاکٹر پرواز، ہیم پوری

نئی دھلی: کردم پوری کے نوجوان شاعر ڈاکٹر زین العابدین پرواز ہیم پوری کا 19 فروری 2020 کو انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ ایک برس سے کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر 45 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ سمیت تین بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 فروری 2020

ڈاکٹر سلیم عابدی

حیدرآباد: ضلع محبوب نگر اور حیدرآباد کے نامور، معروف شاعر و ادیب جناب شیخ سلیم الدین (سلیم عابدی) 11 فروری 2020 کو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان کی عمر 79 سال تھی۔ ریاست نگر حیدرآباد میں اپنی قیام گاہ میں آخری سانس لی۔ تدفین آبائی قبرستان جدید کلہ مسجد محبوب نگر میں عمل میں آئی۔ وہ ایک باکمال شاعر تھے۔ ساتھ ساتھ افسانہ نگاری، ڈرامہ، ناول میں بھی غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ کامیاب ناظم مشاعرہ بھی تھے۔ ان کا ترنم بھی منفرد تھا۔ ان کی تصانیف میں سوز عشق، متاع سخن، نغمۂ حیات، ندائے حیات، صدائے سلیم ونشاط سلیم کے علاوہ نثری کتابیں بھی شامل ہیں۔ حال ہی میں انھیں اردو اکادمی تلنگانہ کی جانب سے شاعری کے زمرہ میں کارنامۂ حیات ایوارڈ دیا گیا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر معز سلیم صدر شعبۂ اردو شاداں کالج حیدرآباد، 12 فروری 2020

کندن سنگھ اراولی

گروگرام هریانه: اردو کے بزرگ اہل قلم جناب کندن سنگھ اراولی کا 26 فروری 2020 کو گروگرام میں انتقال ہوگیا۔ کندن سنگھ اراولی کا یکم مئی 1934 بمقام موضوع کھالیڈہ ریواڑی اپنے آبائی گاؤں میں جنم ہوا تھا۔ کندن سنگھ اراولی نہ صرف معتبر شاعر بلکہ ہندو پاک کے معتبر عروض داں تھے۔ 1991 میں گورنمنٹ گرلز کالج چنڈی گڑھ سے پروفیسر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ مرحوم کی ہندی سنسکرت ساہتیہ نیز اردو فارسی اور انگریزی زبانوں پر اچھی پکڑ تھی۔ 1966 میں کندن سنگھ اراولی کا نام منظر عام پر اس وقت آیا جب ان کے قلمی نسخہ 'گل ریز' پر انھیں پہلا انعام ملا۔ کندن سنگھ اراولی کو ہندی غزل پر پیپر اور پرلوگ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری 1991 میں عطا ہوئی۔ کندن سنگھ اراولی کی پہلی تصنیف 'احتساب العروض' 1991 میں منظر عام پر آئی۔ دوسری تصنیف 'آواز کا پیرہن' مجموعہ کلام غزلیات، نظمیات، قطعات وغیرہ پر ہے۔ 'اردو عروض درپن' 2018 میں شائع ہوئی۔ کندن سنگھ اراولی عمر کے آخری دنوں تک تندرست رہے۔ اچانک ان کو پھیپھڑوں میں انفیکشن کی شکایت ہوئی۔ سانس لینے میں جب دقت محسوس ہوئی تو فوراً گروگرام کے ایک ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ بمشکل دو چار دن آئی سی یو میں داخل رہے اور دم توڑ دیا۔ موصوف کے پس ماندگان میں ان کی اہلیہ دولڑکے تین لڑکیاں ہیں۔ مرحوم انسان دوست اور بہت ملنسار شخص تھے۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔

رپورٹ: کندن سنگھ کندن، ہریانہ، 13 مارچ 2020

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون
اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 20
قیمت: 20 روپے

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

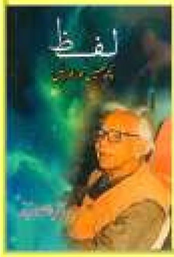

مصنف: آل احمد سرور
دوسری طباعت: 2019
صفحات: 95
قیمت: 70 روپے

صحت الفاظ

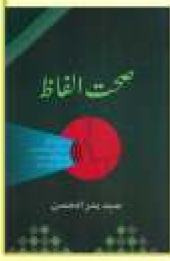

مصنف: سید بدرالحسن
ساتویں طباعت: 2019
صفحات: 253
قیمت: 90 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

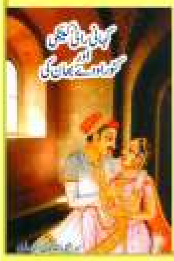

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 30
قیمت: 35 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

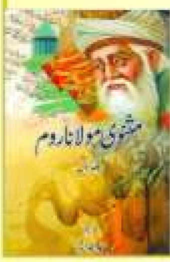

مترجم: سید احمد ایثار
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 223 (جلد اول)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)
قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

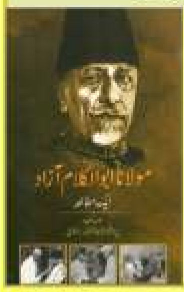

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
دوسری طباعت: 2019
صفحات: 474
قیمت: 215 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

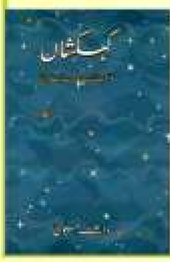

مصنف: وارث علوی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 527
قیمت: 240 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین
تیسری طباعت: 2019
صفحات: 910
قیمت: 395 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, April-2020, Vol.22, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/03/2020**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025